

زندگی سے لطف اُٹھائیے!

اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سُنہرے اصول

دکتور محمد عبدالرحمن العریفی

زندگی سے لطف اُٹھائیے!

اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول

ⓒ مكتبة دارالسلام، ١٤٢٩هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

العريفي، محمد بن عبدالرحمن

استمتع بحياتك - الاردو. / محمد بن عبدالرحمن العريفي- الرياض، ١٤٢٩هـ

٥٧٠ص: ١٤×٢١سم

ردمك: ٦-٠٥٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

١- السيرة النبوية أ. العنوان

ديوي ٢٣٩ ١٤٢٩/٥٠٠٢

رقم الإيداع: ١٤٢٩/٥٠٠٢

ردمك: ٦-٠٥٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

زندگی سے لطف اُٹھائیے!

اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول

تالیف
دکتور محمد بن عبدالرحمٰن العریفی

ترجمہ
حافظ قمر حسن

دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی اِدارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

• الریاض۔ العلیا۔ فون: 4614483 01 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 01 فیکس: 4735221 • سویلم فون: 2860422 01
• مندوب الریاض: موبائل: 0503417156 • قصیم (بریدہ): فون/فیکس: 3696124 06 موبائل: 0503459695-0505196736
• مکہ مکرمہ: موبائل: 0502839948-0506640175 • مدینہ منورہ فون: 8234446 04 فیکس: 8151121 موبائل: 0503417155
• جدہ فون: 6879254 02 فیکس: 6336270 • الخبر فون: 8692900 03 فیکس: 8691551
• ینبع البحر فون/فیکس: 3908027 04 موبائل: 0500887341 • خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 07 موبائل: 0500710328

شارجہ فون: 5632623 6 00971 امریکہ • ہوسٹن فون: 7220419 713 001 • نیویارک فون: 6255925 718 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون: 4040 9758 2 0061

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

• 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 7240024-7232400-711023-7110081 42 0092 فیکس: 7354072 موبائل: 0322-8484569
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

لاہور غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، فون: 7120054 فیکس: 7320703 موبائل: 0321-4439150
• مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن فون: 7846714 موبائل: 0321-4156390
• Y-260 بلاک کمرشل ایریا، فیز III ڈیفنس، لاہور فون: 042-5084895 موبائل: 0321-4212174
اسلام آباد F-8 مرکز، فون/فیکس: 2281513 051 موبائل: 0321-5370378
کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دُوسری گلی، کراچی (D.C.H.S / 110,111-Z)
فون: 4393936 021 فیکس: 4393937 موبائل: 0321-2441843
Darussalamkhi@darussalampk.com

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

مضامین

مضامین

مضامین

عرض ناشر

یہ 2007ء کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر مدینۃ الرسول ﷺ میں تھا۔ میری پرانی عادت ہے کہ جب بھی کسی شہر میں جاتا ہوں، وہاں کے مکتبات کا چکر ضرور لگاتا ہوں۔ پھر مدینہ طیبہ کی تو بات ہی اور ہے۔ وہاں کے مکتبات پر جب بھی جائیں کوئی نہ کوئی نئ تالیف نظر آجاتی ہے۔ کتب خریدنا میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مسجد نبوی کے قریب جتنے مکتبات ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا اسٹاف مجھے ذاتی طور پر جانتا ہے۔ دارالسلام کی اکثر کتب یہاں مل جاتی ہیں۔ میں حرم مدنی کے قریب ایک مکتبہ میں داخل ہوا۔ شیلف پر نظر ڈالی۔ میری نگاہوں کے سامنے استمتع بحیاتك تھی۔ میں اسے اٹھانے ہی والا تھا کہ ابوعبداللہ نے میرا ہاتھ تھام لیا اور گلے ملنے لگا۔ کب آئے، کتنے دن کا قیام ہے۔ میں اتنی دیر میں کتاب پکڑ چکا تھا۔ یمن سے تعلق رکھنے والا ابوعبداللہ بڑی مدت سے کتب کے کاروبار سے منسلک ہے۔ وہ دارالسلام کے نمایاں ڈسٹری بیوٹرز میں سے ایک ہے۔ ابوعبداللہ نے کتاب میرے ہاتھ میں دیکھ کر کہا: یہ کتاب بڑی عمدہ ہے۔ اگر آپ لوگ اس کا ترجمہ شائع کر دیں تو بین الاقوامی اسلامی لٹریچر میں ایک بڑا اضافہ ہوگا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے بولے جا رہا تھا۔ اس کتاب کی ریکارڈ سیل ہے۔ میں تھوڑی دیر کے بعد اپنے ہوٹل کے کمرے میں اس کتاب کے مطالعہ میں محو تھا۔ جوں جوں اس کا

مطالعہ کرتا گیا، میرا شوق بڑھتا گیا۔ بلاشبہ اس کتاب کا موضوع میرا پسندیدہ ترین موضوع تھا۔

امت مسلمہ کے تمام مسائل کا حل اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت پاک میں موجود ہے۔ بلاشبہ ان کی زندگی ہمارے لیے نمونہ اور باعث تقلید ہے۔ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو اس کا حل سیرت پاک میں تلاش کریں، آپ کو مل جائے گا۔ اس کتاب کی بھی یہی خوبی ہے کہ اس میں ہمارے معاشرتی مسائل کا حل سیرت پاک کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ سیرت اور تاریخ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مؤلف کی اپنی زندگی کے تجربات اس کتاب کا لوازمہ ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر اور اس پر عمل کر کے ہم اپنی زندگی کو بڑا پُرلطف اور آسان بنا سکتے ہیں۔

ہمارے دکھوں کا مداوا کرنے اور دلوں کا قلق واضطراب دور کرنے کے کتنے ہی طریقے اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمٰن العریفی سعودی عرب کے معروف علماء اور خطباء میں سے ہیں۔ جب وہ تقریر کرتے ہیں تو سامعین مبہوت رہ جاتے ہیں۔ انداز گفتگو اتنا عمدہ اور سلیس ہوتا ہے کہ ہم غیر عرب بھی ان کے خطبات کے سحر میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلامی کیسٹوں کی کسی بھی دکان میں چلے جائیں، ان کی درجنوں کیسٹیں آپ کو ملیں گی۔ ایک مرتبہ ان کو سننا شروع کر دیں تو آپ سنتے چلے جائیں گے۔

مدینہ طیبہ کے سفر سے واپس الریاض لوٹا تو دارالسلام کے ایک مصری رفیق کار محمد شاکر قاضی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ڈاکٹر محمد العریفی سے رابطہ کریں اور ان سے کتاب کے ترجمہ کی اجازت حاصل کریں۔ چند دنوں کی جدوجہد کے بعد ڈاکٹر موصوف سے رابطہ ہو گیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہ دارالسلام سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بیرونی

اسفار میں دارالسلام کی کتب اکثر ہمراہ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کو پہلے سے جانتا ہو تو معاملہ طے کرنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ ہم نے انھیں دارالسلام کے ہیڈ کوارٹر آنے کی دعوت دی جو انھوں نے بخوشی قبول کرلی۔ اور ایک دن ڈاکٹر محمد العریفی دارالسلام میں بیٹھے قہوہ نوش کررہے تھے۔

جتنی خوبصورت ان کی تحریر یا تقریر ہے اتنی ہی خوبصورت شکل وصورت کے وہ مالک ہیں۔ نہایت اعلیٰ اخلاق کی حامل یہ شخصیت بڑی متواضع نظر آئی۔ میری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ کوئی آدمی جتنا بڑا اور معروف ہوتا ہے اتنا ہی منکسر مزاج ہوتا ہے اور اس کا اخلاق بھی اتنا ہی عمدہ اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ دار السلام میں انھوں نے معاہدے پر دستخط کیے، ادارے کے نصب العین سے واقفیت حاصل کی اور کہنے لگے آج ذرا جلدی ہے۔ پھر آؤں گا اور تفصیل سے بات ہوگی۔

دو تین ہفتوں بعد میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہورہا تھا۔ ہوائی جہاز میں دیکھا تو ایک نشست پر ڈاکٹر محمد العریفی تشریف فرما تھے۔ ان کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ اس روز ہمیں ایک دوسرے سے مزید تعارف کا موقع ملا۔ کھل کر باتیں ہوئیں۔ ہم ایک دوسرے کے مزید قریب آگئے۔ چند دنوں بعد وہ دوبارہ دار السلام تشریف لائے۔ انھوں نے بعض مفید مشوروں سے نوازا۔ ہم نے انھیں اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ یہ طے پایا کہ دارالسلام ان کی کتابوں کو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے شائع کرے گا۔

اس کتاب کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے اس کی تالیف میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے یہ کتاب اپنے خون جگر سے لکھی ہے۔ جب آپ کتاب پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کتنی خوبصورت

کتاب ہے۔عربی زبان میں یہ کتاب شعبان 1428ھ، اگست 2007ء میں شائع ہوئی اوراب تک یعنی ایک سال میں اس کے دس لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، ڈاکٹر محمد العریفی سعودی عرب کے اصل باشندے ہیں۔ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو خالد (بنومخزوم) سے ہے اور یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ بنو خالد مشہور سپہ سالار، مجاہد اور صحابی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں۔ ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمٰن العریفی 1970ء میں پیدا ہوئے۔سعودی جامعات سے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پی ایچ ڈی کے لیے ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع آراء شیخ الإسلام ابن تیمیة فی الصوفیة جمع ودراسة تھا۔

اس وقت وہ بہت سی اسلامی اور دعوتی تنظیموں کے تاسیسی و اعزازی ممبر ہیں اور اُن کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں۔وہ کئی عالمی تنظیموں کی مجلس مشاورت میں بھی شامل ہیں۔ سعودی عرب میں اور بیرون ملک بعض یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ الریاض کی شاہ سعود یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔گزشتہ بیس برس سے وہ سعودی عرب کی مختلف مساجد میں خطبۂ جمعہ دے رہے ہیں۔آج کل وہ الریاض کے جنوب میں واقع جامع مسجد البواردی کے خطیب ہیں۔ یہ شاندار مسجد الریاض کی بڑی مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ جمعہ کے دن دور دور تک مسجد کے اردگرد پارکنگ نہیں ملتی۔ مجھے اس مسجد میں ان کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ہم جمعہ شروع ہونے سے بہت پہلے وہاں پہنچ گئے تھے،اس کے باوجود خاصی دور پارکنگ ملی۔مسجد کا نچلا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم اوپر والی منزل میں گئے۔ وہاں جگہ مل گئی اور چند منٹوں میں وہ منزل بھی نمازیوں سے پر ہوگئی۔ڈاکٹر محمد العریفی زبردست خطیب ہیں۔انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پندرہ سولہ سال تک شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کے دروس میں شریک ہوتے رہے۔ان سے تفسیر اور

فقہ کا علم حاصل کیا۔ آٹھ سال تک انھوں نے ڈاکٹر عبداللہ الجبرین سے توحید کے دروس لیے۔ ان کے اساتذہ میں الشیخ عبداللہ بن قعود، الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر البراک اور دیگر علماء شامل ہیں۔ مدینہ طیبہ کے علماء کے ساتھ ان کا بڑا پرانا رابطہ ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں اور اس کے بعد انھوں نے مختلف اوقات میں ان سے فقہ پڑھی۔ وہ قرآن کریم کے حافظ اور قاری ہیں۔ حدیث پاک سے انھیں خاص شغف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دنیا کے مختلف علمائے کرام سے قراءت اور حدیث کی اسناد حاصل کی ہیں۔

عربی زبان میں ان کی بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی مجموعی اشاعت کئی ملین تک پہنچتی ہے۔ ان کی کتب نہایت خوبصورت، چار کلر میں ، دیدہ زیب ڈیزائننگ کے ساتھ بہت کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کتابوں میں عام آدمی کو پیش آنے والے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس لیے وہ عام و خاص میں نہایت مقبول ہیں۔ بہت سے اصحابِ خیر ان کتب کو مفت بھی تقسیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد العریفی کی چند اہم کتب کے نام اور اشاعت کی تعداد ذرا ملاحظہ کریں۔

توحید کے موضوع پر اِرکب معنا بڑی شاندار کتاب ہے جس کے 40 لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

دعوت الی اللہ کے موضوع پر هل تبحث عن وظيفة، 15 لاکھ نسخے۔

إنها ملكة کے 15 لاکھ۔

في بطن الحوت کے 15 لاکھ۔

عبادت کے موضوع پر کتاب کے 10 لاکھ۔

حجاب کے موضوع پر صرخة في مطعم الجامعة کے 15 لاکھ۔

رحلة إلى السماء کے بھی 15 لاکھ نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔

ڈاکٹروں اور مریضوں کے لیے نصیحتوں پر مشتمل کتاب عاشق فی غرفة العمليات کے 7 لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

ایک پمفلٹ أذكار المسلم اليومية محض تین سالوں میں 20 ملین کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی بہت ساری تقاریر انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہیں۔ وہ مختلف عربی اخبارات و میگزین اور مجلّات میں کالم اور مضامین لکھتے ہیں۔ متعدد عربی سیٹلائٹ چینلز پر ان کی تقاریر نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ادارہ دارالسلام ڈاکٹر صاحب کی دیگر کتب بہت جلد شایان شان اسلوب میں دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ان شاء اللہ۔

اس کتاب کے ترجمہ اور ایڈیٹنگ کے لیے میں دارالسلام ریسرچ سنٹر لاہور کے نوجوان رفیق کار حافظ قمر حسن کا شکر گزار ہوں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے مؤلف و مترجم کی صحت، تندرستی، درازی عمر اور علم و عمل میں برکت کی دعا کرتے ہیں۔ کتاب کی پروف خوانی، ڈیزائننگ اور فنی مراحل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں حافظ فاروق، حافظ حق نواز، حافظ عبدالماجد، گل رحمٰن، خرم شہزاد اور آرٹ ڈائریکٹر زاہد سلیم چودھری نے بہت محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے۔

یہ کتاب کیسی لگی اس کے بارے میں قارئین کی آراء، تبصروں اور مفید مشوروں کا شدت سے انتظار رہے گا۔ بہت ساری دعاؤں کی درخواست کے ساتھ

محبكم فی اللّٰه

عبدالمالک مجاہد

اگست 2008ء — مدیر: دارالسلام، الریاض، سعودی عرب

پیش لفظ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں عمرِ عزیز کے سولھویں سال میں تھا، ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ''لوگوں سے معاملہ کرنے کا فن'' میرے ہاتھ لگی۔ یہ ایک عمدہ کتاب تھی۔ میں نے اسے کئی بار پڑھا۔ مصنف نے تجویز دی تھی کہ ہر مہینے اس کتاب کا از سرِ نو مطالعہ کیا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران میں، میں نے لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات طے کرنے کے سلسلے میں کتاب کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تو اس کے حیرت انگیز نتائج میرے سامنے آئے۔

کارنیگی کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ پہلے ایک اصول بیان کرتا، پھر اس کے تحت اپنی قوم کے نمایاں رجالِ کار جن میں روز وِلٹ، لنکن، جوزف اور مائنک وغیرہ شامل ہیں، کے واقعات مثالوں کے طور پر پیش کرتا۔ میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ آدمی محض دنیاوی خوشی اور سعادت مندی کی خاطر کتابیں لکھتا اور لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر وہ اسلام اور اس کے اخلاق وخصائل سے واقف ہو کر دونوں جہاں کی خوشیاں حاصل کر لیتا تو اس میں آخر برائی ہی کیا تھی؟ وہ معاملاتِ زندگی میں کام آنے والی اِن مہارتوں کو عبادت سمجھتا اور اس کے ذریعے سے اپنے رب کا تقرب حاصل کر لیتا تو کیا ہی خوب ہوتا!

پھر مجھے پتا چلا کہ کارنیگی نے خودکشی کی تھی تو حیرانی ہوئی کہ اس کی خوبصورت اور عمدہ

کتاب نے اسے کوئی نفع نہیں پہنچایا۔

میں نے تاریخ اسلامی کی ورق گردانی کی تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کی سیرتوں اور امّت کے نمایاں افراد کی سرگزشتوں میں لطافت کے ایسے ایسے موتی بکھرے پڑے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں اغیار کے بجھے ہوئے چراغوں کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ تب میں نے لوگوں سے معاملہ کرنے کے فن پر یہ کتاب لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ کتاب کسی ایک مہینے یا ایک سال کی کاوش کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ ثمرہ ہے میری اُن تحقیقات کا جن پر میں نے اپنی زندگی کے بیس قیمتی برس صرف کیے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اب تک مجھے بیس سے زائد عنوانات پر کتابیں تالیف کرنے کی توفیق دی جن میں سے چند ایک کتب کے بعض ایڈیشن بیس بیس لاکھ نسخوں سے متجاوز رہے، مگر درحقیقت مجھے یہ کتاب اپنی تمام کتابوں سے زیادہ پیاری اور نفیس معلوم ہوتی ہے۔

عملی فوائد کے اعتبار سے بھی یہ کتاب، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میری ساری کتابوں سے فزوں تر ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے میں نے خونِ جگر کی روشنائی سے لکھا، جس کی سطروں میں اپنی روح کو انڈیل دیا اور جس میں میری یادداشتوں کا نچوڑ شامل ہوا۔ یہ چند الفاظ ہیں جو دل سے نکلے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ دِل تک راہ پائیں گے۔

میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی کہ کوئی بھائی یا بہن یہ اصول اپنا کر اپنی زندگی کو مایوسیوں کے بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے، اپنی صلاحیتیں بڑھا لے اور زندگی سے پیار کرنے لگے۔

اور یہ جان کر میری مسرت دو چند ہو جائے گی کہ کسی نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی سنواری، پھر وہ دوسروں کی زندگی میں امید کے دیپ جگانے کا باعث بنا۔ میری خواہش ہے کہ محترم قاری مجھے خط لکھ کر کتاب کے متعلق اپنے تاثرات مجھ تک

پہنچائے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے احساسات کی سچی تصویر کشی کرے۔ میں تہِ دل سے اس کا ممنون ہوں گا اور اس کے لیے دعا گو رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس کتاب کا نفع عام کرے، اسے محض اپنی رضا مندی کے حصول کا ذریعہ بنائے اور اُن احباب کو جزائے خیر عطا کرے جنھوں نے کتاب کی اشاعت میں کسی نوع کا تعاون کیا ہے۔

طالبِ خیر
دکتور محمد بن عبدالرحمٰن عریفی

آغاز

"غرض یہ نہیں کہ آپ محض ایک کتاب پڑھ ڈالیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں۔"

استفادے سے محروم لوگ

مجھے بخوبی یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے اپنے موبائل فون پر ایک پیغام موصول ہوا جو مختصر سے سوال پر مشتمل تھا۔

''یا شیخ! خودکشی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟''

میں نے موبائل فون پر سائل سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ایک نوجوان کی آواز آئی جس نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا۔

میں نے کہا: ''معاف کرنا، آپ کا سوال میری سمجھ میں نہیں آیا، ذرا دہرا دیجیے۔''

اس نے زندگی سے بیزار لہجے میں جواب دیا: ''شیخ! سوال تو بڑا ہی واضح ہے کہ خودکشی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟''

میں نے چاہا کہ اسے ایسا جواب دوں جس کی اسے توقع ہی نہ ہو۔

میں ہنسا اور بولا: ''مستحب (پسندیدہ) ہے۔''

''کیا؟'' وہ چلایا۔

میں نے پوچھا: ''کیا ہم یہ طے کرنے میں آپ کا ہاتھ بٹائیں کہ آپ کو خودکشی کے لیے کون سا طریقہ استعمال کرنا چاہیے؟''

نوجوان چپ رہا۔

اس پر میں نے کہا: ''اچھا! یہ تو بتائیں کہ آپ کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟''

وہ بولا: ''کیونکہ مجھے کوئی ملازمت نہیں ملتی، لوگ مجھے پسند نہیں کرتے، دراصل میں ایک ناکام انسان ہوں۔'' پھر اس نے مجھے تفصیل سے اپنے حالات بتائے۔ وہ اپنے آپ میں بہتر تبدیلی لانے اور اپنی دستیاب صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر افراد کو یہ مسئلہ درپیش ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر انسان اپنے آپ کو اس قدر گھٹیا کیوں تصور کر لیتا ہے؟ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے لوگوں کو ہی کیوں تاکتا رہتا ہے؟ اُن کی طرح وہ بھی پہاڑ کی بلندیوں پر کیوں نہیں پہنچ جاتا؟ یا کم از کم لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ پہاڑ پر چڑھنا ہی شروع کر دے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَمَنْ يَتَهَيَّبْ صُعُودَ الْجِبَالِ
يَعِشْ أَبَدَ الدَّهْرِ بَيْنَ الْحُفَرْ

''جو کوہ پیمائی سے گھبراتا رہتا ہے وہ ہمیشہ گڑھوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔''

کیا آپ جانتے ہیں کہ کون آدمی اس کتاب سے یا اِن اصولوں پر لکھی گئی کسی بھی کتاب سے کبھی استفادہ نہیں کر سکتا؟ وہ بے چارہ انسان جس نے اپنی بُری عادتوں کے روبرو سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، جو اپنی موجود صلاحیتوں پر قناعت کر کے بیٹھ گیا اور کہتا ہے کہ میں کیا کروں۔ یہ میرے مزاج کا حصہ ہے۔ اللہ نے مجھے ایسا ہی بنایا ہے۔ میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں اپنا طریقِ کار تبدیل نہیں کر سکتا۔ لوگ میرے اس مزاج کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ میں خالد جیسی تقریر کرنے لگوں یا احمد جیسا خوش باش نظر آؤں یا جواد کے مانند لوگوں کا پیارا بن جاؤں تو یہ محال ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن میں ایک مجلس میں حاضر تھا۔ میرے ساتھ ایک خاصے عمر رسیدہ بزرگ

تشریف فرما تھے۔ مجلس میں بیٹھے تقریباً سب افرادعوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بزرگ اپنے آس پاس بیٹھے لوگوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ مجلس کے دیگر افراد میں صرف اپنی بڑی عمر کی وجہ سے نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایسی کوئی خاص بات یا غیر معمولی صلاحیت نہیں تھی۔

میں نے وہاں ایک مختصر سی تقریر کی جس میں شیخ عبدالعزیز بن باز کے ایک فتوے کا ذکر کیا۔ جب میں اپنی بات کر چکا تو بڑے میاں فخریہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے:

''میں اور ابن باز ہم جماعت تھے۔ آج سے چالیس سال قبل ہم مسجد میں شیخ محمد بن ابراہیم کے پاس اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔''

میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ خبر سنا کر مارے خوشی کے ان کے چہرے کی دھاریاں دمک رہی تھیں۔ وہ اس بات پر بے حد مسرور تھے کہ اُنھیں کسی زمانے میں ایک کامیاب انسان کی صحبت حاصل رہی ہے جبکہ میں دل ہی دل میں انھیں ملامت کر رہا تھا:

''اے لاچار آدمی! تم بھی ابنِ باز کی طرح کامیاب کیوں نہ ہو سکے؟ تمھیں تو راستے کا بھی علم تھا، پھر تم نے اپنا سفر جاری کیوں نہ رکھا؟''

ایسا کیوں ہے کہ ابنِ باز وفات پائیں تو منبر ومحراب اُن پر روئیں، لائبریریاں آنسو بہائیں اور ایک زمانہ اُن کے فراق پر نوحہ کناں نظر آئے اور جب تمھیں موت آئے تو شاید تم پر رونے والا کوئی نہ ہو! اور اگر کوئی روئے بھی تو زیادہ سے زیادہ دل جوئی کی خاطر یا رسمِ دنیا کے طور پر۔

ہم میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی یہ ضرور کہتا ہے کہ میں فلاں بڑے آدمی کو جانتا ہوں یا میں فلاں کا ہم جماعت رہا ہوں یا فلاں کے ساتھ میری مجلسیں جما کرتی تھیں۔ ان باتوں پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ فخر کی بات صِرف یہ ہے کہ آپ بھی اُسی بلندی پر پہنچیں جس پر وہ

فائز ہوئے۔

ہم میں سے ہر ایک کو بہادر بننا اور آج ہی سے یہ عزم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی اُن صلاحیتوں سے جن کے کارآمد ہونے پر اسے اطمینان ہے، اپنی زندگی میں فائدہ اٹھائے گا اور ایک کامیاب انسان بننے کی کوشش کرے گا۔

اس لیے تُرش رُوئی چھوڑ کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائیں۔ افسردگی کو خیر باد کہہ کر ہشاش بشاش اور خوش باش نظر آئیں۔ کنجوسی چھوڑ کر کشادہ دِلی اپنائیں۔ اپنے غصے پر قابو پائیں اور اسے بُردباری اور ٹھہراؤ میں بدل ڈالیں۔ مصائب کے گُھپ اندھیروں میں خوشی کی کرنیں تلاش کریں۔ اپنے آپ کو ایمان و یقین اور اعتماد کے ہتھیاروں سے لیس کریں۔ اپنی زندگی میں دلچسپی لیں۔ اس سے لطف اٹھائیں۔ زندگی کے دِن تھوڑے ہیں، اُنھیں بے جا غم اور بے مقصد پریشانیوں میں ضائع نہ کریں۔ رہا یہ سوال کہ یہ سب کیونکر ممکن ہے تو یہ کتاب میں نے اسی سوال کے جواب میں لکھی ہے۔ میرے ساتھ رہیے، ہم ان شاء اللہ جلد منزل پر پہنچ جائیں گے۔

”بہادر وہ ہے جو پختہ عزم کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیتا رہے اور اُن سے بھرپور فائدہ اٹھائے۔“

آئندہ ہم کیا سیکھیں گے؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ افراد کے خوشی غمی کے اسباب یکساں ہوتے ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی یا اپنے اپنے شعبہ ہائے زندگی میں ترقی اور اس کے روشن امکانات دیکھ کر سبھی لوگ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ دیرینہ امراض سے شفا پانے یا تمنائیں اور مرادیں بر آنے پر بھی ہر آدمی فرحت و انبساط کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر بجائے حسد کرنے یا دِل بُرا کرنے کے دنیا کشادہ دلی سے مسکرا دے تو بھی اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔

اس کے باوجود زندگی میں بُرا وقت آن پڑے، غربت اور محتاجی ڈیرے ڈال دے، بیماری جڑ پکڑ جائے یا ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے تو سبھی لوگ پریشان ہوتے اور غم و اندوہ کے سمندر میں جا ڈوبتے ہیں۔ جب تک ان مصائب کا کوئی مُداوا نہیں ہوتا، پریشانی اور نا امیدی کی صورت باقی رہتی ہے۔

آئیے! وہ راستے تلاش کریں جن پر چل کر ہم اپنی مسرتوں کو دوام بخشیں اور حزن و ملال پر غلبہ پا لیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ آدمی زمانے کی سرد و گرم غلام گردشوں میں چکر کھاتا رہتا ہے اور اس گردشِ مدام میں آپ اکیلے نہیں ہیں بلکہ سب لوگ آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ہم زندگی میں پیش آنے والے مصائب و آلام کو

بسا اوقات اُن کے حجم سے بڑھ کر اہمیت کیوں دے دیتے ہیں۔ پھر ایسی ادنیٰ باتوں پر ہم کئی کئی دن افسردہ رہتے اور اپنی زندگی کے قیمتی لمحلے ان چیزوں کے غم میں ہلکان ہو کر ضائع کرتے ہیں جو اس درجہ آزردگی کی کسی طرح مستحق نہیں ہوتیں، باوجودیکہ بعض اوقات کرب کو ایک لمحے میں دور کر دینا ہمارے بس میں ہوتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ رنج اور حزن وملال دل پر براہِ راست حملہ آور ہوتے اور اس میں بغیر اجازت چپکے سے داخل ہو جاتے ہیں، تاہم رنج والم کا دروازہ ایک بار کھل جائے تو اسے بند کرنے کے بھی ہزارہا طریقے ہیں۔

آئندہ ہم یہی طریقے جاننے کی کوشش کریں گے۔

زندگی میں ہماری ملاقات کتنے ہی ایسے افراد سے ہوتی ہے جو ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے مل کر خوش ہوتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر، ان سے باتیں کر کے اپنی دل بستگی کا سامان کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ آپ بھی ان دلپذیر افراد کا حصہ بن سکتے ہیں؟ آخر اس امر پر اکتفا کر کے بیٹھ رہنے کی وجہ کیا ہے کہ آپ ہمیشہ دوسروں کی خوبیاں اور اُن کے کارنامے دیکھ کر حیرت آمیز خوشی، تعجب اور مرعوبیت کا اظہار کرتے رہیں؟ آپ خود ایسا جاں فزا کردار ادا کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جسے دیکھ کر دوسرے حیرت اور تعجب میں مبتلا ہوں؟

ایسا کیوں ہو کہ محفلِ دوستاں میں آپ کا کوئی ساتھی یا عم زاد بولے تو سب کان لگا کر سنیں اور اس کی آواز حاضرینِ محفل کی سماعتوں پر چھا جائے اور لوگ اس کے اندازِ گفتگو سے محظوظ ہو کر اس کی تعریف کریں اور جب آپ اپنی بات کا آغاز کریں تو لوگ منہ بسور کر پیچھے ہٹ جائیں یا اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو جائیں اور گپ بازی کرنے لگیں؟

عین ممکن ہے آپ کے پاس اپنے ساتھی سے زیادہ معلومات ہوں اور تعلیمی میدان میں آپ اس سے اعلیٰ ڈگری کے حامل ہوں یا اس سے بلند منصب پر فائز ہوں۔

پھر وہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوا اور آپ کیوں ناکام رہے؟

ایک وہ باپ ہے جس کے بچے اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ گھر آتا ہے تو اسے دیکھ کر، اس سے مل کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔

اور ایک وہ بدنصیب باپ ہے جو اپنی اولاد کی رفاقت کو ترستا رہتا ہے اور اولاد اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے طرح طرح کے بہانے گھڑتی اور عذر تراشتی ہے۔ کیوں......؟

ہیں تو دونوں ہی باپ، پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس کتاب میں ہم ان شاء اللہ یہ سیکھیں گے کہ زندگی سے لطف کیسے اٹھایا جائے، لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا طریق کار کیا ہے اور اپنی بات کو موثر انداز میں کیسے پیش کیا جائے۔ یہ بھی معلوم ہوگا کہ معاشرے میں بدقماش افراد کے شر اور اُن کے خطرناک عزائم سے کیسے محفوظ رہنا اور ان سے دنیاوی معاملات طے کرنے کے سلسلے میں کیا رویہ اختیار کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

تو آیئے! ہم آپ کو مرحبا کہتے ہیں۔

''کامیابی یہ نہیں کہ آپ اُن چیزوں کا سراغ لگائیں جنھیں دوسرے پسند کرتے ہیں۔ بلکہ فائز المرامی یہ ہے کہ آپ اپنے اندر ایسی مہارتیں پیدا کریں جن کی بدولت آپ لوگوں کی توجہ کا مرکز ومحور بن جائیں۔''

مہارتوں کی تلاش کیوں؟

ایک دن میں کچی آبادی میں گیا۔ وہاں مجھے ایک لیکچر دینا تھا۔

میں لیکچر دے کر فارغ ہوا تو کچی آبادی کے نواح میں مقیم ایک اسکول ماسٹر جو میرا لیکچر سننے آیا تھا، میرے پاس آیا اور بولا: ''ہماری خواہش ہے کہ آپ کچھ طلبہ کی کفالت کرنے میں ہماری مدد کریں۔''

میں نے استفسار کیا: ''تعجب ہے! کیا اسکول سرکاری اور ان میں تعلیم مفت نہیں؟''

''بالکل! ایسا ہی ہے۔ لیکن ہم نے اُن کے لیے یونیورسٹی میں پڑھائی کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے۔'' اس نے جوابًا کہا۔

اس پر میں نے کہا: ''یونیورسٹی کی حیثیت بھی تو وہی ہے۔ کیا وہ سرکاری نہیں؟ وہ تو طلبہ کے لیے وظائف بھی جاری کرتی ہے۔''

آخر وہ بولا: ''میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔''

''ہمارے ہاں سیکنڈری اسکول سے بعض طالب علم ایسے بھی نکلتے ہیں جن کے حاصل کردہ نمبروں کا تناسب سالانہ امتحانات میں 99 فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ چند ایک میں تو ذہانت و فطانت کا ایسا جوہر پایا جاتا ہے جو ایک امت میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے لیے بھی کافی ہو۔ ایسا طالب علم اسکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد شہر جا کر

میڈیکل، انجینئرنگ، اسلامی قانون یا کمپیوٹر کے میدان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواہاں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا باپ اسے روک دیتا ہے اور کہتا ہے: ''بہت پڑھ لیا تم نے۔ اب آرام سے گھر بیٹھو اور بکریاں چرانے جایا کرو۔''

''کیا......؟ بکریاں چرانے؟؟'' میں بے ساختہ چلاّیا۔

اُس نے کہا: ''ہاں! ہاں! بکریاں چرانے۔''

''اور واقعی لڑکا بے چارہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے اپنے والد کے ساتھ بکریاں چرانی شروع کر دیتا ہے۔ نتیجتاً اس کی تمام صلاحیتیں اور مہارتیں اندر ہی اندر دم توڑ دیتی ہیں۔ سالہا سال یونہی گزر جاتے ہیں اور وہ بکریاں چراتا رہتا ہے۔ اِس دوران شادی ہوتی ہے، بچے ہو جاتے ہیں جو اپنے والد کا طرزِ زندگی اپناتے اور بالآخر بکریاں چراتے ہیں۔''

''اس گمبھیر مسئلے کا حل کیا ہے، آپ نے اس کے متعلق کیا سوچا ہے؟'' میرا سوال تھا۔

وہ بولا: ''ہمارے پاس اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اس کے باپ کو قائل کرنے کی کوشش کریں کہ وہ بکریاں چرانے کے لیے چند سو روپے کے عوض، جن کی ادائیگی کا ذمہ ہم اپنے سر لیتے ہیں، کوئی ملازم رکھ لے اور اس کا ہونہار بیٹا اپنی خدا داد صلاحیتوں کو بڑھانے اور انھیں نکھارنے میں مصروف ہو جائے، نیز تعلیم مکمل ہونے تک ہم اس کے تمام اخراجات پورے کرتے رہیں۔''

یہ کہہ کر ماسٹر چند ثانیے کے لیے خاموش ہوا اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

پھر یکا یک بڑے پُر جوش لہجے میں کہنے لگا: ''ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ افرادِ کار کی وہبی صلاحیتیں اور نفع بخش قابلیتیں اُن کے سینوں ہی میں دب کر رہ جائیں اور وہ ساری عمر اُن پر حسرت کی آہیں بھرتے رہیں۔''

اسکول ماسٹر کے جانے کے بعد میں نے اس کی باتوں پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ

بلندیوں پر فائز ہونا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ دستیاب مہارتوں کو بھرپور انداز سے استعمال میں لایا جائے اور اپنے اندر مزید صلاحیتیں پیدا کرنے کی تگ و دو جاری رکھی جائے۔

جی ہاں!

میں یہ بات چیلنج کے طور پر کہتا ہوں کہ آپ زندگی کے کسی بھی شعبے میں خواہ وہ علم و تحقیق کا شعبہ ہو یا دعوت و تبلیغ اور خطابت کا میدان، تجارت کا پیشہ ہو یا طب و انجینئرنگ کا مشغلہ، کامیاب لوگوں کا تجزیہ کریں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں آپ اپنے خاندان یا اپنے معاشرے کے کامیاب افراد کے اطوار کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ ایک کامیاب باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ کیسا سبھاؤ ہے یا ایک کامیاب بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کیونکر خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ یہاں کامیاب افراد سے میری مراد کامیاب افراد ہی ہیں نہ کہ وہ لوگ جو جبراً دوسروں کے کندھوں پر سوار رہتے ہیں اور عزیز و اقارب ان کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

آپ کامیاب زندگی گزارنے والے ایسے تمام افراد کے کردار کا مشاہدہ کریں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اُن میں سے ہر ایک، خواہ اسے احساس ہو یا نہ ہو، اپنے میدان میں چند مخصوص مہارتیں استعمال کرتا ہے جن کی بدولت وہ کامرانی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

بعض افراد فطری طور پر کامیاب ہنر استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات اُن کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔ جبکہ بعض دیگر افراد مہارتیں سیکھ لیتے ہیں اور اُنھیں استعمال کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں ہم ایسے ہی کامیاب لوگوں کو تلاش کر کے اُن کی حیاتِ مستعار کا مطالعہ کریں گے اور ان کا طریقِ کار جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیسے کامیاب ہوئے

اور کیا ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم بھی وہی راستہ اپنا کر ان کے مانند کامیاب زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر کر سکیں۔

کچھ عرصہ قبل میں نے دنیا کے ایک امیر ترین آدمی سلیمان راجحی کا انٹرویو سنا تھا۔ میں اس کے کوہساروں جیسے بلند عزائم اور شاندار افکار سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ بے پناہ جائیداد کا مالک ارب پتی انسان ہے۔ اس نے سیکڑوں مساجد تعمیر کی ہیں اور ہزاروں یتیم اور بے سہارا بچوں کی کفالت کا ذمّہ اُٹھا رکھا ہے۔

ایک ایسا آدمی جو کامیابی و کامرانی کی بلند و بالا چوٹی پر براجمان ہے۔ اس نے پچاس برس قبل ترقی کے اس سفر کی شروعات کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عام آدمی تھا جس کے پاس ہاتھ پاؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا جنھیں کام میں لا کر وہ اپنے لیے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کا بندوبست کرتا ہے اور کبھی دو وقت کی روٹی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ وہ روزی کمانے کی خاطر لوگوں کے گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کیا کرتا اور کبھی سارا سارا دن کسی دکان یا بینک میں مزدوری کرتا تھا۔

اس نے تفصیل سے اُن تمام مراحل کا ذکر کیا جن سے گزر کر وہ دامنِ کوہ سے بلندی کی طرف سفر کرتے ہوئے چوٹی پر جا پہنچا۔

میں نے سلیمان راجحی کی مہارتوں اور صلاحیتوں پر غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ ہم میں سے بیشتر افراد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس جیسی شہرت اور ناموری حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب ہر آدمی کچھ مخصوص ہنر سیکھے اور چند مہارتیں اپنائے، پھر اُن پر سختی سے عمل پیرا رہے اور اُنھیں اپنے معمولات میں شامل کرے۔ ایک اور بات جو ہمیں مہارتوں کی جستجو پر اکساتی ہے، یہ ہے کہ بعض افراد میں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں لیکن اُنھیں اُن کا بالکل احساس نہیں ہوتا یا اُن صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ان

کے متعلق شعور دلانے کے سلسلے میں کوئی فرد ان کی مدد اور رہنمائی نہیں کرتا۔ کچھ لوگ بہت اچھی تقریر کر سکتے ہیں، بعض گہرے کاروباری ذہن کے مالک ہوتے ہیں، کوئی بہت ذہین وفطین اور وسیع النظر ہوتا ہے۔ مشکل صرف اِن قابلیتوں کے احساس کی ہے۔ خوش نصیب لوگ یا تو خود اپنے اندر موجود صلاحیتوں کا کھوج لگا لیتے ہیں یا تعلیم کے مرحلے سے گزرتے ہوئے کسی کا بیدار مغز استاد اسے باخبر کر دیتا ہے۔ ادارے کے ملازم کو اس کا نگران (BOSS) مطلع کر دیتا ہے۔ کسی خوش قسمت کو راہ دکھانے کے لیے اس کا کوئی بھائی یا دوست خیر خواہ نکل آتا ہے، ہر چند ایسے ناصحین کم ہی کسی کو میسر آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہنر اور مہارتیں روح کی جیل میں قید ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اُنھیں باہر آ کر پنپنے اور نشوونما پانے کا موقع نہیں ملتا۔ بالآخر معاشرے کا عام مزاج اُن پر غالب آ جاتا ہے اور یہ غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ تب ہم کوئی ذہین لیڈر یا بے مثال خطیب یا کوئی اچھا عالم کھو دیتے ہیں یا کوئی کامیاب شوہر اور خیر خواہ باپ گنوا بیٹھتے ہیں۔

اس کتاب میں ہم چند نمایاں صلاحیتوں اور مہارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ آپ کے اندر موجود ہیں تو ہم انھیں بیدار کرنے کی کوشش کریں گے۔ بصورتِ دیگر ہماری کوشش ہوگی کہ وہ مہارتیں آپ میں پیدا ہو جائیں۔

تو آیئے! ہمارے قدم سے قدم ملایئے۔

واضح تصور

”جب آپ پہاڑ کی بلندی پر چڑھنا شروع کریں تو چوٹی پر نگاہ رکھیں۔ اِردگرد بکھری پڑی چٹانوں کی طرف نہ دیکھیں۔ اعتماد سے قدم قدم چلتے رہیں، جست لگانے کی کوشش نہ کریں، یوں آپ کا پاؤں ڈگمگا سکتا ہے۔“

اپنے آپ کو ترقی دیجیے

آپ بیس سال کے ایک نوجوان سے کسی معاملے پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا اسلوبِ کلام اور سوچنے کا ایک خاص انداز آپ کو متاثر کرتا ہے۔ چند سال بعد دوبارہ آپ کی اس سے بات چیت ہوتی ہے۔ اب اس کی عمر تیس سال ہے۔ آپ نوٹ کرتے ہیں کہ اس کی صلاحیتیں آج بھی وہی ہیں جو دس سال قبل تھیں۔ اس طویل عرصے کے دوران اس کی لیاقت میں رتی بھر اضافہ اور ترقی اور بڑھوتری نہیں ہوئی جبکہ بعض دیگر افراد کے ساتھ آپ بیٹھتے اور اُن کی گفتگو سنتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اُن کے طور طریقوں، طرزِ تکلم اور غور و فکر کے زاویوں میں نت نئی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور وہ ایک تسلسل سے اپنی مہارتوں کو ترقی دینے میں مصروف ہیں۔ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں اُنھوں نے اپنے آپ میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی ہو یا اُس کے خواہش مند نہ رہے ہوں۔

اگر آپ اس سلسلے میں لوگوں کی اقسام جاننا چاہتے ہیں تو آیئے ہم اُن کے احوال اور ان کی ترجیحات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم ٹی وی چینلز کی طرف آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظر ایسے ٹی وی چینلز پر رہتی ہے جو اُن کی عام معلومات بڑھانے اور ذہانت کو ترقی دینے میں معاون

ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے افراد مختلف چینلز پر پیش کیے جانے والے سنجیدہ نوعیت کے انٹرویوز دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اِن انٹرویوز کے ذریعے سے وہ نہ صرف دو بدو گفتگو اور زبان اور فہم وادراک کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ حاضر جوابی اور دوسروں کو اپنی بات کا قائل کرنے کے متعلق بیشتر عمدہ اور معیاری طریقوں سے بھی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

ٹی وی کے ناظرین کی ایک قسم وہ ہے جو کوئی جذباتی ڈراما، محبت کی کہانی پر مبنی سیریل، ڈراؤنی، تخیلاتی، فرضی یا افسانوی کرداروں پر مشتمل کوئی فلم نہیں چھوڑتے۔

اب آیئے! مذکورہ بالا ہر دو قسم کے افراد کا پانچ یا دس سال بعد تجزیہ کرتے ہیں کہ ان میں سے کون اپنی مہارتوں کو زیادہ ترقی دے پایا ہے، لوگوں سے معاملات طے کرنے اور انھیں اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے میں کون ماہر ہوا ہے اور معلومات کی وسعت اور ہمہ جہتی کے میدان میں کس نے اپنا جھنڈا گاڑا ہے۔

نتائج پر غور کرنے کے بعد یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ پہلی قسم کے افراد ہی یہ اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اِن کامیاب افراد کے اندازِ گفتگو کو آپ پہلے سے مختلف اور بہتر پائیں گے۔ وہ آپ سے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں شرعی نصوص اور ریاضی کے دلائل کے علاوہ دیگر سماجی و معاشرتی حقائق بیان کرتے نظر آئیں گے۔ جبکہ دوسری قسم کے لوگ دورانِ گفتگو بار بار اور جابجا اداکاروں اور گلوکاروں کے بیانات کے حوالے دیں گے۔ وہ آپ کو ڈراموں اور فلموں کے اقتباسات سنائیں گے۔

انھی میں سے ایک صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران دلیل دیتے ہوئے کہہ ڈالا: ’’اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! کوشش کر، میں بھی تیرے ہمراہ تگ ودو کروں گا۔‘‘

ہم نے توجہ دلائی کہ یہ قرآن کی آیت نہیں تو اُن کا رنگ فق ہوگیا اور اُنھوں نے

خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ پھر میں نے اُن کی بیان کردہ عبارت پر غور کیا تو وہ ایک معروف ضرب المثل نکلی جو شاید ٹی وی ڈراما دیکھتے ہوئے کسی وقت اُن کے ذہن سے چپک گئی تھی جسے اُنھوں نے گفتگو کی روانی میں اُگل دیا۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ برتن میں جو تھا وہی ٹپکا۔

اب ذرا اِدھر آیئے!

اخبارات و جرائد اور رسائل کے کتنے قاری ہیں جو ایسی نفع بخش معلومات حاصل کرنے اور مفید خبریں مطالعہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں جو روحِ انسانی کی ترقی وتطویر، صلاحیتوں کی نشو ونما اور علوم و معارف میں اضافے کا باعث بنتی ہوں۔ اور ایسے قارئین کا تو کوئی شمار ہی نہیں جن کی نظر کھیل اور شوبز کے صفحات سے آگے نہیں بڑھتی۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اخبارات و جرائد کھیل اور شوبز کے رنگا رنگ صفحات کی تعداد بڑھانے اور اُنھیں مزید دلچسپ بنانے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی حال ہماری مجلسوں اور ہمارے گھروں میں فارغ اوقات کا ہے۔ چنانچہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوہسار کی بلندی پر براجمان ہوں اور دامنِ کوہ میں نہ بیٹھے رہیں تو مہارتیں جہاں سے اور جیسے بھی ملیں انھیں حاصل کر کے اپنانے کی کوشش کریں۔

عبداللہ ایک پُر جوش آدمی ہے، تاہم اس میں بعض صلاحیتوں کی کمی ہے۔

ایک دن وہ ظہر کی نماز کے لیے گھر سے مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک آدمی کھجور کے درخت پر ایپرن پہنے چڑھا ہوا تھا۔ وہ کھجوروں کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ عبداللہ نے یہ منظر دیکھا تو اسے حیرانی ہوئی کہ اس آدمی کو نماز کا ذرا خیال نہیں۔ گویا نہ اس نے اذان سنی ہے اور نہ اسے اقامت کا انتظار ہے۔ اس نے مارے غصے کے بلند آواز سے پکارا: ''نیچے اتر کر نماز پڑھو۔''

آدمی نے سرد مہری سے جواب دیا: ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔''

عبداللہ نے پورے جوش سے دوبارہ آواز دی: ''نیچے اتر گدھے...... جلدی کر...... نماز پڑھ۔''

آدمی درخت پر ہی چلایا: ''کیا کہا؟ میں...... گدھا۔'' پھر اس نے درخت کی ایک موٹی شاخ توڑی اور اترنے لگا تاکہ ٹہنی مار کر عبداللہ کا سر کھول دے۔ عبداللہ نے اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ وہ اسے پہچان لے گا اپنا چہرہ سر پر اوڑھے رومال سے چھپایا اور دُم دبا کر مسجد کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ آدمی سخت غصے کی حالت میں کھجور سے اترا اور گھر چلا گیا۔ وہاں اس نے نماز ادا کی اور قدرے آرام کیا، پھر اپنا کام مکمل کرنے کے لیے گھر سے نکلا اور دوبارہ درخت پر چڑھ کر اس کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہو گیا۔

عصر کی نماز کا وقت ہوا تو عبداللہ معمول کے مطابق مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ کیا دیکھتا ہے راستے میں پھر وہی آدمی کھجور کے درخت پر چڑھا اپنے کام میں مشغول ہے۔ اس بار عبداللہ نے اپنا انداز بدلا اور پکارا:

''السلام علیکم۔ کیسے مزاج ہیں؟''

آدمی نے جواب دیا: ''اللہ کا شکر ہے۔ خیریت سے ہوں۔''

عبداللہ نے پوچھا: ''اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اس سال پھل کیسا ہوا؟''

اس نے کہا: ''اللہ کا شکر ہے۔''

عبداللہ بولا: ''اللہ آپ کو مزید توفیق دے۔ آپ کے رزق میں اضافہ کرے اور اپنے گھر والوں کے لیے آپ جو محنت و مشقت کر رہے ہیں اس کے اجر سے آپ کو محروم نہ رکھے۔'' یہ دعائیہ کلمات سن کر وہ آدمی بڑا خوش ہوا۔ اس نے آمین کہی اور عبداللہ کا شکریہ

ادا کیا۔

اس پر عبداللہ نے کہا: ''شاید آپ بہت مصروف ہیں، اس لیے آپ کو عصر کی اذان سنائی نہیں دی۔ عصر کی اذان ہو چکی ہے اور جماعت کھڑی ہونے کو ہے۔ اگر آپ نیچے اتریں اور تھوڑا آرام کرنے کے بعد باجماعت نماز ادا کریں، پھر نماز کے بعد بقیہ کام پورا کر لیں تو بہت اچھا ہو۔ اللہ آپ کی صحت کی حفاظت کرے۔''

آدمی نے کہا: ''کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ، ان شاء اللہ۔''

وہ تحمل سے اترنے لگا، پھر عبداللہ کی طرف بڑھا، نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا اور بولا: ''خوش اخلاقی سے پیش آنے پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ظہر کے وقت یہاں سے ایک آدمی گزرا تھا۔ اس نے بہت بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کاش وہ مجھے مِل جائے تو میں اُسے بتاؤں کہ گدھا کون ہے۔''

''یاد رکھیں، لوگوں کے لیے آپ جیسا طرزِ عمل اختیار کریں گے اسی کی بنیاد پر لوگ آپ کے لیے اپنے برتاؤ کا تعین کریں گے۔''

اپنا مزاج بدلنا مشکل ہے...... ناممکن نہیں!!!

بعض افراد اپنے خاص مزاج کو جس پر وہ پروان چڑھتے ہیں، جس کے حوالے سے لوگ انھیں پہچانتے ہیں اور جس کی بنیاد پر لوگوں کے ذہنوں میں ان کا تصور ابھرتا ہے، اپنی ذات کا ایسا لازمہ سمجھتے ہیں جسے علیحدہ یا تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ اس نوع کے افراد اپنی فطرت کے آگے جھک جاتے اور اس پر اکتفا کر لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنی جسمانی ساخت اور اپنے پیدائشی رنگ کو جنھیں تبدیل کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا، تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ آدمی جو اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر ہے، سمجھتا ہے کہ انسان کے لیے طبائع کو بدلنا اتنا ہی آسان ہے جتنا لباس کو تبدیل کرنا!

ہمارے مزاج بہے پڑے دودھ کی مانند نہیں کہ اسے اکٹھا کر لانا محال ہو۔ طبع کی زمام ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ہم چند مخصوص طریقے استعمال کر کے نہ صرف لوگوں کی عادتیں بلکہ اُن کے دماغ تک دوسرے رُخ پر ڈال سکتے ہیں۔

ابن حزم نے اپنی کتاب طوق الحمامہ میں اندلس کے ایک مشہور تاجر کا واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اندلس میں ایک تاجر اپنی کاروباری لیاقت اور ہوشیاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک

باراس میں اور دیگر چار تاجروں میں مقابلہ ٹھن گیا۔ انھوں نے مارے حسد کے گٹھ جوڑ کر لیا کہ اُسے زِچ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھار کھیں گے۔

ایک صبح وہ تاجر سفید براق لباس پہنے اور سفید ہی عمامہ باندھے گھر سے دکان کی طرف روانہ ہوا۔ اُن چار تاجروں میں سے ایک تاجر اُسے راستے میں ملا۔ اس نے پہلے تو بڑی گرم جوشی سے اسے سلام کیا، پھر عمامے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا: ''کیسا خوش نما ہے یہ پیلا عمامہ!!''

وہ بولا: ''تمھیں نظر نہیں آتا؟ یہ سفید عمامہ ہے۔''

اس نے جواب دیا: ''ہے تو پیلا ہی، پر ہے خوب صورت۔''

تاجر نے پروانہ کی، اسے چھوڑا اور آگے چل دیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ دوسرا تاجر ملا۔ اس نے بھی سلام کیا اور عمامے کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا:

''آج آپ بڑے خوب صورت نظر آرہے ہیں، لباس بھی اعلیٰ ہے اور یہ سبز عمامہ تو بڑا ہی پیارا لگ رہا ہے۔''

تاجر بولا: ''بھائی! یہ سفید عمامہ ہے۔''

اس نے کہا: ''نہیں جناب، سبز ہے۔''

''سفید ہے یار۔ اب میری جان چھوڑو اور مجھے جانے دو۔'' اس نے تنگ آکر کہا۔

وہ بے چارہ اپنے آپ سے باتیں کرتا چلتا رہا۔ بار بار یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ عمامہ سفید ہے، شملے کی طرف دیکھتا جو کندھے پہ لٹک رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں وہ اپنی دکان پر پہنچا اور تالا کھولنے لگا تو تیسرا تاجر آگے بڑھا اور بولا:

''بھئی واہ! آج کی صبح تو بہت خوب صورت ہے۔ اس پر طرّہ یہ تمھارا دلکش لباس، ماشاءاللہ! اور یہ تمھارا نیلا عمامہ تو سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔''

تاجر نے پہلے تو اپنے عمامے کو بغور دیکھا، پھر آنکھیں ملیں، پھر دیکھا اور بڑی لجاجت سے کہا:

''بھائی میرے! میرا عمامہ سفید ہے، سفید ہے۔''

وہ بولا: ''ارے نہیں! نیلا ہے۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں، اچھا لگ رہا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے سلام کیا اور چل دیا۔ تاجر چیختا رہا:

''عمامہ سفید ہے، سفید ہے، سفید ہے۔''

پھر اس نے عمامہ اتارا اور الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ عمامہ سفید ہی ہے تو دوبارہ پہن لیا۔

وہ دکان میں بیٹھا اور اس دوران برابر عمامے کے شملے کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ چوتھا تاجر آخری پتا پھینکنے دکان میں داخل ہوا اور بولا:

''بھائی جان! مرحبا، ماشاء اللہ یہ سرخ عمامہ آپ نے کہاں سے خریدا ہے؟''

تاجر پوری قوت سے چلایا: ''میرا عمامہ نیلا ہے۔''

اس نے کہا: ''ارے نہیں بھائی جان! یہ تو سُرخ ہے۔''

تاجر بدحواس ہو گیا، کہنے لگا: ''نہیں، سبز ہے، نہیں، نہیں، سفید ہے..... نہیں..... نیلا..... سیاہ۔''

پھر ہنسا، پھر چیخا، پھر رو دیا اور کھڑا ہو کر اُچھلا، اس کے بعد باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔''

ابن حزم کا کہنا ہے:

''اس کے بعد وہ تاجر پاگل ہو گیا۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا۔ وہ اندلس کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا اور بچے اسے کنکر مارا کرتے تھے۔''

ملاحظہ کیجیے کہ کیسے اِن لوگوں نے عام حیلوں اور مہارتوں کو استعمال کرتے ہوئے ایک

آدمی کو نہ صرف اس کے معمول کے کاموں کی انجام دہی سے روک دیا بلکہ اس کا دماغ اُلٹا کر پاگل بنا دیا۔ پھر ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ ہم پڑھی لکھی اور قرآن وحدیث کے نور سے روشن مہارتوں کو عمل میں لا کر کامیاب زندگی گزارنے کی سعی نہ کریں۔

میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اچھے ہنر اور مفید مہارتوں سے واقفیت بہم پہنچائیں اور پھر اُنھیں اپنا کر سعادت مندی سے بہرہ ور ہوں۔ اور اگر آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ میں اپنی زندگی کو نہیں بدل سکتا تو میں جواباً کہوں گا کہ کوشش کر کے تو دیکھیں، آپ بدل سکتے ہیں۔

اگر آپ کہیں گے کہ میں وہ طریقے نہیں جانتا تو میں کہوں گا کہ وہ طریقے سیکھ لیں۔

کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث نہیں سنی:

«إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَإِنَّمَا الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ»

''علم سیکھنے ہی سے آتا ہے اور تحمل اپنانے سے حاصل ہوتا ہے۔''[1]

نقطۂ نظر

''بہادر وہ ہے جو نہ صرف اپنی مہارتیں بہتر بنائے اور اُنھیں ترقی دے بلکہ لوگوں کی مہارتوں کو مرحلہ وار بہتر بنانے اور بعض اوقات اُنھیں بدل ڈالنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔''

---

[1] صحيح الجامع الصّغير للألباني، حديث:2328.

نمایاں بنئے

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض اوقات محفل میں بحث و مباحثہ کرنے والے دو آدمیوں کی گفتگو لڑائی جھگڑے اور مخاصمت پر منتج ہوتی ہے جبکہ دیگر دو افراد گفتگو کریں تو اس کا اختتام خیر سگالی اور ہمدردی کے جذبات پر ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ باہمی گفتگو اور بحث و مباحثے کی مہارتیں ہوتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو آدمی الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک جیسی تقریر کرتے ہیں۔ ایک کی تقریر میں حاضرین کی بڑی تعداد جمائیاں لیتی اور سوئی رہتی ہے۔ کوئی مسجد کے تنکوں سے کھیلتا رہتا ہے اور کچھ افراد بار بار اپنی نشست کی ہیئت بدل کر اکتاہٹ کا علاج کرتے ہیں جبکہ دوسرے آدمی کی تقریر کے دوران حاضرین پورے ہوش و حواس میں بیٹھتے ہیں، مقرر کی آواز سے آواز ملاتے ہیں، نہ تو کسی کی آنکھ میں نیند کا پانی آتا ہے اور نہ کسی کا دل غفلت کا شکار ہوتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ اپنی بات دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے فنون ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں آدمی محفل میں بولتا ہے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے اور نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھتے ہیں جبکہ فلاں بات کرے تو حاضرینِ محفل اِدھر اُدھر کی باتوں میں یا اپنے موبائل فونوں پر پیغامات پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ

بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ بات کرنے کے اصول ہیں۔

اسکول کی راہداریوں میں چلتے ہوئے ایک استاد کو طلبہ گھیرے رکھتے ہیں۔ کوئی مصافحے کے لیے اشتیاق سے ہاتھ بڑھا رہا ہے تو کوئی مشورہ طلب کر رہا ہے اور کوئی استاد کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر رہا ہے۔ یہ استاد اپنے دفتر میں بیٹھتا ہے تو چند ثانیوں میں اُس کا کمرہ طلبہ سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ ہر ایک اس کی صحبت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اِدھر یہ منظر ہے اور دوسری طرف ایک اور استاد اپنے اسکول میں اکیلا چلتا ہے۔ اسکول کی مسجد سے اکیلا نکلتا ہے۔ کوئی طالب علم شکایت لے کر اس کے پاس نہیں جاتا۔ کسی کو اس سے مشورہ طلب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مصافحے کے لیے کوئی اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ کیا آپ کو خبر ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ لوگوں سے معاملہ کرنے کے ضوابط ہیں۔

ایک آدمی محفل میں آتا ہے تو سب اسے دیکھ کر، اسے مل کر اور اسے اپنے قریب پا کر خوش ہوتے اور بے حد گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر کوئی اس کے پہلو میں نشست چاہتا ہے۔ ایک آدمی محفل میں آتا ہے تو لوگ سرد مہری سے اور محض اس کی دل جوئی کی خاطر اس سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ وہ خود جگہ تلاش کر کے بیٹھتا ہے۔ کوئی اس کے لیے جگہ نہیں بناتا نہ کوئی اسے اپنے قریب بٹھانا گوارا کرتا ہے۔ غور کیجیے ایسا کیوں ہوتا ہے۔

یہ لوگوں کے دل اپنی طرف مائل کرنے اور اُن پر اثر انداز ہونے کے ہنر ہیں۔

ایک باپ گھر آتا ہے تو بچے اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں، دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اور ایک دوسرا باپ گھر آتا ہے تو اس کے بچے اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ وہ یوں سہم جاتے ہیں جیسے اُنھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ باپ اندر ہے تو بچے باہر ہیں۔ باپ باہر تو بچے اندر ہیں۔ اس وجہ سے گھر کا ماحول گھٹن زدہ رہتا ہے۔

بیوی الگ سولی پر ٹنگی ہوتی ہے۔ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دراصل یہ اپنے بچوں کے ساتھ برتاؤ کی مہارتیں ہیں۔

ایسی ہی مثالیں مسجد کے معاملات اور شادی بیاہ کی تقریبات وغیرہ کے متعلق بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ جس طرح دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے سلسلے میں لوگوں کی قابلیتیں اور صلاحیتیں گوناگوں ہوتی ہیں اسی طرح دوسرے بھی لوگوں سے معاملہ کرنے اور اُنھیں اہمیت دینے میں کم وبیش ہوتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اپنی تاثیر پیدا کرنا اوران کی محبتیں حاصل کرنا جتنا آسان ہے آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں، مجھے اس کا متعدد بار تجربہ ہوا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ چند آسان طریقے اور سہل مہارتیں استعمال کر کے اکثر دلوں کو اپنا گرویدہ بنایا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم لگن سے یہ طریقے اپنائیں اور مشق کے بعد اُنھیں اپنی فطرتِ ثانیہ بنالیں۔

لوگ ہمارے سبھاؤ اور طرزِ گفتگو سے ضرور متاثر ہوتے ہیں، ہر چند ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ میں عرصہ تیرہ سال سے ملٹری کالج کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ مسجد کی طرف جاتے ہوئے میں ایک قدِ آدم دروازے سے گزرتا ہوں۔ دروازے پر ایک چوکیدار تعینات ہے۔ دروازے کو وقت پر کھولنا اور بند کرنا اس کی ذمے داری ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ہر بار میری کوشش ہوتی تھی کہ مسکراہٹ کا فن آزماؤں، چنانچہ میں ہاتھ سے سلام کا اشارہ کرتے اور واضح طور پر مسکراتے ہوئے گزر جاتا۔ نماز کے بعد اپنی گاڑی میں سوار ہوتا اور گھر لوٹ آتا۔ نماز کے دوران عموماً میرا موبائل فون پیغامات اور فون کالوں سے پُر ہو جاتا ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں پیغامات پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں، اس لیے واپسی پر میں سلام کیے اور مسکرائے بغیر گزر جایا کرتا۔

ایک دن میں مسجد سے باہر آرہا تھا کہ چوکیدار نے مجھے روک لیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔اس نے پوچھا: ''یا شیخ! کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟'' میں بولا: ''کیوں؟''
اس نے کہا: ''کیونکہ مسجد کی طرف آتے ہوئے آپ سلام کرتے اور مسکراتے ہیں۔ تب آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔لیکن واپسی پر نہ آپ خوش ہوتے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔'' وہ ایک سیدھا سادہ آدمی ہے۔وہ بے چارہ قسمیں کھانے لگا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے اور مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے۔ میں نے اُس سے معذرت کی اور اپنی اِس غفلت کا سبب بتایا تب جا کر کہیں وہ مطمئن ہوا۔
پھر واقعتاً مجھے احساس ہوا کہ اگر ہم ایسی مہارتیں استعمال کرنے کی عادت ڈال لیں تو یہ ہماری فطرت کا حصہ بن جاتی ہیں اور جہاں ہم اُن سے غفلت برتیں، لوگ نوٹ کر لیتے ہیں۔

روشنی کی کرن

''صرف مال کمانے میں نہ لگے رہیں، یوں آپ لوگوں کو گنوا بیٹھیں گے۔
دراصل لوگوں کو حاصل کرنا مال حاصل کرنے ہی کا ذریعہ ہے۔''

کون آپ کو سب سے زیادہ پیارا ہے؟

لوگوں سے اچھے برتاؤ کی ترکیبیں استعمال کرنے کے حوالے سے آپ کی صلاحیت اس وقت دو چند ہو جائے گی جب آپ کسی سے ایسا عمدہ معاملہ کریں گے کہ اسے احساس ہو، وہ آپ کو سب سے زیادہ پیارا ہے۔ آپ کا اپنی والدہ سے سلوک اس درجہ خوبصورت اور ہم آہنگ، اُنس و محبت اور تکریم سے بھرپور ہو کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں، آپ کا ایسا شاندار تعلق اُن کے سوا کسی اور سے نہیں۔

ایسا ہی رویہ اپنے والد، بیوی، بچوں اور اپنے ہم چشموں کے ساتھ رہن سہن میں بھی اختیار کریں۔ جن افراد سے کبھی کبھار واسطہ پڑتا ہے جیسے دکاندار یا گیس اسٹیشن کا کارندہ وغیرہ، اُن کے ساتھ بھی آپ کا طرزِ عمل مثالی ہونا چاہیے۔

ان سب لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہونا ممکن ہے کہ آپ انھیں سب سے زیادہ محبوب ہیں لیکن ایسا صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ آپ کو ان سے زیادہ پیار کسی اور سے نہیں۔

ایسے طرزِ زندگی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ جو آدمی آپ ﷺ کی سیرت کی ورق گردانی کرے گا اسے یہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں ہو گا کہ آپ ﷺ اعلیٰ اخلاقی روایات کے حامل تھے۔ آپ ہر ملنے والے کی عزت کرتے، اسے

اہمیت دیتے، اس سے ہم آہنگ ہونے یا اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے اور ہر ایک سے نہایت خندہ روئی اور بشاشت سے پیش آتے۔ جس کسی سے بھی رسول اللہ ﷺ کی ملاقات ہوتی وہ یہی سمجھتا کہ آپ اسے سب سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ نتیجتاً وہ بھی آپ کو سب سے زیادہ چاہتا کیونکہ آپ اسے اپنی بے پناہ محبت کا احساس دلا دیتے تھے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا شمار عرب کے دور اندیش، زیرک اور ہوشیار ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ ایسے زبردست آدمی کو عرب داہِیَہ کے لقب سے پکارتے ہیں۔ عمرو اپنی قوم کی سربرآوردہ شخصیت تھے۔ اسلام لانے کے بعد جب کبھی سرِ راہ اُن کی ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوئی، انھوں نے آپ ﷺ کے چہرے پر تازگی، مسرت اور محبت کے آثار نمایاں دیکھے۔ وہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کی کسی محفل میں شریک ہوئے، عزت و تکریم اور سعادت مندی نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ انھیں اُن کے پسندیدہ ترین نام سے مخاطب کرتے۔ عمرو کو اپنے لیے رسول اللہ ﷺ کے اس غیر معمولی اہتمام، دائمی تبسم اور برتاؤ کو دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو سب سے بڑھ کر محبوب ہیں۔ انھوں نے اس گمان کو یقین کا جامہ پہنانا چاہا۔

چنانچہ ایک دن عمرو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، آپ کے قریب بیٹھ گئے اور سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کو سب سے پیارا کون ہے؟''

''عائشہ۔'' اللہ کے پیغمبر نے جواب دیا۔

عمرو بولے: ''نہیں، اے اللہ کے رسول! مردوں میں سے؟ میں نے آپ سے آپ کے گھرانے کے متعلق سوال نہیں کیا۔''

''عائشہ کا والد۔'' رسول اللہ ﷺ گویا ہوئے۔

عمرو نے کہا: ''پھر کون؟''

’’پھر عمر بن خطاب۔‘‘

عمرو کا بیان ہے کہ پھر میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ اس فہرست میں مجھے سب سے آخر میں نہ رکھ دیں۔[1]

ملاحظہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلیٰ اخلاق پر مبنی برتاؤ کے ذریعے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قلب پر کیسا اچھا اثر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ان کی حیثیتوں کے مطابق رُتبہ دیتے تھے۔ آپ لوگوں کے لیے اپنے ضروری کام ملتوی کر دیتے تاکہ اُنھیں احساس ہو کہ آپ کے دِل میں اُن کی کتنی محبت اور قدر ہے۔

جن دنوں رسول اللہ ﷺ نے وسیع پیمانے پر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اسلام پھیلنے لگا، آپ نے قبائل کو اسلام کی روشنی سے فیض یاب کرنے کے لیے اپنے ہاں سے داعی روانہ کرنے کا آغاز کیا۔ کبھی ضرورت پڑتی تو لشکر بھی بھیج دیتے۔ عدی بن حاتم بنو طے کے سردار اور سردار کے بیٹے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسلامی لشکر قبیلہ طے کی طرف بھیجا۔ عدی بن حاتم جنگ میں شریک نہ ہوئے اور رومیوں کی پناہ میں شام بھاگ گئے۔

مسلمان بنو طے کے علاقے میں پہنچے تو طائی قیادت کے فقدان اور کوئی منظم لشکر نہ ہونے کے باعث اُسے بآسانی فتح کر لیا۔ دورانِ جنگ مسلمانوں کا یہ شیوہ تھا کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک کرتے اور اُن سے شفقت سے پیش آتے۔ بنو طے پر حملے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اُن کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے محفوظ ہو جائیں اور اُن کے دلوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ جائے۔

مسلمانوں نے قومِ عدی کے بعض افراد کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا اور اُنھیں مدینہ لے آئے۔ قیدیوں میں عدی بن حاتم کی بہن بھی شامل تھیں۔ نبی ﷺ کو عدی بن حاتم کے شام کی طرف فرار کرنے کی اطلاع دی گئی تو آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ وہ اپنا دین اور اپنی قوم

چھوڑ کر کیسے بھاگ گئے۔ بہر حال اب عدی تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ اُدھر عدی کو رومیوں کے علاقے میں ٹھہرنا راس نہ آیا۔ مجبوراً انھیں دیارِ عرب واپس آنا پڑا۔ پھر اُنھیں سوائے اس کے کوئی راستہ نظر نہ آیا کہ وہ مدینہ آئیں اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے مصالحت کی شرائط طے کر لیں۔ [2]

عدی مدینہ روانگی کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عرب کا کوئی شخص مجھے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر ناپسند نہیں تھا۔ میں دینِ نصاریٰ پر عمل پیرا تھا اور اپنی قوم کا سردار تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق سنا تو مجھے آپ سے بڑی نفرت ہوئی۔ میں گھر سے روانہ ہوا اور قیصرِ روم کے ہاں چلا گیا۔ پھر مجھے وہاں قیام کرنا بھی اچھا نہ لگا۔ میں نے سوچا میں اس آدمی (محمد ﷺ) کے پاس جاتا ہوں۔ اگر وہ جھوٹا ہوا تو مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا اور اگر وہ سچا ہوا تو بھی معلوم ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر میں مدینے کی طرف چل پڑا۔ جب میں شہر میں داخل ہوا تو لوگ شور کرنے لگے: ''یہ رہا عدی بن حاتم، یہ رہا عدی بن حاتم۔'' میں چلتا چلا گیا اور مسجد میں داخل ہوا جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ نے دریافت کیا:

''عدی بن حاتم ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''جی! عدی بن حاتم ہوں۔'' عدی بن حاتم کی آمد پر رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے۔ اس کے باوجود کہ عدی مسلمانوں کے دشمن تھے، جنگ سے بھاگے تھے، اسلام سے اُنھیں نفرت تھی اور نصاریٰ کے پناہ گزین تھے، رسول اللہ ﷺ نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ آپ نے نہایت خندہ پیشانی اور خوش دلی سے اُنھیں خیر مقدم کہا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑے۔ عدی، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ میں اور محمد (ﷺ) دونوں برابر کے سردار ہیں۔

''محمد (ﷺ) مدینہ اور گردونواح کے بادشاہ ہیں۔''

''اور عدی طے اور اس کے اردگرد کے پہاڑوں کا بادشاہ ہے۔''

''محمد (ﷺ) ایک آسمانی دین ''اسلام'' پر عمل پیرا ہیں۔''

''اور عدی ایک دوسرے آسمانی دین ''نصرانیت'' کا ماننے والا ہے۔''

''محمد (ﷺ) کے پاس الہامی کتاب ''القرآن'' ہے۔''

''اور عدی کے پاس ایک دوسری الہامی کتاب ''انجیل'' ہے۔''

عدی نے محسوس کیا کہ دونوں بادشاہوں میں فوجی قوت کی کمی بیشی کے علاوہ اور کوئی خاص فرق نہیں۔

راستے میں رسول اللہ ﷺ تین مواقع پر ٹھہرے۔

پہلے موقع پر ایک عورت راستے میں کھڑی ہو کر پکارنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے عدی کا ہاتھ چھوڑا، اس کے پاس گئے اور غور سے اُس کی بات سنتے رہے۔

عدی بن حاتم جو بادشاہوں اور وزیروں کی صحبت میں رہ چکے تھے، یہ منظر دیکھنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کے لوگوں سے برتاؤ کا موازنہ اُن رؤساء و زعماء کے برتاؤ سے کرنے لگے جن کے طرزِ عمل کا وہ اس سے قبل مشاہدہ کر چکے تھے۔ دیر تک خاموشی سے تکتے رہے، پھر گویا ہوئے: ''اللہ کی قسم! یہ بادشاہوں کا اخلاق نہیں ہوسکتا۔ یہ انبیاء ہی کا اخلاق ہے۔''

وہ عورت اپنی بات پوری کر چکی تو رسول اللہ ﷺ عدی کی طرف آئے اور دونوں دوبارہ چلنے لگے۔

راستے میں اُنھیں ایک آدمی ملا۔

اس نے شکایت کے لہجے میں کہا: ''یا رسول اللہ! کھانے کو کچھ نہیں ملتا، بھوکوں مر رہے

ہیں۔غربت نے کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔‘‘

وہ آدمی شکایت کر رہا تھا اور عدی سُن رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک اور آدمی آیا اور بولا:

’’اے اللہ کے رسول! اردگرد کے راستوں میں بہت ڈاکے پڑ رہے ہیں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی چند لفظی جواب دیا اور آگے چلتے گئے۔عدی دل ہی دل میں معاملات کا تجزیہ کرنے لگے۔انھوں نے سوچا کہ میں اپنی قوم کا سردار ہوں۔میری ایک عزت ہے، ایک مقام ہے۔میرے دشمن راستوں میں مجھ پر ڈاکے بھی نہیں ڈالتے، پھر میں کیوں ایسے دین میں داخل ہو جاؤں جس کے ماننے والے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور غربت نے اُن کی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے۔

دونوں گھر پہنچے۔گھر میں ایک ہی گدا تھا جو رسول اللہ ﷺ نے عدی کی تکریم کرتے ہوئے اُنھیں دیا اور کہا:

’’یہ لے لیجیے اور اس پر بیٹھ جائیے۔‘‘ عدی نے گدا واپس کرتے ہوئے کہا:’’بلکہ آپ اس پر تشریف رکھیے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے کہا:

’’(نہیں) بلکہ آپ (بیٹھیے)۔‘‘

بہرحال گدا عدی کے پاس رہا اور وہی اس پر بیٹھے۔

اب رسول اللہ ﷺ نے عدی اور اسلام کے درمیان کھڑی رکاوٹیں ہٹا دینے کی ابتدا کی۔آپ یوں گویا ہوئے:

’’عدی! اسلام لے آئیے۔آپ سلامت رہیں گے۔‘‘ یہ بات آپ نے تین بار کہی۔

عدی نے جواب دیا:’’میں بھی ایک دین پر عمل پیرا ہوں۔‘‘

اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا:

''میں آپ کے دین کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔''

عدی حیران ہوئے: ''آپ میرے دین کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

''جی ہاں، کیا آپ کا تعلق رکوسی فرقے سے نہیں؟'' رکوسی نصرانیت کا ایک فرقہ ہے جس پر مجوسیت کے کچھ اثرات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت کا اندازہ کیجیے کہ آپ نے عدی سے یہ نہیں پوچھا: ''کیا آپ نصرانی نہیں ہیں؟'' بلکہ آپ نے عام معلومات سے آگے بڑھ کر اُنھیں خاص معلومات فراہم کرتے ہوئے نصرانیت میں عین اُن کا مذہب یا مسلک بتا دیا۔

اس طرزِ عمل کو ایک اور مثال سے یوں سمجھیے کہ یورپ کے کسی ملک میں آپ کو کوئی نصرانی ملتا اور کہتا ہے: ''آپ نصرانی کیوں نہیں ہو جاتے؟''

آپ کا جواب انکاری ہوتا ہے: ''میں ایک دین پر عمل پیرا ہوں۔''

اس پر وہ آپ سے یہ نہیں کہتا: ''کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟'' اور یہ بھی نہیں: ''کیا آپ سنی نہیں ہیں؟'' بلکہ وہ براہِ راست آپ کے فقہی مسلک کا حوالہ دیتا ہے: ''کیا آپ شافعی نہیں ہیں؟'' یا ''کیا آپ حنبلی نہیں ہیں؟''

کہیے کیا آپ کو کوئی شک وشبہ رہے گا کہ وہ آپ کے دین کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔

گفتگو کا یہی شعار رسول اللہ ﷺ نے عدی کے ساتھ اپنایا اور کہا:

''کیا آپ کا تعلق رکوسی فرقے سے نہیں؟''

''کیوں نہیں! رکوسی فرقے ہی سے ہے۔'' عدی نے جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

"جب آپ کی قوم آپ کی معیت میں جنگ لڑتی ہے، آپ غنائم کا مرباع نہیں کھاتے؟"

"بالکل کھاتا ہوں۔"

"آپ کے دین کی رُو سے تو ایسا کرنا آپ کے لیے حلال نہیں۔"

"جی ہاں، حلال تو نہیں۔" عدی نے دبی آواز میں جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے کہا:

"اسلام سے آپ کو جس چیز نے روک رکھا ہے، میں وہ بھی جانتا ہوں۔ دراصل آپ سوچتے ہیں کہ بے چارے چند ضعیف لوگ اس آدمی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جن کے پاس قوت و طاقت نام کی کوئی چیز نہیں اور اہل عرب نے بھی انھیں اپنے علاقے سے نکال باہر کیا ہے۔"

"عدی! آپ نے حیرہ دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں، البتہ اس کے متعلق سُنا ضرور ہے۔" عدی نے بتایا۔

"قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ اس کام کو ضرور پورا کر کے رہے گا حتی کہ محمل نشین عورت حیرہ سے چل کر آئے گی اور کسی کی پناہ حاصل کیے بغیر بیت اللہ کا طواف کرے گی۔"

یعنی اسلام اس درجہ قوت حاصل کر لے گا کہ حج کی غرض سے آنے والی مسلمان عورت حیرہ سے چلے گی اور بآسانی مکہ پہنچ جائے گی۔ اس کے ساتھ محرم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا جو اسے پناہ دے۔ وہ سیکڑوں قبائل کے قریب سے گزرتی ہوئی آئے گی۔ مسلمانوں کی شان و شوکت اور قوت و سطوت کے باعث کوئی اس عورت پر ہاتھ ڈالنے یا اس کے مال پر ڈاکا ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

عدی نے یہ سُنا تو اُن کے ذہن میں اس منظر کا تصور اُبھر آیا کہ ایک عورت عراق سے چل کر مکہ پہنچے گی۔ مطلب یہ کہ اس کا گزر جزیرۂ عرب کے شمال میں واقع میری قوم طے کے دیار و جبال سے بھی ہوگا۔

عدی نے متعجب ہو کر سوچا:

''طے کے ڈراؤنے ڈاکو اُس وقت کہاں ہوں گے جنھوں نے علاقے میں اودھم مچا رکھا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کہتے جا رہے تھے:

''اور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے بھی ضرور فتح کیے جائیں گے۔''

عدی یہ سُن کر حیران ہوئے: ''ابنِ ہرمز کے خزانے؟''

فرمایا:

''ہاں! کسریٰ بن ہرمز، اور اُس کے اموال بھی لازماً اللہ کی راہ میں لُٹائے جائیں گے۔ اگر آپ کی زندگی لمبی ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ آدمی مٹھی بھر سونا یا چاندی لے کر ایسے افراد کی تلاش میں نکلے گا جو اس سے وہ سونا یا چاندی قبول کر لیں۔ لیکن اُسے کوئی ایسا انسان نہیں ملے گا۔''

یعنی مال و دولت کی ایسی فراوانی ہوگی کہ مالدار آدمی اپنے مال کی زکاۃ اٹھائے گھومتا پھرے گا مگر اسے کوئی ضرورت مند نہیں ملے گا جو اس سے زکاۃ قبول کر لے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے عدی کو آخرت کے متعلق نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''ملاقات کے دن تم میں سے ہر ایک کی اللہ سے ملاقات ہو کر رہے گی۔ اللہ اور اس کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ وہ دائیں دیکھے گا تو جہنم کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا اور بائیں دیکھے گا تو بھی جہنم ہی نظر آئے گی۔''

عدی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے انھیں تفکر کی موجوں سے باہر نکالتے ہوئے کہا:

''عدی! پھر کون سی شے ہے جو آپ کو لا الہ الا اللہ سے دور کر رہی ہے۔ کیا اللہ سے بڑا بھی کوئی معبود آپ کی نظر میں ہے؟''

عدی نے کہا: ''میں مسلمِ حنیف (یکسو مسلمان) ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔'' جیسے ہی عدی نے یہ کہا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے (یہ حدیث بیان کرتے ہوئے راویِ حدیث سے) کہا: ''اب آپ دیکھتے ہیں کہ محمل نشین عورت حیرہ سے چل کر آتی ہے اور بلاخوف وخطر بیت اللہ کا طواف کرتی ہے۔ کسریٰ کے خزانے فتح کرنے والوں میں، میں خود شامل تھا۔ اور اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تیسری بات بھی ہو کر رہے گی کیونکہ اس کی پیش گوئی رسول اللہ ﷺ نے کی ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے اس اعلیٰ کردار پر غور کیجیے کہ آپ نے عدی کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اُن سے نہایت الفت و محبت کا برتاؤ کیا جسے خود عدی بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی رویہ عدی کو اسلام کے قریب لانے کا باعث بنا۔

ہم بھی لوگوں کے ساتھ، وہ چاہے جیسے بھی ہوں، اسی محبت سے پیش آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُن کے دلوں کو مسخر نہ کر سکیں۔

نقطۂ نظر

''ہم نرمی، افہام و تفہیم اور مناسب طرزِ عمل سے اپنا پسندیدہ ماحول پیدا کر سکتے اور اپنی بات منوا سکتے ہیں۔''

---

1 صحیح البخاري، حدیث:3662.

2 کہا جاتا ہے کہ ان کی بہن ہی انھیں شام سے دیارِ عرب واپس لائی تھیں۔

3 مرباع مالِ غنیمت کا چوتھا حصہ ہے جو قبیلے کا سردار اپنے لیے مختص کر لیتا تھا۔ دینِ نصاریٰ میں یہ حرام ہے جبکہ عرب اسے جائز سمجھتے تھے۔

4 حیرہ: یہ لخمی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا جس کے آثار عراق میں کوفہ اور نجد کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ آغازِ اسلام کے وقت یہاں نسطوری نصاریٰ آباد تھے۔ نعمان بن منذر کے نام پر اس کا نام حیرة النعمان پڑ گیا۔ طرفہ اور نابغہ ذُبیانی جیسے شعراء دربارِ حیرہ سے وابستہ رہے۔

5 صحیح البخاري، حدیث:3595. تفصیل کے لیے دیکھیے مسند أحمد:379,378/4، والبدایة والنهایة:5/57-61، ودلائل النبوة للبیهقي:343/5، وصحیح ابن حبان، حدیث:6679.

مہارتوں سے لطف اٹھائیے

انسان کے لیے اس کی مہارتیں اور صلاحیتیں حسی متاع ہیں۔ ان میں اس کے لیے شعوری طور پر دلآویزی اور کشش پائی جاتی ہے۔ یہ اس کے لیے دلچسپی کا سامان ہیں۔ یہاں میری مراد محض اخروی اجروثواب سے نہیں بلکہ واقعتاً یہ ایک ایسا اثاثہ اور ایسی فرحت ہے جسے آپ اس کی حقیقی شکل میں محسوس کر سکتے ہیں۔

اس لیے آپ بھی اپنی مہارتوں سے فائدہ اور لُطف اٹھائیے اور چھوٹے بڑے، غنی و فقیر، قریب و بعید سب لوگوں کے ساتھ معاشرت اور رہن سہن میں اُنھیں آزمائیے۔

آپ ان مہارتوں کو لوگوں کے شر سے محفوظ رہنے، اُن کی محبتیں حاصل کرنے اور اُن کی اصلاح کرنے کے لیے استعمال کیجیے۔

جی ہاں! بالکل! اُن کی اصلاح کرنے کے لیے بھی!

علی بن جہم ایک طبع زاد اور فصیح و بلیغ شاعر تھا۔ وہ روکھا اور تند خو اعرابی تھا جس نے زندگی کو صحرا کے محدود دائرے سے باہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اُن دنوں متوکل تختِ خلافت پر متمکن تھا جس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تعمیل کی جاتی تھی۔ علی بن جہم ایک دن بغداد شہر آیا تو شاعر ہونے کے ناتے اُسے بھی ترغیب دلائی گئی کہ خلیفہ کی مدح سرائی کرو گے تو اُس سے انعام و مرتبہ پاؤ گے۔ وہ یہ سُن کر بہت

خوش ہوا اور قصرِ خلافت کی جانب چل پڑا۔ متوکل کا دربار سجا ہوا تھا اور وہ اپنی شاہانہ سطوت و ہیبت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ شعراء اُس کی شان میں قصیدہ گوئی کر رہے اور انعام پا رہے تھے۔

علی بن جہم نے بھی خلیفہ کی مدح میں قصیدہ کہنا شروع کیا، جس کا مطلع تھا:

أَنْتَ كَالْكَلْبِ فِي حِفَاظِكَ لِلْوُدِّ
وَكَالتَّيْسِ فِي قِرَاعِ الْخُطُوبِ

''آپ محبت کی حفاظت اور وفا شعاری میں کتے کی طرح ہیں اور سانڈ کی مانند مصائب سے برسرِ پیکار ہیں۔''

أَنْتَ كَالدَّلْوِ لَا عَدِمْتُكَ دَلْواً
مِنْ كِبَارِ الدِّلَاءِ كَثِيرِ الذَّنُوبِ

''آپ کنویں کا ڈول ہیں۔ ایسا بڑا ڈول جسے میں کھونا نہیں چاہوں گا۔ یہ بڑا ڈول بڑی بالٹی کا پانی بڑھا دیتا ہے۔''

اس سے قبل خلیفہ کو سورج، چاند اور کوہساروں سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اب جبکہ علی بن جہم اسے سانڈ، بکرے، کنویں اور مٹی وغیرہ سے تشبیہ دینے لگا، خلیفہ برافروختہ ہو گیا۔ اس کے دربان بھی اشتعال میں آ گئے، تلواریں کھچ گئیں، چرمی فرش بچھا دیے گئے اور جلاّد شاعر کو قتل کرنے کے لیے تیار تھا کہ خلیفہ کو ادراک ہوا، دراصل علی بن جہم پر اُس کی فطرت و جبلت غالب آ گئی ہے۔ خلیفہ نے اس کی فطرت تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے حکم صادر کیا کہ علی بن جہم کو ایک عظیم الشان محل میں ٹھہرایا جائے اور شہر کی خوب صورت ترین کنیز صبح و شام اس کے پاس انواع و اقسام کے پھل اور کھانے پینے کی اشیاء لے کر جایا کرے۔ محل میں رہتے

ہوئے علی بن جہم ناز ونعمت اور آسودگی کی لذتوں سے آشنا ہوا۔ وہ گاؤ تکیے پر بیٹھا کرتا اور شہر کے بڑے بڑے غزل گو اور نازک سخن شعراء و ادباء سے اس کی ملاقاتیں اور مجلسیں ہوتیں۔
سات مہینے یونہی گزر گئے۔ ایک رات خلیفہ معمول کے مطابق داستان گوئی کی محفل میں جلوہ نما ہوا تو اُسے علی بن جہم یاد آیا۔ خلیفہ نے اس کے متعلق دریافت کیا تو خادم گیا اور اُسے بلا لایا۔
علی بن جہم دربارِ خلافت میں حاضر ہوا۔ خلیفہ نے حکم دیا: ''علی بن جہم! ہمارے لیے شعر کہو۔''
علی بن جہم گویا ہوا:

عُيُونُ الْمَهَا بَيْنَ الرُّصَافَةِ وَالْجِسْرِ
جَلَبْنَ الْهَوٰى مِنْ حَيْثُ أَدْرِي وَلَا أَدْرِي

''رُصافہ اور پُل کے درمیان نیل گائے جیسی آنکھوں نے عشق کی آگ بھڑکا دی، یوں کہ میں جانتا ہوں اور نہیں بھی جانتا۔''

أَعَدْنَ لِيَ الشَّوْقَ الْقَدِيمَ وَلَمْ أَكُنْ
سَلَوْتُ وَلٰكِنْ زِدْنَ جَمْرًا عَلَى جَمْرِ

''اُنھوں نے پرانے اشتیاق کو پھر سے بیدار کر دیا جبکہ میرا غم (ابھی) غلط نہیں ہوا تھا۔ اُن آنکھوں نے کوئلے پر کوئلہ رکھ کر سلگتی چنگاری کو ہوا دے دی ہے۔''

یوں علی بن جہم سخنِ نازک تر کے ذریعے سے دلوں کے تار چھیڑتا رہا۔ اُس نے اپنے اشعار میں خلیفہ کو سورج، چاند اور تلوار سے تشبیہ دی۔
خلیفہ نے ایک مناسب انداز اختیار کر کے ابن جہم کی خُو بدل دی اور اس کی فطرت میں تغیر برپا کر دیا۔ ہم میں سے اکثر کو اپنی اولاد اور اپنے دوست احباب کی سخت مزاجی اور بدخوئی کی شکایت رہتی ہے۔ تو کیا ہم نے بھی اُن کے خصائل میں تغیر لانے کی سعی

کی؟ بلکہ اس سے بھی پہلے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ اپنی وضع بدلنے کی کوشش کریں۔ ترش رُوئی چھوڑ کر چہرے پر مسکراہٹ لائیں۔ غصّہ نہ کریں اور تحمل سے کام لیں۔ کنجوسی ترک کر کے کشادہ دِلی اپنائیں۔ یہ کام مشکل نہیں، تاہم اس کے لیے عزم وہمت اور مشق کی ضرورت ہے، اس لیے بہادر بنئے۔

پیغمبر اسلام محمد ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ میل ملاپ اور معاشرت میں اخلاقی مہارتیں استعمال کیا کرتے تھے۔ اسی غیر معمولی اخلاقی کردار کی بدولت آپ نے اُن کے قلوب کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ اعلیٰ اخلاق بناوٹی نہیں تھا اور ایسا نہیں تھا کہ لوگوں کے سامنے تو بڑے با اخلاق نظر آتے لیکن جب گھر جاتے تو تحمل غضب میں اور نرمی درشتی میں بدل جاتی۔

نہیں!! رسول اللہ ﷺ کا چہرہ عام لوگوں کے لیے مسکراتا اور اپنے گھر والوں کے لیے ترش نہیں تھا۔ یہ بات بھی ہرگز نہیں تھی کہ اللہ کے رسول باہر کے لوگوں کے لیے تو بہت اچھے اور نوبل ہوں اور گھر آئیں تو بیوی بچوں کے سامنے جلّاد کا روپ دھار لیں۔

نہیں!! بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ فطری وطبعی تھے اور آپ کی مبارک عادات کا حصہ تھے۔ یہ اخلاق آپ ﷺ نے اللہ کی عبادت کے طور پر اپنا رکھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی مسکراہٹ سے اللہ کے قرب کی امید رکھتے تھے۔ آپ نے تحمل، نرمی اور عفو ودرگزر کو عبادت کے طور پر اپنا رکھا تھا۔

اور بلاشبہ جو آدمی حسنِ اخلاق کو عبادت سمجھتا ہے وہ حرب وضرب اور امن وامان، فقر وفاقہ اور آسودگی، بیماری وصحت مندی اور غم وخوشی کے تمام حالات میں حسنِ اخلاق پر عمل پیرا رہتا ہے۔

کتنی ایسی بیویاں ہیں جو اپنے شوہروں کی شرافت اور خوش اخلاقی کے قصیدے سنتی

ہیں۔ان کی کشادہ دِلی، ہنس مکھی اور شادابیِ طبع کے قصے زبان زدِعام ہوتے ہیں لیکن خود بیویوں کو اُن کے عالی اخلاق شوہروں میں ایسی کوئی بات یا صفت نظر نہیں آتی۔ وہ بیچاری رفتار و گفتار کے ان کرشموں کی اثر آفرینی سے محروم ہی رہتی ہیں کیونکہ گھر آتے ہی خاوند اپنے اوپر بد اخلاقی، تنگدلی اور ترش رُوئی کا خول چڑھا لیتا ہے، بات بات پر مشتعل ہو کر غُل اٹھاتا ہے، لعنت ملامت کرتا ہے، گالیاں بکتا ہے، بخل سے کام لیتا اور نان ونفقہ کی ذمہ داری کا احسان جتلاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے اچھا ہے۔ میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہوں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا اپنی بیویوں کے ساتھ کیسا طرزِ عمل تھا، اسود بن یزید اس کی بابت بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ''رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟''

انھوں نے بتایا: ''رسول اللہ ﷺ گھر کے کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے تھے، پھر جب نماز کا وقت ہو جاتا، آپ وضو کرتے اور نماز کے لیے نکل جاتے۔''[2]

ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کے حسن اخلاق، تبسم، رحم و کرم اور دوسروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کے متعلق ہم سنتے ہیں لیکن جن والدین اور بیوی بچوں کا حق اُن پر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور وہ اُن کے سب سے قریبی ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ وہ نہایت ترش رویہ اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن سے میل جول بھی کم ہی رکھتے ہیں۔

جی ہاں! سب سے اچھا انسان وہ ہے جو سب سے پہلے اپنے والدین، اپنے بیوی

بچوں اور نوکروں کے لیے اچھا ہے۔

ایک پُر کیف دن کی صبح ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ حسن یا حسین میں سے کوئی قدم قدم چلتا نبی ﷺ کے پاس آ گیا۔ آپ نے اسے اُٹھایا اور بطنِ مبارک پر بٹھا لیا۔ ننھے نے رسول اللہ ﷺ کے پیٹ پر ہی پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ ابو لیلیٰ نے بتایا: ''میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے بطنِ مبارک پر پیشاب کی دھاریاں بہہ رہی ہیں۔ ہم فوراً بچے کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو آپ نے فرمایا:

''میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ اسے پریشان نہ کریں۔''[3]

بچہ پیشاب کر چکا تو آپ نے پانی منگایا اور پیشاب پر بہا دیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنے نفس کو ایسا خوش گوار طرزِ زندگی اپنانے پر راضی کر لیا تھا، اس لیے تعجب نہیں کہ چھوٹے بڑے سب کے دلوں پر آپ کی حکمرانی تھی۔

مشورہ

''اندھیرے کو کوسنے کے بجائے اپنا چراغ ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔''

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 1977. [2] صحيح البخاري، حديث: 676. [3] مسند أحمد: 348/4.

فقراء و مساکین کے ساتھ

آج کل لوگوں کی ایک کثیر تعداد کے اخلاق تجارتی نوعیت کے ہیں۔ آج کل امیر آدمی وہ ہے جس کی نکتہ آفرینی پر سامعین خوشامدانہ ہنسی ہنستے ہیں اور اُس کی غلطیوں کو حقیر جان کر اُن سے عموماً اغماض برتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس غریب آدمی وہ ہے جس کی نکتہ سنجی حاضرین پر گراں گزرتی ہے اور وہ بجائے تحسین کے اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ ایسے آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو لوگ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں اور اس کی آنکھ کا تنکا بھی اُنھیں شہتیر نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل نہایت سیدھا سادہ تھا۔ آپ غنی و فقیر دونوں سے برابر کا مشفقانہ سلوک روا رکھتے تھے۔

انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ زاہر بن حرام نامی ایک بادیہ نشین جب بھی کسی کام سے مدینہ آتا، رسول اللہ ﷺ کے لیے پنیر یا گھی کا تحفہ ضرور لاتا۔ واپسی پر نبی ﷺ بھی اسے کھجور یا مدینے کی کوئی اور سوغات تحفے کے طور پر عنایت کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کو زاہر سے بہت محبت تھی۔ آپ کہا کرتے:

''زاہر ہمارا بادیہ نشین ہے اور ہم اس کے شہری دوست ہیں۔''

زاہر واجبی شکل و صورت کا مالک تھا۔ وہ ایک دن بادیہ سے روانہ ہوا اور نبی ﷺ سے

ملنے آپ کے گھر آیا۔ آپ گھر پر نہیں تھے۔ زاہر کے پاس تجارت کا کچھ سامان تھا جسے لے کر وہ بازار چلا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کو زاہر کی آمد کا پتا چلا تو آپ بازار جا کر اسے تلاش کرنے لگے۔ ایک جگہ آپ نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ پسینے میں شرابور کھڑا اپنا سامان بیچ رہا تھا۔ اس کے کپڑے گندے تھے جیسا کہ بادیہ نشینوں کے ہوتے ہیں اور اُن سے بو آ رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ عقب سے گئے اور چپکے سے اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ زاہر آپ کو نہ دیکھ سکا۔ وہ گھبرا کر چلّایا: ''چھوڑو مجھے......کون ہو تم؟''

رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ زاہر نے گرفت سے نکلنے کی کوشش میں قدرے مڑ کر دیکھا۔ اسے نبی ﷺ نظر آئے تو اطمینان ہو گیا اور گھبراہٹ جاتی رہی۔

اب وہ آپ کے سینے سے اپنی پیٹھ چمٹانے لگا۔ نبی ﷺ بھی اس سے خوش طبعی کرنے لگے اور آس پاس کھڑے لوگوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز سے کہا:

''یہ غلام کون خریدے گا؟ یہ غلام کون خریدے گا؟''

زاہر جو اپنی پتلی حالتِ زار سے بخوبی واقف تھا، شگفتگی سے بولا: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! تب تو آپ کو میری قیمت زیادہ نہیں ملے گی۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا:

''لیکن اللہ کے ہاں تم کم قیمت نہیں ہو......، اللہ کے نزدیک تم قیمتی ہو۔''[1]

چنانچہ اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ غرباء و مساکین کے دِل نبی ﷺ کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ اُن سے ایسا ہی دوستانہ اور ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔

اکثر فقراء و مساکین کو مالداروں سے یہ شکایت نہیں ہوتی کہ وہ مال خرچ کرنے اور کھانا

کھلانے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ دراصل اُنھیں امیروں کے رویے سے شکایت ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نرمی اور حُسنِ اَخلاق سے پیش نہیں آتے۔

کتنے غریب لوگ ایسے ہوں گے جن کے منہ پر آپ مسکرا دیے اور اُن کی عزتِ نفس کا خیال رکھا تو انھوں نے آپ کے لیے رات کی تاریکیوں میں دعائے رحمت کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔

اور ایسے پراگندہ بدحال لوگ بھی بہت ہوں گے جنھیں دروازوں سے دھکّے دے کر پیچھے ہٹایا جاتا ہے اور ذرہ برابر اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن اگر وہ اللہ پر قسم ڈال دیں تو اللہ اُن کی لاج رکھ لیتا ہے۔

اشارہ

”ہوسکتا ہے کہ کسی غریب و مسکین کے منہ پر آپ کی ایک مسکراہٹ اللہ کے نزدیک آپ کا مرتبہ بلند کر دے۔“

1 مسند أحمد: 161/3.

خواتین

پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ مرد جس کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی عورت کے جذباتِ محبت والفت کو تسکین نہ ملے، اس عورت کے دل میں یہ بات آجاتی ہے کہ طلاق لے کر کسی ایسے مرد سے شادی کر لے جو خوش گفتار اور نرم خُو ہو اور جو اُس کے جذبات کو سمجھ سکے، اس لیے کہ اگر اللہ نے مرد کو قوی جسم عطا کیا ہے تو عورت کو قوی جذبہ ودیعت کیا ہے جس کی قوت اور بہاؤ کے آگے بادشاہوں اور بہادروں کی سطوت و ہیبت بھی دم نہیں مار سکتی۔

عورتوں کے ساتھ رہن سہن اور معاشرت کے سلسلے میں یہ بات بے حد ضروری ہے کہ آپ وہ چابی حاصل کر لیں جس سے اُس کے دل کا قفل کھول کر اندر داخل ہو سکیں۔ اس چابی کا نام ''جذبہ'' ہے۔ یہ عورت کا ہتھیار ہے۔ عورت کو اپنانے کے لیے لازمی ہے کہ آپ اس کا مقابلہ اُسی کے ہتھیاروں سے کریں۔

نبی اکرم ﷺ نے ہمیشہ عورت سے اچھا سلوک کرنے اور اس کے جذبات کا احترام کرنے کی تلقین کی ہے۔ آپ ﷺ نے والد کو اپنی بیٹیوں کے ساتھ نرمی و رحمدلی اور محبت کی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

«مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ

أَصَابِعَهُ»

''جس آدمی نے دولڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک پرورش کی، قیامت کے دن وہ اور میں یوں اکٹھے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر آپ نے اپنی انگلیاں جوڑ لیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اولاد کو بھی ماں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی تاکید کی۔

ایک آدمی نے آپ ﷺ سے پوچھا:

''میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟''

آپ نے فرمایا:

''تمھاری ماں، تمھاری ماں، تمھاری ماں، پھر تمھارا باپ۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے شوہر کو بھی بیوی کے ساتھ بہترین طرزِ عمل اپنانے کی تلقین کی۔ آپ نے ایسے آدمی کی شدید مذمت کی جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی عورت سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے بُرا سلوک کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں کھڑے تھے۔ آپ کے اردگرد ایک لاکھ کے قریب حُجاج تھے جن میں سیاہ و سفید، چھوٹے بڑے، غنی و فقیر سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ آپ نے اُن سب سے مخاطب ہو کر بلند آواز سے فرمایا:

«أَلَا وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، أَلَا وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا»

''سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کی وصیت لے لو۔ سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کی وصیت لے لو۔''[3]

ایک دن مدینے کی کئی عورتوں نے رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے

اپنے شوہروں کی شکایت کی۔ نبی ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''آلِ محمد ﷺ کے ہاں بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کے متعلق شکایات لے کر آئی ہیں۔ یہ لوگ (جن کی شکایت کی گئی ہے) اچھے نہیں ہیں۔''[1]

آپ نے مزید فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَ أَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے اچھا ہے اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہوں۔''[2]

دینِ اسلام نے تو عورت کو اس حد تک عزت و احترام سے نوازا کہ ایک عورت کی عصمت کی خاطر جنگیں بپا ہوئیں، خون کے نذرانے پیش کیے گئے اور اکنافِ عالم میں اسلامی فتوحات کے پرچم لہرائے گئے۔

مدینہ میں یہود مسلمانوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اُنھیں حجاب کا اترنا اور مسلمان عورتوں کا باپردہ چلنا پھرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسلم خواتین کے حلقے میں فساد اور عریانی کے بیج بونے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ تاہم ابھی تک وہ اپنی اِن مذموم کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

ایک روز ایک مسلم عورت یہودِ بنی قینقاع کے بازار سے سودا سلف لینے آئی۔ وہ ایک عفت مآب اور باحجاب خاتون تھی۔ وہ وہاں کے ایک یہودی سنار کے پاس گئی اور اس کی دکان میں بیٹھ گئی۔ یہود اس کی پاکیزگی اور باپردگی دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس خاتون کے دیدار اور لمس کی لذت سے اسی طرح لطف اٹھائیں اور کھلواڑ کریں جیسے وہ اسلام کی آمد سے پہلے کیا کرتے تھے۔

یہود اس خاتون کو حجاب کھول دینے اور چہرہ دکھانے پر مجبور کرنے لگے لیکن اس نے ان کی ایک نہ مانی۔ وہ خاتون بیٹھی تھی کہ اس خبیث سنار نے موقع پا کر پچھلی جانب سے اس کی قمیص کا دامن کمر پر لٹکتے دوپٹے کے پلّو سے باندھ دیا۔ خاتون کھڑی ہوئی تو پچھلی جانب سے قمیص کا دامن اُٹھ گیا اور پردہ کھل گیا۔ اس پر آس پاس کھڑے یہود نے زور کا قہقہہ لگایا۔ عفت مآب مسلم خاتون چیخی چلائی کہ تم مجھے قتل کر دیتے تو یہ میرے لیے بے پردہ ہونے سے کہیں بہتر تھا۔ ایک مسلمان بھی وہیں کہیں کھڑا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو تلوار سونت کر یہودی سنار پر چڑھ دوڑا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہود نے مسلمان پر حملہ کر کے اسے شہید کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو سانحے کا علم ہوا اور آپ کو بتایا گیا کہ یہود نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور وہ مسلم خواتین کی بے حرمتی کے مرتکب ہوئے ہیں تو آپ نے اسلامی لشکر کے ہمراہ اُن کا محاصرہ کر لیا۔ اور جب تک یہود نے نبی ﷺ کا فیصلہ تسلیم نہ کر لیا، آپ پیچھے نہ ہٹے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارادہ تھا کہ یہود کو ان کے کیے کی عبرتناک سزا دی جائے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ایک پاکیزہ مسلم خاتون کی عصمت کی کیا قدر و قیمت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے ارادے پر عمل درآمد کرنا چاہا تو شیطانی فوج کا ایک سپاہی جسے مسلم خواتین کی عزت و حرمت کی کوئی پروا تھی نہ اسلام سے کوئی سروکار، آپ کی طرف بڑھا۔ یہ اس طبقے کا فرد تھا جس کا مطمح نظر اول و آخر اپنا پیٹ بھرنا اور سفلی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھا اور بولا: ”اے محمد (ﷺ)! میرے ہمدرد و ہمنوا یہود سے اچھا سلوک کرو۔“

یہ لوگ عہد جاہلیت میں ابنِ ابی کے انصار تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے منہ پھیر

لیا اور اس کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ان لوگوں کے لیے عفوودرگزر کا طالب تھا جو ایمان والوں میں فحاشی وعریانی کا فروغ چاہتے تھے۔

منافقوں کا سردار پھر کھڑا ہوا اور درشتی سے بولا: ''اے محمد (ﷺ)! یہود سے اچھا برتاؤ کرو۔'' نبی کریم ﷺ نے عفت مآب مسلم خواتین کی غیرت کے مارے اس بار بھی اس سے رُخ پھیر لیا۔ اس پر منافق غصے میں آ گیا۔ اس بدطینت نے نبی کریم ﷺ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا: ''میرے ہمدردوں سے اچھا سلوک کرو، میرے ہم نواؤں سے اچھا برتاؤ کرو۔'' نبی کریم ﷺ کو سخت غصہ آیا۔ آپ نے مڑ کر اسے دیکھا اور بلند آواز سے کہا:

''مجھے چھوڑ دو۔''

منافق نہ مانا۔ وہ نبی ﷺ کو قسمیں دینے لگا کہ تمھیں یہود کے قتل کا حکم واپس لینا پڑے گا۔ بالآخر آپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

''جاؤ، وہ تمھارے ہیں۔''[6]

رسول اللہ ﷺ نے یہود کے قتل کا فیصلہ تو واپس لے لیا لیکن انھیں مدینے سے جلاوطن کر دیا۔ جی ہاں! ایک مسلمان عورت کی عزت اسی تحفظ کی حق دار تھی۔

ثعلبہ کی بیٹی خولہ رضی اللہ عنہا کا شمار نیک اطوار صحابیات میں ہوتا تھا۔ ان کے شوہر اوس بن صامت رضی اللہ عنہ خاصے عمر رسیدہ تھے اور اُنھیں غصہ جلدی آجاتا تھا۔ ایک دن قوم کی محفل سے واپس گھر آئے تو بیوی سے کسی معاملے پر تلخ کلامی ہو گئی۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اوس بن صامت بہت برہم ہوئے اور کہا: ''تم میرے لیے میری ماں جیسی ہو۔'' اور غصے سے گھر سے نکل گئے۔ جاہلیت میں اس بات کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تمھیں طلاق دی۔ خولہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسلام میں ایسی بات کہنے کا حکم کیا ہے۔ اوس

گھر واپس آئے تو بیوی دور بھاگنے لگی۔ وہ بولیں: ''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں خولہ کی جان ہے! تم نے جو کہا سو کہا، اب جب تک اللہ اور اس کے رسول ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر دیتے، تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔'' پھر خولہ رسول اللہ ﷺ کی طرف گئیں اور اُن سے سارا قصہ بیان کیا۔ انھوں نے شکایت کی کہ اُن کا شوہر بد اخلاقی سے پیش آتا اور بے عزتی کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں صبر کی تلقین فرمائی:

''خولہ! وہ آپ کے عم زاد ہیں۔ بے چارے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اُن کے بارے میں اللہ سے ڈریے۔''

''اے اللہ کے رسول! وہ میری جوانی کھا گیا۔ میرے پیٹ نے اس کے لیے پھول بکھیرے۔ اب جبکہ میری عمر زیادہ ہو گئی اور بچوں کی ولادت رُک گئی تو اس نے مجھے اپنی ماں کہہ دیا۔ اے اللہ! میں تجھ سے شکایت کرتی ہوں۔'' خولہ نے روتے ہوئے التجا کی۔

رسول اللہ ﷺ ان دونوں میاں بیوی کے متعلق اللہ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ خولہ ابھی رسول اللہ ﷺ کے ہاں بیٹھی تھیں کہ جبریل آسمان سے وحی لے کر اترے۔

رسول اللہ ﷺ نے خولہ رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھا اور نرمی سے فرمایا:

''اچھی خولہ! اللہ نے آپ اور آپ کے شوہر کے متعلق وحی نازل کی ہے۔''

پھر آپ نے پڑھنا شروع کیا:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝﴾

''اللہ سن چکا اس عورت کی بات جو تجھ سے اپنے شوہر کے متعلق مجادلہ کرتی ہے اور اللہ سے شکایت کرتی ہے جبکہ اللہ تم دونوں کی بات چیت سن رہا ہے۔ واقعتاً اللہ

خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔“ [7]

پھر رسول اللہ ﷺ نے خولہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

”اپنے شوہر سے کہیں کہ وہ ایک گردن آزاد کر دے۔“

وہ بولیں: ”اللہ کے رسول! اس کے پاس آزاد کرنے کو کچھ بھی نہیں۔“

آپ نے کہا:

”پھر دو ماہ کے پے بہ پے روزے رکھے۔“

وہ بولیں: ”واللہ! وہ تو بوڑھا پھونس ہے۔ وہ کہاں روزے رکھتا پھرے گا۔“

آپ نے فرمایا:

”پھر ساٹھ مساکین کو ایک وسق (تقریباً پانچ مَن) کھجور کھلا دے۔“

انھوں نے بتایا: ”اللہ کے رسول! اتنی کھجوریں بھی اس کے پاس نہیں۔“

آپ نے فرمایا:

”ہم کھجور کا ایک ٹوکرا دے کر ان کی مدد کریں گے۔“

وہ کہنے لگیں: ”اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! میں بھی ایک ٹوکرا دے کر اس کی مدد کروں گی۔“

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اچھی بات ہے۔ تو جایئے اور کھجوریں اپنے شوہر کی طرف سے صدقہ کر دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ کو آپ کے عم زاد کے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔“ [8]

پاک ہے وہ ذات جس نے رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کے ذاتی مسائل کے حل میں بھی نرمی، بردباری اور ہم آہنگی کے اوصاف سے نوازا۔

مجھے خود اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اور ان سے قبل بہن اور والدہ کے ساتھ جذباتی

رویہ اپنانے اور اپنے طرزِ عمل میں ملائمت اختیار کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ مجھے اِن طریقوں میں ایسی کمال تاثیر نظر آئی ہے جس کا تصور صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اُنھیں روزمرہ زندگی میں آزمایا ہو۔

یہ بات تو طے ہے کہ عورت کی عزت صرف وہی آدمی کرتا ہے جو خود عزت دار ہو اور عورت کی توہین وہی کرتا ہے جو خود کمینہ ہو۔

ذرا سا توقف

''عورت اپنے خاوند کی بدصورتی، مصروفیت یا غربت پر تو صبر کرسکتی ہے لیکن وہ اپنے خاوند کی بداخلاقی برداشت نہیں کرسکتی۔''

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 2631. 2 صحیح مسلم، حدیث: 2548. 3 صحیح مسلم، قبل الحدیث: 1467، وجامع الترمذي، حدیث: 1163. 4 سنن أبي داود، حدیث: 2146. 5 جامع الترمذي، حدیث: 3895، وسنن ابن ماجة، حدیث: 1977. 6 السیرة النبویة لابن هشام: 52,51/3. 7 المجادلة 58:1. 8 مسند أحمد: 410/6. یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔

بچے

بچپن میں پیش آنے والے بیشتر فرحت انگیز یا ناخوشگوار واقعات آج بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں، یوں جیسے کل ہی کی بات ہو۔

آپ اپنے ذہن کی باگیں ذرا ماضی میں گزرے ایامِ طفولیت کی طرف موڑیے، بے اختیار آپ کو خوشی غمی کے مختلف واقعات یاد آئیں گے۔ آپ کو یاد آئے گا کہ اسکول میں کسی مقابلے میں حصہ لینے پر آپ نے انعام حاصل کیا تھا۔ آپ کو یاد آئے گا کہ ایک محفل میں کسی نے آپ کی ستایش کی تھی۔ یہ اور اس طرح کے کئی خوشی کے مواقع آپ کے حافظے کی لوح پر کندہ ہوں گے جنھیں آپ بھلا نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بچپن میں پیش آمدہ ناخوشگوار اور دُکھی واقعات بھی یاد رکھتے ہیں۔ استاد نے کبھی پیٹا ہو یا اسکول میں کسی سے جھگڑا ہوا ہو یا ایسے مواقع جن میں ہمیں خاندان والوں کی طرف سے توہین آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بچوں سے اچھا سلوک کرنا نہ صرف خود اُنھیں متاثر کرتا ہے بلکہ اُن کے والدین اور عزیز و اقارب بھی اس کا خوش کُن اثر لیے بغیر نہیں رہتے۔ بالخصوص پرائمری اسکول کے ٹیچر کے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ننھا طالبِ علم گھر جا کر بتاتا ہے کہ ہمارا استاد بہت اچھا ہے، مار تو دور کی بات اس نے ہمیں کبھی ڈانٹا بھی نہیں تو اس کے والدین بھی استاد سے ملاقات ہونے پر اس کے طرزِ عمل کی تعریف

اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ خوشی کے ان جذبات کا اظہار کبھی سرِ راہ آمنا سامنا ہونے پر یا تحفہ پیش کر کے یا خط لکھ کر بھی کیا جاتا ہے۔ اس لیے بچے کے سامنے مسکراہٹ کو معمولی نہ جانیے۔ آپ کے بہتر طرزِ عمل ہی سے بچے کے دل میں آپ کی جگہ بن پائے گی۔

ایک دن میں نے ایک مقامی اسکول میں ننھے طلبہ کو نماز کے موضوع پر لیکچر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ کسی بچے کو نماز کی اہمیت کے متعلق کوئی حدیث یاد ہو تو بتائے۔ ایک بچہ کھڑا ہوا اور بولا: ''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الْكُفْرِ أَوِ الشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»

''آدمی اور کفر و شرک کے درمیان (کی کڑی) ترکِ نماز ہے۔''[1]

مجھے اس کا جواب بہت پسند آیا اور اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی گھڑی اتار کر اسے انعام میں دے دی۔ میں عام طور پر معمولی قسم کی گھڑی پہنتا ہوں۔ ایسی گھڑیاں ہمارا محنت کش طبقہ استعمال کرتا ہے۔

میرے دیے ہوئے انعام نے لڑکے کو بہت انگیز کیا۔ اسے علم سے بڑی محبت ہو گئی اور اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ بعدازاں وہ حفظِ قرآن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ ایک دن میں ایک مسجد میں نماز کے لیے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی لڑکا جسے کئی سال پہلے میں نے انعام دیا تھا، مسجد کا امام ہے۔ اب وہ جوان ہو چکا تھا اور شریعہ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر کسی عدالت کے تحت قضاء کے شعبے میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے اسے نہیں پہچانا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

جس محبت اور عزت افزائی سے وہ کئی سال پہلے بہرہ ور ہوا تھا اس کا خوشگوار اثر آج بھی اس کے ذہن میں باقی تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے رات کی کسی دعوت میں مدعو کیا گیا۔ وہاں میری ملاقات

ایک روشن چہرہ نوجوان سے ہوئی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے سلام کیا اور بتایا کہ ایک موقع پر آپ نے ہمارے اسکول میں لیکچر دیا تھا، تب میں چھوٹا تھا۔

میری عادت ہے کہ میں بچوں کا کچھ زیادہ ہی احترام کرتا اور انھیں بڑوں سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ ان کی میٹھی باتیں جو اکثر غیر اہم ہوتی ہیں، بغور سنتا ہوں۔

میرا ایک دوست ہے جو مجھ سے کبھی کبھار ملتا ہے۔ جب بھی اس سے میری ملاقات ہوتی ہے، اس کا چھوٹا بچہ اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ میں اپنی عادت کے مطابق ننھے سے پیار کرتا ہوں اور اس سے دوستانہ رویہ رکھتا ہوں۔

ایک روز میرا یہی دوست مجھے ایک بڑی تقریب میں ملا۔ اس کا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں باپ بیٹا نے مجھے سلام کیا، پھر میرا دوست کہنے لگا: ''یار! تم نے میرے بچے پر کیا جادو کر دیا ہے! چند دن پہلے ان کے استاد نے طلبہ سے پوچھا تھا کہ وہ مستقبل میں کیا بننا پسند کریں گے۔

ایک نے کہا: میں ڈاکٹر بنوں گا، دوسرا کہنے لگا: میں انجینئر بنوں گا اور میرے بچے نے کہا: میں محمد عریفی بنوں گا!

بچوں سے طرزِ عمل کے سلسلے میں لوگوں کے رویے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک آدمی محفل میں آتا ہے اور فرداً فرداً حاضرینِ محفل سے ہاتھ ملاتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا بچہ بھی والد کی نقل کرتا ہے۔ حاضرین میں سے کوئی تو بچے سے تغافل برتتا ہے، کوئی سرسری مصافحے پر اکتفا کرتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ زور سے ہلاتے ہوئے پر جوش انداز میں کہتا ہے: ''آؤ میرے شیر! شرارتی، کیا حال ہے تمھارا؟'' یہ آخری شخص بچے کے دل پر اپنی محبت ثبت کر دے گا۔

مربِّیِ اول ﷺ بچوں سے بہت مشفقانہ سلوک کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا

ایک چھوٹا بھائی تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس سے لاڈ پیار کرتے۔ آپ اسے ابو عمیر کی کنیت سے پکارتے تھے۔ ننھے کے پاس ایک پرندہ تھا جس سے وہ کھیلتا تھا۔ پرندہ مر گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اس سے جب بھی ملتے پیار سے کہتے:

''ابو عمیر! وہ نُغَیر (بلبل) کیا ہوا؟''[2]

زینب بنت ام سلمہ کو رسول اللہ ﷺ محبت سے پکارتے:

''یَا زُوَیْنِب، یَا زُوَیْنِب''[3]

رسول اللہ ﷺ کھیلتے بچوں کے پاس سے گزرتے تو انھیں سلام کہتے۔

آپ ﷺ انصار کے ہاں جاتے تو ان کے بچوں کو سلام کہتے اور ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔

رسول اللہ ﷺ کسی معرکے سے واپس آتے اور بچے آپ کا استقبال کرتے تو آپ انھیں سوار کر لیتے۔ مسلمانوں کا لشکر جنگِ موتہ سے لوٹا تو رسول اللہ ﷺ اور اہلِ مدینہ نے ان کا استقبال کیا۔ مدینہ کے بچے بھی دوڑے گئے اور غازیانِ اسلام سے ملاقات کی۔ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کو دیکھا تو فرمایا:

''بچوں کو اپنے ساتھ سوار کر لیں۔ عبداللہ بن جعفر مجھے پکڑا دیں۔''

عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کو لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اسے سواری پر آگے بٹھا لیا۔[4]

رسول اللہ ﷺ ایک دن وضو کر رہے تھے۔ ایک پانچ سالہ بچہ محمود بن ربیع آپ کی طرف آیا۔ آپ نے منہ میں پانی ڈالا اور بچے سے دل لگی کرتے ہوئے اس کے منہ پر کلی کی۔[5]

رسول اللہ ﷺ بڑے ہنس مکھ اور ہشاش بشاش تھے۔ آپ سے مل کر لوگوں کے دل سرور و انبساط کے خوب صورت جذبات سے بھر جاتے۔ آپ کی محفل میں بیٹھا کوئی آدمی

اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن کوئی آدمی سواری کا جانور مانگنے رسول اللہ ﷺ کے ہاں آیا۔آپ نے اس سے کہا:

''میں تو آپ کو اونٹنی کا بچہ دوں گا۔''

آدمی کو قدرے تعجب ہوا کہ اونٹنی کا بچہ اس کا بار کیونکر اٹھائے گا۔اس نے کہا:

''اللہ کے رسول! اونٹنی کا بچہ لے کر میں کیا کروں گا؟''

رسول اللہ ﷺ نے خوش طبعی سے جواب دیا:

''اونٹ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔''[6]

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہنستے ہوئے انس کو بلایا:

''او دو کانوں والے!''[7]

ایک روز ایک عورت اپنے خاوند کی شکایت لے کر آئی۔آپ نے اس سے فرمایا:

''آپ کا خاوند وہی ہے نا جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے؟''[8]

وہ عورت گھبرائی، اس نے سمجھا کہ اس کے شوہر کی نظر جاتی رہی ہے۔عربی زبان میں آنکھوں میں سفیدی ہونے سے مراد اندھا پن بھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھی یہ تعبیر استعمال کی ہے۔یعقوب علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾

''اور اس کی آنکھیں غم کے مارے سفید ہوگئیں۔''[9] یعنی اندھی ہوگئیں۔

وہ عورت گھبرائی ہوئی واپس گھر گئی اور اپنے خاوند کی آنکھوں کا معائنہ کرنے لگی۔ خاوند نے پوچھا تو اس نے بتایا: ''رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے تمھاری آنکھوں میں سفیدی ہے۔''

اس کے خاوند نے اپنی بیوی کے بھول پن پر مسکراتے ہوئے کہا: ''بھلی مانس! تجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں بتایا کہ اِن آنکھوں کی سفیدی ان کی سیاہی سے زیادہ ہے؟'' اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر انسان کی آنکھوں میں سیاہی اور سفیدی ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے کوئی خوش طبعی کرتا تو آپ اس کا ساتھ دیتے اور خوب ہنستے مسکراتے۔

عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کے کمرے میں آئے۔ نبی ﷺ اُن دنوں اپنی ازواج سے اس بات پر ناراض تھے کہ اُنھوں نے آپ سے نفقہ بڑھانے کا پُر اصرار مطالبہ کیا تھا۔

عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو خوش کرنے کے لیے کہا: ''اللہ کے رسول! آپ کبھی ہمارا حال بھی ملاحظہ کیجیے۔ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں پر غالب تھے۔ ہم میں سے کسی کی عورت اس سے نفقے کا مطالبہ کرتی تو وہ اٹھ کر اس کی گردن مروڑ دیتا۔ پھر جب ہم مدینہ آئے، ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی جس پر اس کی عورتوں کا غلبہ ہے۔ ہماری عورتوں نے بھی اُن کی عورتوں سے مردوں پر غالب آنے کے طریقے سیکھنا شروع کر دیے۔''

عمر کی یہ بات سُن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے، عمر رضی اللہ عنہ نے چند اور باتیں کیں تو آپ اور مسکرائے۔[10]

احادیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھلکھلا کر ہنستے اور آپ کے نواجذ (ڈاڑھیں) نظر آنے لگتے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ خوش مزاج وخوشگوار انسان اور انیسِ محفل تھے۔ لوگوں کے ساتھ اگر ہمارا رویہ بھی یہی ہو اور ہم ایسا ہی خوب صورت طرزِ عمل اپنانے کی سعی کریں تو حقیقی معنوں میں زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

نقطۂ نظر

''بچہ گیلی مٹی ہوتا ہے۔ ہم اس سے جیسا سلوک کریں گے، ویسا کردار اپنائے گا۔''

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 82، وجامع الترمذي،حدیث: 2619. 2 صحیح البخاري، حدیث: 6129.

3 زُوَیْنِب، زینب کا اسم مصغر ہے، یعنی چھوٹی سی یا پیاری سی زینب۔ عربوں کا طریقہ تھا کہ کسی کو پیار سے پکارتے تو یہی صیغہ استعمال کرتے۔ زینب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی تھی جو ان کے پہلے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پلی تھی۔ ایسی بیٹی کو عربی میں ''ربیبہ'' کہتے ہیں، چنانچہ زینب بنتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ربیبۂ رسول تھی۔

4 السیرة النبویة لابن هشام: 24/4. 5 صحیح البخاري، حدیث: 77. 6 جامع الترمذي، حدیث: 1991. 7 سنن أبي داود، حدیث: 5002، وجامع الترمذي، حدیث: 3828. 8 فیض القدیر، حدیث: 1837 إشارتًا. 9 یوسف 12:84. 10 صحیح البخاري، حدیث: 4913.

غلام اور خدّام

رسول اللہ ﷺ لوگوں کے دلوں میں اسی راستے سے جاتے جس سے گزرنا سہل اور مناسب ہوتا۔ آپ ﷺ کے چچا فوت ہوئے تو قریش کا ظلم وستم بڑھ گیا۔ آپ ثقیف سے مدد اور تحفظ حاصل کرنے کی خاطر طائف کو عازمِ سفر ہوئے۔ آپ کو امید تھی کہ اہلِ طائف دعوت اسلام قبول کر لیں گے۔ آپ ﷺ اکیلے روانہ ہوئے۔ طائف پہنچ کر آپ نے ثقیف کی تین ممتاز شخصیات سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبد یا لیل، مسعود اور حبیب تینوں بھائی عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے۔ اُن کا شمار اشرافِ ثقیف و طائف میں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ اُن کے ہاں گئے، اُنھیں اللہ کی طرف بلایا اور مدد اور حمایت کے طالب ہوئے۔ انھوں نے آپ کو خاطر خواہ جواب نہ دیا بلکہ الٹا بے عزتی کرنے لگے۔ ایک کہنے لگا: ''میں غلافِ کعبہ کو اپنا لباس بنا لوں گا اگر اللہ نے تمھیں رسول بنا کر بھیجا ہو۔'' دوسرے نے کہا: ''اللہ کو تمھارے علاوہ اور کوئی نہیں ملا جسے وہ رسول بنا کر بھیجتا؟'' تیسرے نے فلسفہ بگھارا: ''واللہ میں تم سے کلام نہیں کروں گا۔ اگر بقول تمھارے تم اللہ کے رسول ہو تو تمھاری شان اس سے کہیں بلند ہے کہ میں تمھیں جواب دوں۔ اور اگر تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میں تم سے کلام کرنا پسند نہیں کرتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اُن کا نامناسب اور غیر دانش مندانہ جواب سُنا تو جانے کے

لیے اُٹھے۔

آپ بنو ثقیف کی خیر اور بھلائی سے ناامید ہو چکے تھے لیکن آپ کو خدشہ تھا کہ قریش کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ پہلے سے زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا:

''تم لوگوں نے جو کیا سو کیا۔ اب اس بات چیت کو پوشیدہ ہی رکھنا۔''

لیکن بنو عمرو بن عمیر نے کوئی پروانہ کی اور شہر کے اوباشوں اور اپنے غلاموں کو انگیز کیا کہ اس آدمی پر سب وشتم کرو اور شہر میں ڈھنڈورا پیٹو۔

لوگ آپ کے گرداگرد اکٹھا ہو گئے۔ اُنھوں نے بہت شوروغوغا کیا اور آپ پر پتھر برسائے۔ آپ نے مجبور ہو کر عتبہ وشیبہ ابنائے ربیعہ کے باغ میں پناہ لی۔ وہ دونوں باغ میں موجود تھے۔ طائف کے اوباش واپس جا چکے تھے۔ نبی ﷺ انگور کی ایک بیل کی طرف بڑھے اور اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ابنائے ربیعہ نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو اُن کے اندر کی قبائلی حمیت جاگ اٹھی۔ رسول اللہ ﷺ اُن کے قرابت دار بھی تھے۔ انھوں نے عداس نامی اپنے ایک نصرانی غلام کو بلایا اور اس سے کہا کہ انگور کے چند گچھے اس پلیٹ میں رکھ کر اس آدمی کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ کھا لے۔ عداس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ انگور لایا، رسول اللہ ﷺ کو پیش کیے اور بولا: ''کھائیے۔'' آپ نے بسم اللہ کہہ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عداس نے حیرت سے آپ کی طرف دیکھا اور کہا:

''واللہ اس علاقے کے لوگ تو یہ کلمات نہیں کہتے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا:

''عداس! تم کس علاقے سے ہو اور تمھارا دین کیا ہے؟''

''نصرانی ہوں اور نینوی سے آیا ہوں۔'' عداس نے جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ بولے:

''مردِ صالح یونس بن متیٰ کی بستی سے؟''

''آپ کو کیا معلوم کہ یونس بن متیٰ کون ہیں؟'' عداس کی حیرانی بڑھتی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے بتایا:

''وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔''[1]

اس پر عداس نے جھک کر رسول اللہ ﷺ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔ ابنائے ربیعہ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''لو تمھارا غلام تو کام سے گیا۔''

عداس واپس آیا۔ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر کے اور آپ کا کلام سُن کر شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

اس کے آقا نے کہا: ''تیرا ستیاناس! تو اس آدمی کے ہاتھ پاؤں کیوں چوم رہا تھا؟''

عداس نے سرشاری سے جواب دیا: ''آقا! روئے زمین پر کوئی آدمی اس سے بہتر نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جس کا نبی کے سوا کسی کو علم نہیں ہوتا۔''

آقا نے تنبیہ کی: ''دیکھنا عداس! کہیں وہ آدمی تمھیں تمھارے دین سے نہ پھیر دے۔ تمھارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔''

تو کیا آج ہم تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد کے ساتھ یکساں طرزِ عمل اختیار کر سکتے ہیں؟!

ایک نظر اِدھر بھی

''انسانوں سے اچھا سلوک ان کے انسان ہونے کے ناتے کیجیے، نہ کہ اُن کی صورتوں، ان کے مال و متاع یا اُن کے مناصب کی بنیاد پر۔''

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 421/2.

مخالفین کے ساتھ

مخالفین سے رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ آپ کو اُن کی دعوت و اصلاح کے راستے میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی۔ آپ ان کی ایذا رسانی کو برداشت کرتے اور ان کے منفی رویے کو نظر انداز کرتے رہے۔

ایسا بھلا کیوں نہ ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا کہ ہم نے تجھے محض رحم کرتے ہوئے رسول بنا کر بھیجا۔

کس پر رحم کرتے ہوئے؟ ایمان والوں پر؟ نہیں! فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○﴾

''ہم نے تجھے سب جہانوں پر محض رحم کرتے ہوئے رسول بنا کر بھیجا۔''[1]

یہود کی حالت پر غور کیجیے۔ وہ اللہ کے رسول کی مذمت کرتے اور بلا جواز دشمنی روا رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ اُن پر شفقت کرتے اور اُن کے معاملے میں نرمی اختیار کرتے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں: ''ایک بار یہود نبی ﷺ کے گھر کے قریب سے گزرے، انھوں نے کہا: «السام علیکم» (السلام علیکم کے بجائے، مطلب یہ کہ تمھیں موت آئے۔)

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: «وعلیکم» ''اور تمھیں بھی۔''

اللہ کے رسول تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے لیکن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ دیا:

''السام علیکم اور اللہ تم پر لعنت کرے اور اپنا غضب نازل کرے۔''

اس پر اللہ کے رسول نے فرمایا:

''ٹھہرو عائشہ! نرمی اپناؤ۔ درشتی اور بدگوئی سے بچو۔''

میں نے کہا: ''آپ نے سنا نہیں انھوں نے کیا کہا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ بولے:

''تم نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟! میں نے ان کا جواب دے دیا۔ میری بددعا قبول کی جاتی ہے جبکہ اُن کی مجھ پر بددعا قبول نہیں کی جاتی۔'' [2]

جی ہاں! گالی کا جواب گالی میں دینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔'' [3]

ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ہمراہ کسی غزوے کے لیے روانہ ہوئے۔ واپسی پر مسلمانوں نے راستے میں ایک مقام پر پڑاؤ کیا جہاں اشجار کی بہتات تھی۔ صحابۂ کرام بکھر گئے اور درختوں کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ اللہ کے رسول بھی ایک درخت کی طرف بڑھے، اپنی تلوار اس کی ٹہنی سے لٹکائی، چادر بچھائی اور سو گئے۔ اسی اثنا میں ایک مشرک اُدھر آ دھمکا۔ اس نے آپ کو تنہا دیکھا تو دبے پاؤں آیا اور درخت کی شاخ سے تلوار اتار لی، پھر گرج کر کہا: ''محمد! تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟''

رسول اللہ ﷺ جاگ اٹھے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ ایک آدمی ہاتھ میں تلوار لیے سر پر کھڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ تن تنہا ہیں۔ تہبند کے سوا آپ کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔ صحابۂ کرام دور سایوں تلے سو رہے ہیں۔ جان کا دشمن ممکنہ فتح اور قوت کے نشے میں سرشار ہے۔

اس نے دوبارہ کہا: ''تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟''

رسول اللہ ﷺ نے نہایت اطمینان اور بھرپور اعتماد سے جواب دیا:

''اللہ۔''

یہ سننا تھا کہ اس آدمی پر کپکپی طاری ہوگئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے، تلوار اٹھائی اور فرمایا:

''اب تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟''

آدمی کا رنگ فق ہوگیا۔ اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے اللہ کے نبی سے رحم کی اپیل کرتے ہوئے فریاد کی: ''کوئی نہیں۔ مجھے آپ سے صرف بھلائی کی امید ہے۔''

آپ نے پوچھا:

''اسلام لاتے ہو؟''

اس نے کہا: ''نہیں لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس قوم کا ساتھ نہیں دوں گا جو آپ سے جنگ کرے گی۔''

رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور اس سے اچھا سلوک کیا۔

یہ آدمی اپنی قوم کا سردار تھا۔ واپس اپنی آبادی میں گیا اور قوم کے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ وہ سب مسلمان ہوگئے۔[4]

جی ہاں! لوگوں سے اچھا برتاؤ کیجیے، آپ ان کے دلوں کو اپنا غلام بنا لیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا تو اپنے سخت ترین اعداء کے ساتھ رویہ بھی اخلاقِ عالیہ کی عمدہ مثال تھا۔ آپ کا یہی طریق کار اُن کی تسخیر اور اُن کے دلوں کی ہدایت کا باعث بنا۔

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے درمیان علانیہ دعوت کا آغاز کیا تو قریش نے دعوت کو دبانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ ان کی اسلام مخالف تگ و دو کے سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ قریش نے قبیلے کے اکابر اور نمایاں افراد سے مشاورت کی کہ محمد (ﷺ) کی دعوت کے متعلق کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور لوگوں کو جو دھڑا دھڑ اس کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، قبولِ اسلام سے باز رکھنے کے لیے کیا لائحہ عمل طے کیا جائے۔

شیوخِ قریش نے مشورہ دیا کہ تم میں سے جو شخص جادو، کہانت اور اشعار کا گہرا علم رکھتا ہو وہ اس آدمی کے ہاں جائے جس نے ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے، ہمارے حصے بخرے کر دیے ہیں اور ہمارے دین پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس سے بات چیت کرے اور دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

لوگوں نے کہا: ''عتبہ بن ربیعہ کے علاوہ تو کوئی مناسب آدمی ہمیں نظر نہیں آتا جو اس کام کو بطریقِ احسن انجام دے سکے۔''

انھوں نے عتبہ بن ربیعہ سے کہا: ''ابوالولید! اس کام کی ذمہ داری تم ہی اٹھاؤ۔'' عتبہ دور اندیش اور متحمل مزاج سردار تھا۔

اس نے کہا: ''اے معشرِ قریش! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس کے پاس جاؤں، اس سے بات چیت کروں اور اسے چند باتوں کی پیش کش کروں، شاید وہ ان میں سے کوئی بات قبول کر لے؟''

لوگوں نے جواب دیا: ''جی ہاں ابوالولید!''

اس پر عتبہ اُٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ آپ گھر ہی پہ تھے۔ عتبہ

آیا اور کھڑے پاؤں سوال داغ دیا: ''محمد! تم بہتر ہو یا عبداللہ؟''

رسول اللہ ﷺ اپنے والد عبداللہ کے احترام میں خاموش رہے۔

عتبہ نے دوسرا سوال کیا: ''تم بہتر ہو یا عبدالمطلب؟''

رسول اللہ ﷺ اس بار بھی اپنے دادا عبدالمطلب کے احترام میں چپ رہے۔

عتبہ کہنے لگا: ''اگر تم کہتے ہو کہ یہ حضرات تم سے بہتر ہیں تو انھوں نے انھی خداؤں کی پرستش کی جنھیں تم برا کہتے ہو۔ اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم اُن سے بہتر ہو تو بات کرو، ہم تمھاری بات سنتے ہیں۔''

اور قبل اس سے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی جواب دیں، عتبہ اُبل پڑا اور بولا:

''واللہ! ہم نے واقعی اپنی قوم کے لیے تم سے بڑھ کر منحوس آدمی نہیں دیکھا۔ تم نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہماری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، ہمارے دین میں کیڑے نکالے ہیں اور ہمیں عرب میں رسوا کر کے رکھ دیا ہے اور یہ باتیں زبان زدِ عام ہیں کہ قریش میں ایک جادوگر اور ایک کاہن موجود ہے۔ واللہ! ہم حاملہ عورت کی پکار جیسی کسی پکار کے منتظر ہیں کہ وہ بلند ہو اور ہم تلواریں لے کر ایک دوسرے پر پل پڑیں اور فنا ہو جائیں۔''

مارے غصے کے عتبہ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ باادب بیٹھے خاموشی سے سُن رہے تھے۔ عتبہ کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو وہ اپنے اصل مدعا کی طرف آیا اور بولا:

''دیکھو بھئی! تم جو دعوت دیتے ہو اگر اس سے تمھارا مقصد مال کمانا ہے تو ہم تمھیں اتنا مال دیں گے کہ تم قریش کے امیر ترین آدمی بن جاؤ گے۔''

''اگر تمھیں سرداری سے پیار ہے تو ہم تمھارے نام کے جھنڈے باندھ دیتے ہیں اور تم ساری عمر ہمارے سردار رہو گے۔''

''اور اگر تمھیں عورتوں کی چاہت ہے تو قریش کی جن دس عورتوں سے تم کہو ہم تمھاری شادی کر دیتے ہیں۔''

''یا جو تمھارے پاس آتا ہے وہ کوئی جن ہے جسے تم دیکھتے ہو لیکن دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو ہمیں بتاؤ، ہم منہ مانگی قیمت ادا کر کے تمھارا علاج کراتے ہیں تاکہ تمھارا اس سے پیچھا چھوٹ جائے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں، جن آدمی پر غالب آسکتا ہے۔ دوا کی جائے تو یہ کیفیت جاتی رہتی ہے۔''

عتبہ رسول اللہ ﷺ سے اسی بھونڈے طریقے سے گفتگو کرتا اور آپ کو قسم قسم کے لالچ دیتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ اطمینان سے اس کی بکواس سنتے رہے۔ پیش کشیں اپنے اختتام کو پہنچیں، بادشاہت، مال، عورتیں اور جنون کا علاج۔

عتبہ خاموش ہوا اور نبی ﷺ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ صبر و ثبات کے پیکر نے نگاہ اٹھائی اور نرمی سے کہا:

''ابو الولید! آپ کی بات پوری ہو گئی؟''

عتبہ کو صادق و امین ﷺ کے اس باوقار انداز پر حیرانی نہیں ہوئی۔ اس نے مختصر جواب دیا: ''ہاں۔''

آپ نے کہا:

''پھر میری بات سماعت کیجیے۔''

عتبہ بولا: ''ٹھیک ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے حم السجدہ کی تلاوت شروع کی۔ عتبہ سنتا رہا۔ یکایک وہ زمین پر بیٹھ گیا، پھر اس کا جسم کپکپایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پچھلی جانب رکھے اور اُن پر ٹیک لگا لی۔ رسول اللہ ﷺ پڑھتے رہے اور وہ سنتا رہا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ۝﴾

''پھر اگر انھوں نے منہ موڑا تو کہہ دے کہ میں نے تمھیں عاد وثمود کی کڑک جیسی کڑک سے خبردار کر دیا ہے۔''[1]

تو عتبہ عذاب کی دھمکی سن کر کانپ اُٹھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے منہ پر رکھ دیا تاکہ آپ مزید قراءت نہ کریں۔

لیکن رسول اللہ ﷺ نہیں رُکے اور تلاوت کرتے رہے، سجدۂ تلاوت والی آیت پر پہنچے تو سجدہ کیا، پھر سجدے سے سر اٹھایا اور عتبہ کی طرف دیکھ کر کہا:

''ابوالولید! آپ نے سن لیا؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔''[2]

عتبہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا جو بڑی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ انھوں نے عتبہ کا اترا ہوا منہ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! ابوالولید تمھارے پاس وہ چہرہ لے کر نہیں آیا جس کے ساتھ گیا تھا۔''

عتبہ ان کے درمیان بیٹھا تو انھوں نے پوچھا: ''ابوالولید کیا خبر ہے؟''

وہ بولا: ''خبر یہ ہے کہ اللہ کی قسم! میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا کلام زندگی بھر نہیں سنا۔ واللہ! نہ وہ شعر ہے، نہ جادو اور نہ کہانت۔''

''قریش کے لوگو! میری بات مانو اور چاہو تو اس کا ذمہ بھی مجھی پر ڈال دو۔ اس آدمی کو اپنا کام کرنے دو۔ اللہ کی قسم! جو کلام میں سن کر آ رہا ہوں اس سے کوئی زبردست واقعہ رونما ہو کر رہے گا۔ میں نے اسے وہ کلام پڑھتے سنا تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے

روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے قرابت داری کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ رُک جائے۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ محمد جب کوئی بات کہہ دے تو پوری کر کے چھوڑتا ہے۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں تم پر عذاب نہ آجائے۔''

پھر ابوالولید کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ قوم کے لوگ مارے غم کے خاموش تھے اور عتبہ کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

عتبہ نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو کہا: ''واللہ اس کے کلام میں ایک عجیب مٹھاس ہے۔ اس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا ہے۔ اس کا اوپری حصہ پھل دار اور نیچے کا حصہ سرسبز و شاداب ہے۔ وہ غالب آتا ہے اور اس پر غلبہ پانا ممکن نہیں۔ جو اس کے زیرِ نگیں آئے اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ یہ کلام کسی بشر کا نہیں۔ یہ باتیں کسی بشر نے نہیں کہیں۔''

لوگوں نے عتبہ کو اکھڑتے دیکھا تو کہا: ''یہ شعر ہے ابوالولید! شعر ہے۔''

عتبہ نے پُر جوش انداز میں جواب دیا: ''واللہ! کوئی آدمی اشعار اور رجز و قصیدہ جیسی اصنافِ سخن کو مجھ سے بہتر نہیں جانتا۔ جنّوں کی شاعری بھی میں نے سنی ہے۔ واللہ! جو کچھ وہ کہتا ہے ان میں سے کسی کے مماثل نہیں۔''

یوں عتبہ رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں اپنی قوم سے مناقشہ کرتا رہا۔ یہ درست ہے کہ عتبہ اسلام نہیں لایا تھا، تاہم دین کے لیے اس کا دل نرم پڑ گیا تھا۔

غور کیجیے رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ کردار نے کیسا اثر دکھایا۔ آپ نے اپنے سخت ترین دشمن عتبہ کے سامنے بھی حسنِ سماعت کے اصول سے انحراف نہیں کیا۔

اس کے بعد قریش کے لوگ ایک روز پھر جمع ہوئے۔ اس بار انھوں نے حصین بن منذر خزاعی کو جو جلیل القدر صحابی عمران بن حصین کے والد تھے، نبی ﷺ سے مناظرے کے

لیے تیار کیا۔ ابوعمران نبی ﷺ کی طرف آیا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرام اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ ابوعمران نے آتے ہی قریش کی روایتی زبان میں وہی گھسے پٹے الفاظ دہرائے کہ تم نے ہمارا شیرازہ بکھیر دیا اور ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ نبی ﷺ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے اپنی بات ختم کی تو نبی ﷺ نہایت مؤدب لہجے میں گویا ہوئے:

''ابوعمران! آپ اپنی بات کر چکے؟''

اُس نے جواباً کہا: ''ہاں۔''

آپ نے فرمایا:

''تب میں آپ سے چند ایک سوال پوچھتا ہوں، آپ اُن کا جواب دے دیجیے۔''

اس نے کہا: ''ہاں! پوچھو، میں سن رہا ہوں۔''

آپ نے پہلا سوال کیا:

''ابوعمران! آج کل آپ کتنے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں؟''

وہ بولا: ''سات خداؤں کی، چھ زمین میں ہیں اور ایک آسمان میں۔''

''آپ ان میں سے کس خدا سے مرادیں مانگتے اور ڈرتے ہیں؟''

''اس خدا سے جو آسمان میں ہے۔''

''حصین! اگر آپ اسلام لے آئیں تو میں آپ کو دو ایسے کلمے سکھاؤں گا جو آپ کو فائدہ دیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ نے نرمی سے کہا۔

حصین فوراً مسلمان ہوگئے اور پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے وہ دو کلمے سکھا دیجیے جن کا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قُلْ: اللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِي رُشْدِي وَ أَعِذْنِي مِنْ شَرِّ نَفْسِي»

''آپ کہا کیجیے: اے اللہ! میرے دل میں رشدو ہدایت ڈال دے اور مجھے میرے نفس کے شر سے بچا۔''

سبحان اللہ! یہ کیسا عمدہ طرزِ عمل تھا اور لوگوں کے دلوں پر اس کی کیسی عجیب تاثیر تھی۔ یہی اسلام کا دعوتی انداز ہے جو کافروں کو اسلام کی طرف لانے اور بھلائی کی جانب ان کے انجذاب کا باعث بنتا ہے۔

ایک صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے۔ وہاں انھوں نے ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کی۔ اُن کے سامنے والے فلیٹ میں ایک جرمن سکونت پذیر تھا۔ دونوں کی آپس میں کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی۔ جرمن کو اچانک کسی سفر پر جانا پڑ گیا۔ اخبار فروش روزانہ کا اخبار اس کے دروازے پر رکھ جاتا۔ اُن صاحب نے جرمن کے دروازے پر اخباروں کا ڈھیر لگا دیکھا تو دوسرے پڑوسی سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ سفر پر گیا ہے۔ انھوں نے اخبارات کو لپیٹا اور الماری میں رکھ دیا۔ وہ اخبارات جمع کر کے انھیں ترتیب سے سنبھالتے رہے۔ دو یا تین ماہ بعد وہ جرمن لوٹا تو وہ اس کے ہاں گئے۔ سفر سے بخیریت واپسی پر مبارکباد دی اور جمع شدہ اخبار اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''میں نے سوچا شاید آپ کو کسی خاص کالم کا انتظار ہو یا آپ نے کسی کوئز میں حصہ لیا ہو، اس لیے آپ کے روز آنے والے اخبارات جمع کرتا رہا۔'' جرمن نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''کیا آپ کو اس خدمت پر کسی معاوضے کی امید تھی؟''

اُن صاحب نے جواب دیا: ''نہیں! ہمارا دین ہمیں پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آپ میرے پڑوسی ہیں، اس لیے آپ سے اچھا سلوک کرنا اور آپ کی

ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔"

اُن صاحب کا اپنے جرمن پڑوسی سے یہی برتاؤ رہا اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ جرمن مسلمان ہو گیا۔

واللہ! زندگی کا اصل لطف یہی ہے کہ اخلاقِ عالیہ کو عبادت جان کر اپنایا جائے۔

ایسے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں کہ بہت سے غیر مسلم مسلمانوں کے منفی طرزِ عمل کو دیکھ کر اسلام نہ لائے۔

روشنی کی کرن

"بہترین داعی وہ ہے جو زبان سے پہلے، اپنے کردار سے دعوت دیتا ہے۔"

1 الأنبياء 107:21. 2 صحيح البخاري، حديث: 6401. 3 البقرة 83:2. 4 صحيح مسلم، حديث: 843، ومسندِ أحمد: 365,364/3. 5 حٰمٓ السجدة 13:41. 6 السيرة النبوية لابن هشام: 294,293/1. 7 جامع الترمذي، حديث: 3483. یہ حدیث ضعیف ہے۔

حیوانات سے حسنِ سلوک

حسن اخلاق جس انسان کی سرشت میں شامل ہو کر اس کے جسم و روح کا جزوِ لاینفک بن جائے وہ ہمیشہ سہل خُو، رقیق القلب، نرم پہلو اور متحمل مزاج رہتا ہے اور آدمی تو آدمی حیوانات و جمادات کے ساتھ بھی اس کا رویہ مشفقانہ اور حسنِ سلوک پر مبنی ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ مسلمانوں نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے۔ چند صحابہ ایک جُھنڈی میں داخل ہوئے۔ انھیں ایک چڑیا نظر آئی جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ اُنھوں نے وہ دونوں بچے اٹھالیے۔ چڑیا اُن کے سروں پر اُڑنے اور پھڑ پھڑانے لگی۔ نبی ﷺ تشریف لائے اور آپ نے یہ منظر دیکھا تو دریافت کیا:

''اسے اس کے بچوں کی وجہ کس نے تکلیف پہنچائی ہے؟ اس کے بچے اسے واپس کر دیجیے۔''

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے چیونٹیوں کا جلا ہوا بل دیکھا تو پوچھا:

''اسے کس نے آگ لگائی ہے؟''

ایک صحابی بولے: ''میں نے۔''

''آگ کے رب کے علاوہ کوئی آگ کا عذاب دے، یہ مناسب نہیں۔''[1]

آپ نے ناراض ہوکر فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی نرم خوئی ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ وضو کرتے اور کوئی بلی آجاتی تو آپ برتن اس کے آگے کردیتے، وہ سیر ہوکر پیتی اور آپ اُس کے جھوٹے پانی سے وضو کرتے۔[2]

ایک روز رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس نے ایک بکری کو زمین پر لٹا کر اوپر پاؤں رکھا ہوا تھا اور اسی حالت میں چُھری تیز کر رہا تھا۔ بکری کی نظر چھری پر تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو سخت غصے میں فرمایا:

''آپ اسے کتنی بار مارنا چاہتے ہیں؟ اسے لٹانے سے پہلے چھری تیز کیوں نہیں کر لی؟''[3]

ایک روز رسول اللہ ﷺ دو آدمیوں کے پاس سے گزرے جو اپنے اپنے اونٹوں پر سوار گپ شپ میں مصروف تھے۔ آپ کو اونٹوں پر رحم آیا۔ آپ نے سواریوں کو کرسیاں بنا کر بیٹھ رہنے سے روک دیا،[4] یعنی بوقت ضرورت جانوروں پر سواری کی جائے۔ سفر تمام ہو تو اُنھیں ستانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

آپ نے سواری کے منہ پر نشان لگانے سے بھی منع کیا ہے۔

نبی ﷺ کے پاس ایک اونٹنی تھی۔ اس کا نام عضباء تھا۔ مشرکین نے مدینہ کے نواح میں چرتے مسلمانوں کے چند اونٹوں پر حملہ بول دیا اور انھیں ہانک کر لے گئے۔ عضباء بھی انھی میں تھی۔ انھوں نے ایک مسلمان عورت کو بھی گرفتار کیا اور ساتھ لے گئے۔ راستے میں جہاں کہیں وہ پڑاؤ کرتے اونٹوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ ایک منزل پر انھوں نے پڑاؤ کیا۔ رات کو سب سو گئے تو عورت نے بھاگنے کی کوشش کی۔ سواری کے لیے اسے کسی جانور کی ضرورت تھی۔ وہ اونٹوں کی طرف آئی۔ جس اونٹ پر بیٹھنے کی کوشش

کرتی وہ چلا اٹھتا۔ وہ اس ڈر سے ایک ایک کر کے سب اونٹوں کو چھوڑتی گئی کہ قافلے والے جاگ جائیں گے۔ وہ عضباء کے پاس پہنچی، اسے ہلایا تو وہ ایک مطیع وفرماں بردار اور تربیت یافتہ اونٹنی نکلی۔ عورت اونٹنی پر سوار ہو گئی اور اس کا رُخ مدینے کی جانب پھیر دیا۔ عضباء تیزی سے سفر طے کرنے لگی۔ عورت کو جب یقین ہوا کہ وہ دشمنوں کے نرغے سے نکل آئی ہے تو اس نے خوش ہو کر کہا:

''اے اللہ! میں تیرے لیے نذر مانتی ہوں کہ تو نے اس اونٹنی پر سوار مجھے دشمن کے گھیرے سے نکال دیا تو میں اس اونٹنی کو نحر کر دوں گی۔''

عورت نجات پا کر مدینہ جا پہنچی۔ لوگوں نے نبی ﷺ کی اونٹنی پہچان لی۔ عورت اپنے گھر پر اتر گئی۔ لوگوں نے عضباء کو نبی ﷺ کے گھر پہنچا دیا۔ وہ عورت گھر سے باہر آئی تو اونٹنی دروازے پر نہیں تھی۔ وہ اس کی تلاش میں نکلی تا کہ اسے ذبح کر کے اپنی نذر پوری کر سکے۔ ڈھونڈتی ڈھونڈتی نبی ﷺ کے گھر پہنچ گئی اور آپ کو اپنی نذر سے آگاہ کیا۔

آپ نے فرمایا:

''اللہ نے تمھیں اس اونٹنی پر نجات دی اور تم نے اس کی وفا کا یہ صلہ دیا کہ اسی کو ذبح کرنے کی نذر مان لی۔ اللہ کی نافرمانی میں مانی ہوئی نذر اور اس شے کی نذر کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی جو انسان کی ملکیت نہ ہو اور ایسی نذر پوری کرنا بیکار ہے۔''[5]

اس لیے ہمیں چاہیے کہ نرمی، خوش خلقی اور جود وسخا جیسی اعلیٰ انسانی صفات اپنی زندگی کا لازمہ اور اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں۔ اور دیگر مخلوقات تو رہیں ایک طرف! جمادات و اشجار جیسی اشیاء سے بھی نرمی کا برتاؤ کریں۔

رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگایا کرتے

تھے۔ انصار کی ایک عورت نے پیش کش کی: ”اے اللہ کے رسول! میں آپ کے بیٹھنے کے لیے کوئی چیز نہ بنوا دوں؟ میرے پاس ایک بڑھئی غلام ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

”اگر آپ چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔“

اس نے ایک منبر بنوا دیا۔ جمعے کا دن آیا۔ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو کھجور کا تنا بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔ اس کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ نبی ﷺ منبر سے اترے، اس سے لپٹ گئے اور اسے چمکارا۔ کھجور کا تنا اس بچے کی طرح بلکنے لگا جسے تھپکی دے کر چپ کرایا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر میں اس سے نہ لپٹتا تو یہ قیامت تک اسی طرح روتا رہتا۔“[6]

اشارہ

”اللہ تعالیٰ نے انسان کو شرف بخشا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دوسری مخلوقات پر ظلم ڈھائے۔“

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 5268. [2] سنن أبي داود، حديث: 76. یہ واقعہ ابو قتادہ سے مروی ہے اور رسول اللہ ﷺ سے صرف اتنا ثابت ہے کہ آپ بلی کے جھوٹے پانی سے وضو کر لیتے تھے۔ [3] المستدرك للحاكم: 232/4، و صحيح الترغيب والترهيب للألباني: 55/2. [4] صحيح ابن خزيمة: 142/4، ومصنف ابن أبي شيبة: 267/5. [5] صحيح مسلم، حديث: 1641. [6] سنن الدارمي، حديث: 42.

اللہ کی رضا کے لیے نیت درست کیجیے

میں بعض افراد کی صحبت میں کئی سال رہا اور ان کے طرزِ عمل اور طریقۂ تعامل پر غور کرتا رہا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے انھیں کبھی رسمی طور پر بھی مسکراتے یا ہنستے ہوئے دیکھا ہو۔ میں سمجھا کہ یہ شاید ان کی فطرت کا حصہ ہے جسے تبدیل کرنے کی وہ سکت نہیں رکھتے۔ لیکن میں نے ان افراد کو چند مخصوص مواقع پر بعض انتہائی خاص لوگوں سے، بالخصوص دولت مند افراد اور اصحاب بست و کشاد سے، ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ان کے سامنے لطافتیں بکھیرتے دیکھا۔ تب جا کر مجھے ادراک ہوا کہ وہ یہ طرزِ عمل خاص مصلحتوں کے پیشِ نظر اختیار کرتے ہیں۔ یوں وہ اللہ کے ہاں بڑے ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ایک ایماندار انسان صرف اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر سب لوگوں سے یکساں حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے۔ اس کا یہ کریکٹر نہ کسی دنیاوی منفعت کے لیے ہوتا ہے اور نہ کسی وقتی مادی فائدے کی خاطر۔ وہ جیسا برتاؤ ایک مالدار شخص سے کرتا ہے ویسا برتاؤ نادار شخص سے کرتا ہے۔ سڑک پر جھاڑو لگانے والے خاکروب کے لیے بھی وہ احترام کے وہی جذبات رکھتا ہے جو کسی اونچے ادارے کے ڈائریکٹر کے لیے رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ اسلام نے انسان ہونے

کے ناتے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ دیگر مذاہب و ادیان پر اسلام کی برتری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَ أَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا»

''روزِ قیامت میرے محبوب ترین اور نزدیک ترین لوگوں میں تمھارے وہ افراد بھی شامل ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں۔''[1]

قبیلۂ عبدالقیس کے زخم خوردہ آدمی (اشج) سے آپ نے کہا تھا:

''آپ میں دو خصلتیں ایسی ہیں جنھیں اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں۔''

وہ دو خصلتیں کیا تھیں؟ رات کا قیام یا دن کے روزے؟ نہیں!

اس نے خوش ہو کر پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! وہ کون سی خصلتیں ہیں؟''

فرمایا:

''تحمل اور ٹھہراؤ۔''[2]

رسول اللہ ﷺ سے نیکی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا:

«اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ»

''نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے۔''[3]

آپ سے استفسار کیا گیا کہ اکثر لوگ کس چیز کے سبب جنت میں جائیں گے؟

آپ نے جواب دیا:

«تَقْوَى اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ»

''اللہ کا تقویٰ اور حسنِ اخلاق۔''[4]

آپ نے فرمایا:

«أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحَاسِنُهُمْ أَخْلَاقًا الْمُوَطَّؤُونَ أَكْنَافًا الَّذِينَ يَأْلَفُونَ وَ يُؤْلَفُونَ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يَأْلَفُ وَلَا يُولَفُ»

''مومنین میں سے کامل ایمان والے لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں، جو نرم پہلو ہیں، جو (دوسروں کو) مانوس بناتے اور (خود اُن کے) مانوس بنتے ہیں۔ اور اس آدمی میں کوئی خیر نہیں جو نہ مانوس بنائے اور نہ مانوس بنے۔''[5]

آپ نے فرمایا:

«مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلَ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ»

''میزان میں کوئی شے حسنِ اخلاق سے بڑھ کر وزنی نہیں ہے۔''[6]

آپ نے فرمایا:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَبْلُغُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَ صَائِمِ النَّهَارِ»

''آدمی اپنے حسنِ اخلاق کی بدولت رات کو ہمیشہ نماز پڑھنے والے اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔''[7]

ایک روز ام سلمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھی آخرت اور اس میں اللہ کی تیار کردہ نعمتوں کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ ام المومنین نے استفسار کیا: ''اے اللہ کے رسول! ایک عورت کے دنیا میں دو شوہر ہوں۔ عورت اور وہ دونوں جنت میں چلے جائیں تو وہ عورت ان دونوں میں سے کسے ملے گی؟''

فرمایا:

''وہ اس شوہر کو ملے گی جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہوگا۔''

اس پر ام سلمہ کو تعجب ہوا۔ آپ نے ان کی حیرت دیکھی تو فرمایا:

''ام سلمہ! دنیا و آخرت کی بھلائیاں حسنِ اخلاق کو حاصل ہیں۔''[8]

جی ہاں! دنیا و آخرت کی بھلائیاں!

دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ آدمی کے حسنِ اخلاق کی بدولت سب لوگ اس سے محبت کرنے لگیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد اجر عظیم ہے۔ انسان کیسا ہی اعمالِ صالحہ پر کاربند ہو، بد اخلاق ہو تو سارے عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔

نبی ﷺ کے سامنے ایک عورت کا ذکر کیا گیا کہ وہ نمازیں پڑھتی، روزے رکھتی، صدقہ خیرات کرتی اور نیکی کے دیگر کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ لیکن وہ بداخلاق ہے اور اپنے پڑوسی سے زبان درازی کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''وہ آگ میں ہے۔''[9]

حسن اخلاق میں نبی ﷺ کی ذات ہمارے لیے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ آپ سب سے بڑھ کر عزت دار، شجاع اور متحمل مزاج تھے۔ آپ باپردہ کنواری عورت سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ آپ صادق و امین تھے۔ ان اوصاف کی شہادت مومنوں سے پہلے کافروں نے اور صلحاء سے قبل فاسقوں نے دی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جبکہ پہلی بار وحی نازل ہوئی اور انھوں نے آپ کی بدلتی حالت کو دیکھا تو دلاسا دیتے ہوئے کہا:

''واللہ! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ (کیوں؟؟) آپ رشتے داری جوڑتے ہیں، ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، نادار کو کما کر دیتے ہیں، مہمان کی مہمانی کرتے ہیں، مصائبِ زمانہ پر (لوگوں کی) امداد کرتے ہیں، سچ بولتے اور امانت ادا کرتے ہیں۔''[10]

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف کی جسے قیامت تک تلاوت کیا جاتا رہے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾

''اور بلاشبہ تو واقعتاً خلقِ عظیم پر (فائز) ہے۔''[11]

قرآن آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔ جی ہاں قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔ جب آپ ﷺ نے یہ سنا:

﴿وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

''اور اچھائی کرو، بلاشبہ اللہ اچھائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[12]

آپ نے چھوٹے بڑے، امیر فقیر، عوام و خواص سب سے اچھائی کی۔ جب آپ نے اللہ کا یہ ارشاد سماعت کیا:

﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا﴾

''پس معاف کردو اور درگزر کرو۔''[13]

آپ نے معاف کیا اور درگزر سے کام لیا۔ جب آپ کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''[14]

آپ نے اپنی گفتگو میں بہترین الفاظ استعمال کیے۔

رسول اللہ ﷺ ہمارا قدوہ ہیں۔ آپ کا راستہ ہی ہمارا راستہ ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی ساری زندگی لوگوں کی بھلائی اور اصلاح کرتے ہوئے گزار دی۔

آپ نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان تھک محنت کی، نہ دن دیکھا، نہ رات کی پروا کی۔ ظلم و ستم برداشت کیا، ہر قسم کی راحت و آسایش تج دی۔ آپ کسل مندی، سستی اور مایوسی کے الفاظ سے ناواقف تھے۔ تمام عمر اسی جدوجہد میں بتا دی، یہاں تک کہ ہڈیوں پر بڑھاپا طاری ہوگیا۔

امّ المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بوڑھے محمد ﷺ کی جسمانی حالت بیان کرتی ہیں:

"کبرسنی کے بعد نبی ﷺ اکثر اوقات بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔"[15]

وَإِذَا كَانَتِ النُّفُوسُ كِبَارًا　　تَعِبَتْ فِي مُرَادِهَا الْأَجْسَامُ

"روح بلند ہو تو اس کی بلندی کو پانے کے لیے جسم کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔"

حسنِ اخلاق اپنا کر اس پر کار بند رہنے کے شوق کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ ﷺ عموماً اللہ سے دعا کیا کرتے:

«اللّٰهُمَّ كَمَا أَحْسَنْتَ خَلْقِي فَأَحْسِنْ خُلُقِي»

"الٰہی! جیسے تو نے میری صورت اچھی بنائی، سیرت بھی اچھی کر دے۔"[16]

آپ یہ دعا بھی کیا کرتے تھے:

«اللّٰهُمَّ اهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ»

"الٰہی! مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت دے، اس کی رہنمائی تو ہی کر سکتا ہے۔ اور مجھ سے بد اخلاقی کو دور کر دے، اسے بھی مجھ سے تُو ہی دور کر سکتا ہے۔"[17]

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دعوتِ اسلام کی راہ میں رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کی پیروی کریں تا کہ اسلام سے ناواقف افراد اس کی حقیقت جان کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

اشارہ

’’نیت درست کیجیے تا کہ لوگوں کے ساتھ آپ کا اچھا برتاؤ عبادت کا درجہ حاصل کرے۔‘‘

(1) جامع الترمذي،حديث: 2018. (2) صحيح مسلم، حديث: 18. (3) صحيح مسلم، حديث: 2553، وجامع الترمذي، حديث: 2389. (4) جامع الترمذي، حديث: 2004. (5) السلسلة الصحيحة : 378/2، حديث : 751، وجامع الترمذي، حديث: 1162. (6) سنن أبي داود، حديث:4799. (7) سنن أبي داود،حديث:4798، وجامع الترمذي، حديث:2003 والموطأ: 363/2، حديث: 1721. (8) مجمع الزوائد: 419/10، حديث: 18755. (9) مسند أحمد: 440/2. (10) صحيح البخاري، حديث: 3. (11) القلم68:4. (12) البقرة2:195. (13) البقرة2:109. (14) البقرة 2:83. (15) صحيح مسلم، حديث: 731. (16) مسند أحمد: 403/1، 155,68/6. (17) صحيح مسلم،حديث:771.

ہر فرد کے لیے مناسب رویہ اختیار کیجیے

فطری طور پر لوگ بعض اشیاء کو پسند یا ناپسند کرنے میں یکساں ہوتے ہیں۔ اور یہ امر بھی انسانی طبائع کا لازمہ ہے کہ بعض لوگ اگر کسی شے کو پسند کرتے اور اس کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں تو بعض دیگر افراد اسی شے کو ناپسند کرتے اور اس کے وجود کو گراں سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تقریباً سبھی لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ اُن سے ملنے والا انھیں خوش روئی اور خندہ پیشانی سے ملے۔ تیوری چڑھے، غصے میں تلملاتے اور اُداس چہروں کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب بعض افراد ہنسی مذاق اور کھیل کھلواڑ پسند کرتے ہیں اور بعض طنز و مزاح سے زچ ہوتے ہیں۔ ایک آدمی چاہتا ہے کہ لوگ کثیر تعداد میں اس سے ملنے آئیں اور اسے اپنے ہاں مدعو کریں جبکہ دوسرا کم آمیز اور تنہائی پسند ہوتا ہے۔ بعض لوگ باتیں کرنا اور بولنا چالنا پسند کرتے ہیں اور بعض خاموشی پسند کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو شخص طبیعت سے میل کھاتا ہو، ہم آہنگ ہو وہ ہر ایک کو اچھا لگتا ہے اور اس کی رفاقت پا کر ہر انسان راحت محسوس کرتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ہر فرد کے مزاج کے موافق اس سے برتاؤ کریں اور ایسا طریقۂ تعامل اپنائیں جسے وہ آسانی سے ہضم کر سکے تاکہ وہ ہماری رفاقت پا کر راحت محسوس کرے اور کسی قسم کی اکتاہٹ یا بددلی کا شکار نہ ہو۔

ایک صاحب نے ایک عقاب دیکھا جو کوّے کے پہلو میں اڑتا جا رہا تھا۔ اُنھیں بڑا تعجب ہوا کہ پرندوں کا بادشاہ کوّے کے ہمراہ کیسے ہے۔ انھوں نے سوچا ان دونوں کے درمیان ضرور کوئی قدرِ مشترک ہے جو انھیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی ہے اور وہ یوں یکجہتی سے محوِ پرواز ہیں۔ اُن صاحب نے عقاب اور کوّے پر نظر رکھتے ہوئے اُن کا تعاقب کیا۔ ایک جگہ تھک کر وہ دونوں زمین پر اتر آئے۔ کیا دیکھا کہ عقاب اور کوّا دونوں لنگڑے ہیں۔

اولاد کو علم ہو کہ ان کا باپ خاموشی کو ترجیح دیتا اور زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتا تو اولاد کو چاہیے کہ اپنے والد کی ترجیحات کا خیال رکھے تاکہ اُن کا والد اپنی اولاد سے محبت کرے اور اسے قریب پا کر خوشی محسوس کرے۔ بیوی جانتی ہو کہ اس کا خاوند ہنسی مذاق پسند کرتا ہے تو وہ بھی ہنسی مذاق کرے۔ لیکن اگر اسے پتا چلے کہ اس کا شوہر زیادہ طنز و مزاح پسند نہیں کرتا تو وہ بھی بے جا مذاق سے اجتناب کرے۔ انسان کو یہی طرزِ عمل اپنے دوستوں، آس پڑوس کے لوگوں اور اپنے بھائیوں سے روا رکھنا چاہیے۔ سب لوگوں کی فطرت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ لوگوں کے مزاج تو اتنے رنگا رنگ ہیں کہ آدمی ان کی بوقلمونی کا کبھی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک معمر نیک خاتون جو میرے ایک دیرینہ دوست کی والدہ تھیں، اپنے ایک بیٹے کی ہمیشہ تعریف کیا کرتیں، اس سے مل کر بہت خوش ہوتیں اور اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرتی تھیں۔ باقی اولاد بھی ان سے اچھا سلوک کرتی لیکن اُن کا دل اپنے ایک اسی بچے سے بندھا ہوا تھا۔ میں اُن خاتون کے اس برتاؤ کا راز جاننا چاہتا تھا۔ ایک دن میں ان کے اسی بیٹے کے ساتھ جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھیں، کسی محفل میں شریک تھا۔ میں نے ان سے بڑی اماں کے اس رویے کے بارے میں پوچھا تو

انھوں نے جواب دیا:

''دراصل بات یہ ہے کہ میرے بھائی اپنی والدہ کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ اسی لیے وہ جب بھی ان کے پاس بیٹھتے اور چند باتیں کرتے ہیں، وہ ان سے تنگ آجاتی ہیں۔''

میں نے دلچسپی سے سوال کیا: ''تو کیا آپ نے اپنی والدہ کی طبیعت کا راز پالیا ہے؟''

وہ ہنسے اور بولے: ''جی ہاں! میں آپ کو یہ راز بتاتا ہوں۔ دراصل میری والدہ بھی اپنی عمر کی دیگر بوڑھیوں کی طرح عورتوں کے موضوع پر باتیں کرنا پسند کرتی ہیں۔ انھیں صرف عورتوں کے معاملات سے دلچسپی ہے، کس عورت کی شادی ہورہی ہے، کسے طلاق ہوچکی ہے، فلانی کے کتنے بچے ہیں، ان میں بڑا کون ہے، فلاں مرد نے فلاں عورت سے کب شادی کی، ان کے پہلوٹھی کے بچے کا کیا نام ہے، یہ اور ان جیسی بہت سی باتیں جو میرے لیے بالکل بے فائدہ ہوتی ہیں لیکن والدہ صاحبہ انھیں بار بار بیان کر کے ہی خوش رہتی ہیں۔ انھیں اپنی معلومات کی قدر و قیمت اور نایابی کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے اور واقعی یہ معلومات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملتیں، نہ کسی کیسٹ میں محفوظ ہیں اور نہ ہم انٹرنیٹ جیسے معلومات کے وسیع و عریض ذخیرے ہی سے انھیں حاصل کر سکتے ہیں۔ میں جب والدہ صاحبہ سے یہ باتیں پوچھتا ہوں اور وہ تفصیل سے جواب دیتی ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سننے والے کو ایسی معلومات فراہم کر رہی ہیں جن کا علم اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو بھی نہیں، چنانچہ وہ خوش ہوتی ہیں اور ان کی طبیعت کھل جاتی ہے۔ میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں تو ہمیشہ یہی موضوع چھیڑتا ہوں۔ وہ گھنٹوں خوشی سے اس موضوع پر بولتی رہتی ہیں۔ میرے بھائی والدہ کی ان غیر اہم باتوں کو تحمل سے نہیں سنتے اور ادھر اُدھر کی ہانکتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ باتیں والدہ کے لیے اہم نہیں ہوتیں۔ نتیجتاً وہ ان سے تنگ

آجاتی ہیں اور مجھ سے خوش ہوتی ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

بالکل! آپ اپنے مخاطب کی طبیعت اور اس کے مزاج سے واقف ہوں، آپ کو اس کی پسند و ناپسند کا علم ہو تبھی آپ اس کے دل کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ نبی ﷺ کے طرزِ عمل میں یہ صفت بڑی واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ آپ ملنے والے ہر شخص سے اس کی افتادِ طبع کے مطابق سلوک کرتے۔ گھر میں اپنی بیویوں اور اولاد کے ساتھ بھی آپ کا رویہ ان کی طبائع کے موافق ہوتا۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کشادہ دل اور کھلی طبیعت کی مالک تھیں۔ رسول اللہ ﷺ ان سے ہنسی مذاق اور لطافت کا اظہار کیا کرتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کسی سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھیں۔ واپسی پر مسلمانوں کا قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو آپ نے لوگوں سے کہا:

"آگے بڑھ جاؤ۔"

لوگ آگے چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا عنفوانِ شباب میں تھیں۔ بدن میں چستی تھی۔ آپ نے مسکراتے ہوئے ان کی جانب دیکھا اور کہا:

"آؤ دوڑ لگائیں۔"

دوڑ شروع ہوئی۔ دونوں میاں بیوی تیز بھاگے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ دوڑ جیت لی۔

ایک مدت بعد دوبارہ عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی ہمراہی میں سفر پر نکلیں۔ اب ان کے بدن میں فربہی آچکی تھی۔ سفر کے دوران ایک کھلی جگہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ آگے بڑھ جاؤ۔ لوگ آگے چلے گئے۔ آپ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

"آؤ مجھ سے دوڑ لگاؤ۔"

دوڑ شروع ہوئی۔ اس بار رسول اللہ ﷺ آگے نکل گئے۔

آپ ﷺ نے مزاحیہ انداز میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا:

''یہ اس پہلے والی دوڑ کا بدلہ ہے۔''[1]

اس کے برعکس ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل مختلف اور ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ وہ عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ بڑی عمر کی عورت کے مزاج پر سنجیدگی اور متانت کا اثر غالب ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اپنے اصحاب کرام کے ساتھ تعامل بھی اسی طریقے کے مطابق تھا۔ آپ ابو ہریرہ کی قمیص خالد بن ولید کو پہنانے کی کوشش نہ کرتے۔ ابوبکر صدیق سے آپ کا جو رویہ تھا وہ طلحہ سے نہیں تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے ایک خاص مزاج کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کا اُن سے تعامل کا طریقہ دیگر اصحاب سے جُدا تھا۔ آپ انھیں جو کام سپرد کرتے وہ ان کے سوا کسی اور کے کرنے کا نہ ہوتا۔

بدر کے دن رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کو قریش کی پیش قدمی سے مطلع کیا گیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ قریش کے بعض سرکردہ افراد کو زبردستی میدانِ جنگ میں دھکیلا گیا ہے اور جنگ کے دوران وہ مسلمانوں کے مقابلے میں نہیں آئیں گے۔

آپ نے صحابۂ کرام کے درمیان کھڑے ہو کر کہا:

''بنی ہاشم اور قریش کے دیگر قبائل کے چند افراد کو میں جانتا ہوں جنھیں زبردستی میدان میں لایا گیا ہے۔ وہ ہم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ آپ میں سے جس کسی کا بنی ہاشم کے کسی فرد سے سامنا ہو وہ اسے قتل نہ کرے۔ ابوالبختری بن ہشام سے جس کا آمنا سامنا ہو وہ اسے قتل نہ کرے۔ جو عمِ رسول عباس بن عبدالمطلب کے سامنے آئے، انھیں قتل نہ کرے۔ انھیں مجبور کر کے لایا گیا ہے۔''

روایات میں ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے لیکن انھوں نے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا۔ وہ قریش کی خبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان اور مشرکین ایک دوسرے کے مقابلے میں آ رہے تھے۔ مسلمانوں کے دل بوجھل تھے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب اور ابناء و آباء سے لڑائی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بعض افراد کو قتل کرنے سے منع فرما رہے تھے۔

عتبہ بن ربیعہ کا شمار قریش کے قائدین و اکابرین میں ہوتا تھا۔ وہ ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کا والد تھا۔ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لشکر میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ عدل و انصاف پر مبنی تھا لیکن ان سے نہ رہا گیا۔ وہ بولے:

”کیا ہم اپنے ابناء و آباء و اخوان کو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں!! واللہ! اگر میرا اس سے سامنا ہو گیا تو میں اسے اپنی تلوار سے کاری ضرب لگاؤں گا۔“

ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ نے اپنے چاروں جانب دیکھا۔ تین سو سے زائد بہادر آپ کے اردگرد تھے۔ فی الفور آپ کی نظرِ انتخاب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ آپ نے انھیں مخاطب کیا اور فرمایا:

”ابوحفص! کیا عمِ رسول کے چہرے پر تلوار ماری جائے گی؟!“

عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے یہ پہلا موقع تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے میری کنیت سے مخاطب کیا۔ عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو کے غلام تھے۔ انھیں اس امر کا پورا احساس تھا کہ وہ جنگ کے میدان میں ہیں جہاں قائد کے فیصلے پر اعتراض یا اس کی مخالفت کرنے والے سپاہی کے معاملے میں کسی نرمی یا تساہل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

انھوں نے مسئلے کا فوری حل پیش کر دیا: ”اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیں، میں تلوار سے اس کی گردن اتار دوں۔“

رسول اللہ ﷺ نے انھیں منع کر دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کا جارحانہ ردِّعمل صورت حال کو قابو کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔

ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نیک آدمی تھے۔ بعد ازاں کہا کرتے تھے کہ میں نے اس روز جو بات کہی تھی آج بھی مجھے اس کے متعلق خدشہ ہے۔ آج بھی میں اس کے انجام سے خائف ہوں۔ صرف ایک صورت ہے کہ میں شہید ہو جاؤں اور میری شہادت اس غلطی کا کفارہ بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ صالح کی مراد پوری کی اور ابو حذیفہ جنگ یمامہ میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔[2]

یہ تھے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جن کی افتاد سے رسول اللہ ﷺ بخوبی آگاہ تھے۔ آپ جانتے تھے کہ کس نوعیت کے امور کی ذمہ داری عمر پر ڈالی جائے جس سے عہدہ برآ ہونے میں وہ یکتا ہوں۔ یہ کام مالِ زکاۃ اکٹھا کرنے سے متعلق نہیں تھا، نہ دو متحارب گروپوں میں صلح کرانے یا کسی نابلد کو تعلیم دینے کا معاملہ تھا۔

مسلمان جنگ کے میدان میں تھے۔ یہاں الجھن کو سلجھانے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو صائب الرائے، پختہ کار اور بارعب ہو۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کام کے لیے عمر رضی اللہ عنہ کو چنا اور فرمایا:

''کیا عمِ رسول کے چہرے پر تلوار سے ضرب لگائی جائے گی؟!''

ایک دوسرے واقعے میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خیبر پر حملہ آور ہوئے۔ وہاں اسلامی لشکر اور یہود کے درمیان جھڑپیں ہوئیں، پھر آپ نے ان سے مصالحت کی اور شہر میں داخل ہو گئے۔ معاہدے کی شرائط میں یہ امر بھی شامل تھا کہ یہود اپنے مال و متاع اور سونا چاندی میں سے کوئی شے نہیں چھپائیں گے۔ اگر انھوں نے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کی تو معاہدہ منسوخ سمجھا جائے گا اور اس کی کسی شق پر عمل درآمد نہیں ہو گا۔

حُیی بن اخطب جس کا شمار یہود کے سرداروں میں ہوتا تھا، مدینہ سے جلاوطنی پر سانڈ کی ایک کمائی ہوئی چمڑی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا جس میں بہت سا سونا اور زیور سِلا ہوا تھا۔ حیی یہ سونا ترکے میں چھوڑ کر مرا تھا۔ یہود نے اسے رسول اللہ ﷺ سے چھپا لیا۔

آپ نے حیی بن اخطب کے چچا سے دریافت کیا:

''حیی کی وہ چمڑی کیا ہوئی جو وہ نضیر سے لایا تھا؟''

اس نے جواب دیا: ''وہ سونا تو جنگوں اور دیگر مَدوں میں صرف ہو گیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کا جواب سنا تو سوچ میں پڑ گئے کہ حیی کو مرے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، مال بھی بڑی مقدار میں تھا اور ماضی قریب میں ان لوگوں کو جنگ سے واسطہ بھی نہیں پڑا کہ انھیں اتنا مال خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

آپ نے اعتراض کیا:

''اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور مال بھی خاصی مقدار میں تھا۔''

یہودی نے پھر وہی ٹکا سا جواب دیا:

''مال اور زیور سب ختم ہو گیا۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔''

نبی ﷺ سمجھ گئے کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔

آپ نے اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی جو خاصی تعداد میں تھے۔ وہ سب آپ کے اشارے کے منتظر تھے۔

آپ نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور کہا:

''زبیر! اس آدمی کی کچھ تواضع کی جائے۔''

زبیر شعلہ بار ہو کر یہودی کی جانب بڑھے۔ یہودی انھیں دیکھ کر کانپ اٹھا، اس نے آنک لیا کہ صورتِ حال پیچیدہ ہے۔ وہ جھٹ بولا: ''میں نے حیی کو دیکھا تھا وہ وہاں

کھنڈر میں گھومتا پھرتا تھا۔'' اس نے ایک پرانے گھر کے کھنڈر کی طرف اشارہ کیا۔ صحابۂ کرام وہاں پہنچے۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا تو انھیں کھنڈر میں چھپایا ہوا مال مل گیا۔[1]

اب دیکھیے یہ کام رسول اللہ ﷺ نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔

سچ ہے کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔

صحابۂ کرام کا باہمی برتاؤ بھی اسی بنیاد پر تھا، جن دنوں رسول اللہ ﷺ مرض الموت میں تھے، آپ کی تکلیف نے شدت اختیار کر لی تھی اور کھڑے ہو کر لوگوں کو نماز پڑھانا آپ کے بس میں نہیں رہا تھا۔ آپ نے بستر پر پڑے حکم دیا کہ ابوبکر سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک رقیق القلب انسان تھے۔ دنیا و آخرت میں رسول اللہ کے ساتھی اور جاہلیت و اسلام کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ زوجۂ رسول عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے سبب سینے پر غم کا پہاڑ اٹھائے پھرتے تھے۔ نبی ﷺ کا حکم سن کر آپ کے قریب بیٹھے بعض افراد نے عرض کی: ''ابوبکر نرم دل آدمی ہیں۔ آپ کی جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کو نماز نہیں پڑھا سکیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مزاج کی اس کیفیت کو جانتے تھے کہ وہ رقیق القلب ہیں اور بالخصوص اس قسم کے موقع پر بے اختیار رو پڑتے ہیں لیکن آپ کا اشارہ خلافت کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے استحقاق کی طرف تھا، چنانچہ آپ نے دوبارہ فرمایا:

''ابوبکر سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''[2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے حکم کی تعمیل میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ رقتِ قلبی کے ساتھ ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں ایک گونہ رعب اور دبدبہ بھی تھا۔ کبھی غصہ آجاتا تو چہرے سے جلال ٹپکنے لگتا۔ عمر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمدم و ہمراہی تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مہاجرین و انصار خلیفہ کے چناؤ کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ

میں جمع ہوئے تو عمر بھی اپنے رفیق و ہمدم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے وہاں پہنچ گئے۔

عمر رضی اللہ عنہ اس واقعے کی روداد بیان کرتے ہیں:

''ہم سقیفہ بنی ساعدہ میں لوگوں کے پاس گئے۔ جب ہم بیٹھے تو انصار کے مقرر نے خطبہ پڑھا، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا: ''ہم اللہ کے انصار اور اسلام کا لشکر ہیں۔ اور آپ اے معشرِ مہاجرین! ہماری ہی ایک ٹولی ہیں۔ آپ کی قوم کے کچھ افراد یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور (حکومت کے) اس معاملے میں ہم سے سارا اختیار چھین لیں۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے بولنا چاہا۔ میں نے اپنے من میں ایک زبردست تقریر تیار کر رکھی تھی جو مجھے پسند آئی تھی اور میں ابوبکر سے پہلے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کی تیزیِ طبع سے خائف تھا۔ لیکن ابوبکر نے کہا:

''عمر! ٹھہریے۔''

میں نے انھیں ناراض کرنا پسند نہیں کیا۔

انھوں نے بات شروع کی۔ وہ مجھ سے بڑے عالم اور زیادہ باوقار تھے۔ اللہ کی قسم! انھوں نے ہر وہ بات فی البدیہہ کہہ ڈالی جو میں نے اپنے دل میں سوچی تھی۔ بلکہ انھوں نے جو کہا مجھ سے بہتر اور زیادہ اچھے انداز سے کہا۔ ابوبکر نے اپنی تقریر میں کہا:

''آپ لوگوں نے اپنی جن اچھائیوں کا ذکر کیا، واقعی آپ ان کے اہل ہیں۔ عرب (حکومت کے) معاملے کو قریش کے اس قبیلے ہی کے لیے مانیں گے۔ یہ عرب کا افضل ترین خاندان اور فائق ترین گھرانہ ہے۔ میں نے آپ کے لیے ان دو آدمیوں کو پسند کیا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لیجیے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے میرا اور ابوعبیدہ بن جراح کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ہم دونوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ مجھے ان کی یہی ایک بات اچھی نہیں لگی۔ اللہ کی قسم! میری گردن کاٹ

دی جاتی تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند تھا کہ میں ایک ایسی قوم کا امیر بنوں جس میں ابوبکر موجود ہوں۔

لوگ خاموش رہے۔ انصار کا ایک کائیاں شخص بولا:

''میں اس معاملے میں وہ لکڑ ہوں جس سے رگڑ کھا کر کھجلی رفع کی جاتی ہے۔ اور کھجور کا اونچا لمبا پھل دار درخت ہوں جسے اردگرد باڑ لگا کر یا ٹیک دے کر گرنے سے محفوظ کیا گیا ہے، (مطلب یہ کہ میں صائب الرائے ہوں اور اس مسئلے کا شافی حل صرف میرے پاس ہے۔) اے معشرِ قریش! ایک امیر ہمارا ہوگا اور ایک امیر تمھارا۔''

اس بات پر بہت شور شرابا ہوا، آوازیں بلند ہو گئیں اور مجھے خدشہ ہوا کہ مسلمانوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ میں نے کہا: ''ابوبکر! اپنا ہاتھ بڑھائیے۔'' انھوں نے ہاتھ آگے کیا تو میں نے بیعت کر لی۔ یہ دیکھ کر پہلے مہاجرین نے اور پھر انصار نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔''[5]

جی ہاں! ہر انسان کی ایک شخصی کلید ہوتی ہے جس کا سراغ لگا کر اس کے دل کے دروازے کھولے جا سکتے ہیں، اس کی محبت اور توجہ حاصل کی جا سکتی اور اسے متاثر کیا جا سکتا ہے، اس لیے اپنے آس پاس ہنستے بستے لوگوں کی کلید شخصی کا پتا لگائیں اور اسی کی بنیاد پر ان سے تعامل کے طریقے طے کریں۔ تب آپ جس کسی کو مشورہ دیں گے وہ پُر اعتماد ہو کر آپ کے مشورے پر عمل کرے گا۔ جسے نصیحت کریں گے وہ نہایت خوش دلی سے آپ کی نصیحت قبول کرے گا۔ آپ بات کریں گے تو آپ کی بات گوش بر آواز ہو کر سنی جائے گی۔ لیکن یہ کلید آپ کو تبھی میسر آئے گی جب آپ لوگوں کی شخصیات اور ان کے طبائع کا گہری نظر سے جائزہ لیں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مبارک مجلس میں بیٹھے صحابۂ کرام سے

باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے تو دائیں بائیں دیکھا، پھر مسجد کے ایک گوشے کی طرف بڑھا۔ سب لوگ اسے حیرت سے تکنے لگے کہ یہ کیا کرنے والا ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا تہبند اٹھایا اور بیٹھ کر اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔ چند افراد جلدی سے اٹھے تاکہ اسے اس عمل سے باز کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں روکا اور تحمل سے فرمایا:

''اسے چھوڑ دیں، اسے مت روکیں۔''

اعرابی پیشاب کر کے اٹھا تو نبی ﷺ نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ آیا تو آپ نے اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا:

''مساجد اس کام کے لیے نہیں بنائی گئیں۔ انھیں اللہ کا ذکر کرنے، نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔''[1]

نہایت مختصر نصیحت کرنے کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔

بات آدمی کی سمجھ میں آ گئی اور وہ چلا گیا۔ نماز کا وقت ہوا تو وہ پھر آیا اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ رسول اللہ ﷺ نے تکبیر تحریمہ بلند کی، قراءت کے بعد رکوع کیا اور رکوع سے سر اٹھا کر 'سمع اللہ لمن حمدہ' کہا تو سب مقتدیوں نے 'ربنا ولک الحمد' کہا۔ اعرابی نے بھی یہ الفاظ کہے لیکن مزید چند الفاظ کا اضافہ کر دیا:

''اے اللہ! مجھ پر اور محمد پر رحم کر۔ ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔''

نبی ﷺ نے اس کے یہ الفاظ سن لیے۔ نماز تمام ہوئی تو آپ نے لوگوں کی طرف دیکھا اور ان الفاظ کے قائل کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کون تھا۔ لوگوں نے اعرابی کی طرف اشارہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آواز دی۔ وہ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی آدمی ہے جس نے کچھ دیر پہلے مسجد میں پیشاب کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت اس

کے دل میں اس حد تک گھر کر چکی تھی کہ وہ چاہتا تھا، اس کے اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی پر رحمت نازل نہ ہو۔

آپ نے اسے تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

''تم نے ایک وسیع شے کو تنگ کر دیا ہے۔''[1]

اس آدمی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے حسنِ سلوک کی وجہ سے اس کا دل آپ کا والا و شیدا ہو گیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ آپ نے اعرابی کی کلید شخصی کا سراغ پا لیا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ اس سے کیا برتاؤ کرنا ہے۔ وہ ایک اعرابی تھا جو بادیہ سے آیا تھا۔ علم کے لحاظ سے وہ ابو بکر و عمر یا معاذ و عمار کا ہمسر نہیں تھا، چنانچہ اس کا مواخذہ بھی اس کی شخصیت اور اس کے مبلغ علم کے مطابق کیا جانا چاہیے تھا۔

معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ ایک عام صحابی تھے۔ ان کی رہائش مدینہ میں نہیں تھی، نہ وہ نبی ﷺ کی مجالس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ بادیہ میں ان کے پاس بکریوں کا ایک ریوڑ تھا جس پر ان کی گزر بسر تھی۔ ایک دن معاویہ مدینہ آئے، مسجد میں داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ آپ اس آدمی کے متعلق گفتگو فرما رہے تھے جسے چھینک آ جائے۔ آپ نے اپنے صحابہ کو بتایا کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کی چھینک سنے اور وہ 'الحمدللہ' کہے تو جواباً اسے 'یرحمک اللہ' (اللہ تم پر رحم کرے) کہنا چاہیے۔

معاویہ نے یہ بات پلے باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ چند دن بعد کسی کام سے مدینے آئے اور مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھا رہے ہیں۔ معاویہ بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ دورانِ نماز کسی آدمی کو چھینک آ گئی۔ معاویہ کو یاد آیا کہ انھوں نے یہ بات سیکھی تھی، مسلمان جب چھینکے اور 'الحمدللہ' کہے تو اس کا بھائی جواباً ''یرحمک اللہ'' کہے۔ انھوں نے فوراً بلند آواز سے ''یرحمک اللہ'' کہہ دیا۔ ان کی اس حرکت

سے نمازیوں کی یکسوئی میں اچھاخاصا خلل واقع ہوا اور سب لوگ تیز نگاہوں سے انھیں تاڑنے لگے۔ معاویہ نے لوگوں کو حیرت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو پریشان ہوکر کہا: ”ہائے! میری ماں کی بربادی!! تم لوگوں کو کیا ہوا، میری طرف کیا دیکھتے ہو؟“

لوگ ہاتھوں سے رانوں پر مارنے لگے کہ خاموش ہو جائیں۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگ انھیں چپ رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں تو وہ خاموش ہو گئے۔

نماز ختم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے نمازیوں کی طرف رُخ کیا۔ شور شرابے کی آواز آپ کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ کسی بولنے والے کی آواز بھی آپ کو سنائی دی تھی لیکن نئی آواز تھی، اس لیے پہچان نہیں سکے۔ آپ نے لوگوں سے دریافت کیا:

”کون بول رہا تھا؟“

لوگوں نے معاویہ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے انھیں اپنے پاس بلایا۔ وہ ڈرتے ہوئے قریب آئے کہ جانے رسول اللہ کیا کہیں اور مبادا ڈانٹ پلا دیں۔

معاویہ کہتے ہیں: ”میرے ماں باپ رسول اللہ ﷺ پر فدا ہوں! واللہ! میں نے آپ سے قبل اور نہ آپ کے بعد، ایسے خوبصورت اور ہلکے پھلکے انداز سے تعلیم دینے والا معلم نہیں دیکھا۔ واللہ! نہ آپ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ گالی دی۔ آپ نے بس اتنا کہا:

”معاویہ! نماز میں باتیں کرنا مناسب نہیں۔ اس میں صرف تسبیح و تکبیر اور قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے۔“

آپ نے نہایت جامع اور مختصر نصیحت کی۔ معاویہ نے بات خوب سمجھ لی اور ان کے دل کو اطمینان حاصل ہوا تو انھوں نے کہا: ”میں جاہلیت کے دور سے تازہ تازہ نکلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی دولت سے نوازا ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے (اور ان سے غیب کی باتیں پوچھتے) ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم ان کے پاس مت جانا۔''

معاویہ نے کہا: ''اور ہم میں سے چند لوگ برے شگون لیتے ہیں۔''

آپ نے فرمایا:

''یہ ان کے دلوں کے وسوسے ہیں۔ ان کے ارادوں میں یہ واہمے بالکل رکاوٹ نہ بنیں۔''[8]

مسجد میں پیشاب کرنے والے اعرابی اور نماز میں باتیں کرنے والے شخص سے رسول اللہ ﷺ کا یہ طرزِ عمل ان کے احوال کے عین مطابق تھا۔ عوام کا غلطی کر جانا بعید از امکان نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کا شمار جلیل القدر اور اہل علم صحابہ میں ہوتا تھا، ان کی لغزش کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا ردِّ عمل یکسر مختلف تھا۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں عشاء کی نماز ادا کرتے، پھر واپس جاتے اور اپنے محلے کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھاتے، یوں محلے کی مسجد میں ادا کی گئی نماز معاذ کے لیے نفل ہوتی۔ ایک رات معمول کے مطابق وہ محلے کی مسجد میں عشاء کی امامت کرنے جائے نماز پر کھڑے ہوئے اور تکبیر تحریمہ بلند کی۔ قوم کا ایک نوجوان مسجد میں آیا اور نماز باجماعت میں شامل ہو گیا۔ سورۂ فاتحہ کی قراءت مکمل ہوئی تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کر دی۔ نمازیوں میں بڑی تعداد دن بھر کے تھکے ہارے کسانوں اور چرواہوں کی تھی جو عشاء پڑھتے ہی سو جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ نوجوان جو تکبیرِ تحریمہ پر مسجد میں آیا تھا، انھی محنت کشوں میں سے ایک تھا۔ وہ کھڑا نماز پڑھتا رہا۔ معاذ اپنی دُھن میں پڑھتے جاتے تھے اور ان کی قراءت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بالآخر جب امام کی قراءت نے کسی طرح ختم ہونے کا

نام نہ لیا تو اس نوجوان نے الگ سے اپنی نماز مکمل کی اور گھر چلا گیا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے سلام پھیرا تو ایک مقتدی نے بتایا کہ فلاں نوجوان ہمارے ساتھ نماز میں شامل ہوا تھا، پھر جب آپ نے نماز لمبی کی، وہ نماز چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ سن کر معاذ غصے میں آ گئے۔ انھوں نے کہا: ''اسے نفاق کی بیماری ہے۔ میں اس کی اس حرکت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور بتاؤں گا۔''

معاذ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ اس نوجوان تک پہنچے تو اس نے بھی طیش میں آ کر کہا: ''میں بھی ان کے اس عمل کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کروں گا۔''

اگلے دن علی الصبح معاذ رضی اللہ عنہ، وہ نوجوان اور محلے کے دیگر ممتاز افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ معاذ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نوجوان کی شکایت کی تو اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ آپ کے ہاں تا دیر ٹھہرتے ہیں، پھر واپس آ کر ہمیں لمبی لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! ہم ان کی لمبی نماز کے خوف سے عشاء کے وقت مسجد میں آنے سے کتراتے ہیں۔''

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ سے دریافت کیا کہ وہ نماز میں عموماً کون سی سورتیں پڑھتے ہیں۔ معاذ نے بتایا کہ وہ سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں تلاوت کرتے ہیں، انھوں نے چند طویل سورتوں کے نام لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ واقعتاً لوگ لمبی نماز کے ڈر سے مسجد میں آنے سے کتراتے اور نماز سے پیچھے رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں تو آپ کو شدید غصہ آیا۔ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''معاذ! کیا آپ لوگوں کو فتنے میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ سورۂ طارق، سورۂ بروج، سورۂ شمس اور سورۂ لیل جیسی سورتیں پڑھا کریں۔''[9]

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے اور اظہارِ شفقت کرتے

ہوئے دریافت کیا:

''بھتیجے! تم نماز پڑھتے ہو تو کیا کہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا: ''میں فاتحہ پڑھتا ہوں، پھر اللہ سے جنت کا سوال کرتا اور جہنم سے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔''

پھر اچانک نوجوان کو یاد آیا کہ اس نے نبی ﷺ کو (نماز میں) لمبی لمبی دعائیں کرتے دیکھا ہے اور معاذ بھی ایسا ہی کرتے ہیں، اس نے کہا:

''مجھے نہیں معلوم آپ اور معاذ کیا گنگناتے رہتے ہیں۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

''میں اور معاذ بھی انھی دونوں (جنت و جہنم) کے متعلق گنگناتے ہیں، (انھی دونوں کے متعلق لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں)۔''[10]

معاذ رضی اللہ عنہ نے نوجوان کو نفاق کا الزام دیا تھا جس کا اس نے خاصا اثر لیا۔ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے اس نے کہا: ''لیکن معاذ کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا جب قوم پیش قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھے گی اور اسے بتایا جائے گا کہ دشمن سر پر آن پہنچا ہے تو میں کیا کرتا ہوں۔'' (مطلب یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں معاذ کو میرے ایمان کی حرارت کا پتا چل جائے گا جنھوں نے مجھ پر نفاق کا الزام دھرا ہے۔)

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ایک معرکہ بپا ہوا جس میں اس نوجوان نے خوب دادِ شجاعت دی اور شہادت سے سرفراز ہوا۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی شہادت کا علم ہوا تو آپ نے معاذ کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا:

''میرے اور آپ کے حریف کا کیا بنا؟''[11]

معاذ نے جواباً کہا: ''یا رسول اللہ! اس نے اللہ سے سچ بولا اور میں نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ شہید ہو چکا ہے۔''

اس واقعے کا قابلِ لحاظ پہلو یہ ہے کہ لوگوں کے مختلف مزاج میں پائے جانے والے فطری فرق کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس باب میں رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ رہن سہن میں ان کے مزاج اور معاشرے میں ان کی قدر و منزلت اور ان کے مناصب کو مدنظر رکھتے تھے۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو رسول اللہ ﷺ کو بہت پیارے تھے اور جنھوں نے آپ کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی، ان کی غلطی کے ردِّ عمل میں آپ نے جو رویہ اختیار کیا اس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے ہوتا ہے:

''نبی ﷺ نے جُہینہ کے ذیلی قبائل کی طرف صحابۂ کرام کے دستے روانہ کیے۔ مجاہدین میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ علی الصبح جنگ کا آغاز ہوا۔ دورانِ معرکہ مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ دشمن کے بہت سے لاشے گرے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دشمن کے ثابت قدم رہنے والے افراد میں سے ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو ہتھیار ڈال کر میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کی۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے اپنے انصاری ساتھی کے ہمراہ اس کا تعاقب کیا اور راستے میں ایک درخت کے قریب اسے جا لیا۔ دونوں کی تلواریں بلند ہوئیں۔ اس آدمی کو اپنے سر پر دو تلواریں چمکتی دکھائی دیں تو موت کا سایہ اس کے چہرے پر لہرا گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور گھبرا کر کلمہ پڑھا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»

اسامہ اور اُن کے انصاری ساتھی حیران تھے کہ کیا واقعی یہ شخص اسلام قبول کر رہا ہے یا اُس نے محض اپنی جان بچانے کا حیلہ کیا ہے۔ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ وہ جنگ کے

میدان میں تھے جہاں ہر طرف کٹے پھٹے جسم اور انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ موت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ خون بہائے جا رہے تھے اور فضا کانپ رہی تھی۔ آدمی ان کے سامنے تھا اور وہ دونوں حیرت اور پریشانی کی تصویر بنے اسے تک رہے تھے۔ فوری فیصلے کا وقت تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی ناقابل برداشت تھی۔ کسی بھی لحظے کوئی تیر آ سکتا تھا جو ان دونوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔ بیٹھ کر سوچنے اور معاملے کی نزاکت پر غور وفکر کرنے کا وہاں موقع نہیں تھا۔ انصاری نے اپنی تلوار ہٹا لی۔ لیکن اسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوچ کر کہ اس شخص کا اسلام قبول کرنا ایک حیلے کے سوا کچھ نہیں، تلوار کا وار کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسلمان فتح حاصل کرنے کے بعد خوشی خوشی مدینہ لوٹ آئے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معرکے کی روداد بیان کرنے لگے۔ اس دوران انھوں نے اس آدمی کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ معرکے کی کارروائی سے عیاں تھا کہ مسلمانوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت توجہ سے اسامہ کی باتیں سن رہے تھے اور آپ کا چہرۂ مبارک وفورِ مسرت سے دمک رہا تھا۔ جیسے ہی اسامہ نے کہا: ''پھر میں نے اسے قتل کر دیا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ فق ہو گیا۔ آپ نے رنج اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں پوچھا:

''اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا؟''

اسامہ نے عذر پیش کیا: ''اے اللہ کے رسول! اس نے یہ دل سے نہیں کہا تھا۔ اس نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پھر وہی سوال تھا:

''اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا؟''

''تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ وہ یہ بات دِل سے کہہ رہا ہے یا اسلحے

کے خوف سے۔"

رسول اللہ ﷺ بے قراری سے اسامہ کو دیکھتے اور یہی کہتے رہے:

«قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَتَلْتَهُ؟! قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَتَلْتَهُ؟! كَيْفَ لَكَ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَتْ تُحَاجُّكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟!»

"اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا، اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا، لا الہ الا اللہ کا کیا کرو گے جب یہ کلمہ قیامت کے دن تمھارے پاس آئے گا اور تم سے احتجاج کرے گا۔"

آپ بار بار یہی کہتے رہے۔

اسامہ کہتے ہیں: "آپ بار بار مجھ سے یہی پوچھ رہے تھے حتی کہ میں نے تمنا کی کہ کاش! میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوتا۔"[12]

مشورہ

"سب لوگوں کو ایک جیسا مت سمجھیں۔ لوگوں کی طبیعتیں کتنی رنگا رنگ اور مختلف ہیں، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

---

[1] مسند أحمد: 264/6، وسنن ابن ماجة، حديث: 1979. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 629,628/2. [3] صحيح ابن حبان: 607/11. [4] صحيح البخاري، حديث: 7303. [5] صحيح البخاري، حديث: 3668. [6] صحيح مسلم، حديث: 285. [7] سنن أبي داود، حديث: 882، وجامع الترمذي، حديث: 147. [8] صحيح مسلم، حديث: 537. [9] صحيح البخاري، حديث: 6106، وصحيح مسلم، حديث: 465 وسنن أبي داود، حديث: 790. [10] سنن أبي داود، حديث: 793. [11] السنن الكبرى للبيهقي: 117/3، وصحيح ابن خزيمة: 65/3، حديث: 1634 [12] صحيح البخاري، حديث: 6872، وصحيح مسلم، حديث: 96.

مناسب طرزِ گفتگو کا انتخاب کریں

یہ مضمون گزشتہ سے پیوستہ ہے کہ لوگوں سے بات چیت میں کیسا طرزِ گفتگو اختیار کیا جائے اور جن امور پر تبادلۂ خیال کیا جائے اُن کی نوعیت کیا ہو۔

آپ اپنے کسی دوست، ساتھی، رفیقِ کار یا کسی قریبی رشتے دار سے ملاقات کریں تو دورانِ گفتگو ایسے موضوعات چھیڑیں جو اس سے متعلق ہوں اور جن پر بات کر کے اسے خوشی ملتی ہو۔ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ ایک نوجوان جن موضوعات کو زیرِ بحث لانا پسند کرتا ہے وہ یقیناً ان امور سے مختلف ہوتے ہیں جن پر ایک عمر رسیدہ شخص بات کرنا پسند کرتا ہے۔ ایک عالم سے بات کرتے ہوئے آپ جن موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ ان موضوعات سے میل نہیں کھاتے جن پر ایک جاہل گفتگو کرتا ہے۔ آپ اپنی بیوی سے اس کے متعلقہ موضوع پر بات کرتے ہیں اور بہن سے بات کرتے ہوئے اس کا من پسند موضوع چھیڑتے ہیں۔

یہاں میری مراد کلی اختلاف سے نہیں۔ یوں نہیں کہ آپ جو واقعہ بہن کو سنائیں وہ بیوی سے بیان نہ کریں یا جو بات نوجوان آدمی سے کریں وہ بوڑھے شخص سے نہ کریں، نہیں! موضوعات کے اختلاف سے یہاں میری مراد وہ معمولی اختلاف ہے جو واقعے کی پیش کش کے اسلوب اور بعض اوقات اس کے ڈھانچے میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

مثال کے بغیر بات واضح نہیں ہو گی، مثلاً: آپ کے دادا جان سے ملاقات کرنے آپ کے ہاں چند بڑی عمر کے لوگ آتے ہیں جن کی عمریں اسّی سال سے متجاوز ہیں۔ کیا یہ مناسب رہے گا کہ آپ بے تکلفی میں ان سے کسی پر فضا مقام پر دوستوں کے ساتھ منائی گئی پکنک کا احوال بیان کرنے لگیں۔ یا یہ بتانے لگیں کہ فٹ بال کے فلاں کھلاڑی نے اس بار کیا ریکارڈ قائم کیا یا اس نے کیسے اپنے سر پر فٹ بال ٹکایا اور پھر پاؤں کی ضرب سے اسے دور پھینک دیا، یقیناً یہ مناسب نہیں ہو گا۔

آپ ننھے بچوں سے گفتگو کے دوران میاں بیوی کے باہمی معاملات زیرِ بحث لائیں تو بھی درست نہیں ہو گا۔ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ دورانِ گفتگو ان موضوعات کا انتخاب کریں جنھیں وہ پسند کرتے ہیں۔

ایک باپ جس کا ایک ہونہار بیٹا ہو اسے چاہیے کہ اپنے بیٹے سے بات کرتے ہوئے اس کی ذات سے متعلقہ امور کو موضوع بنائے یا جیسے آپ کے کسی عزیز یا دوست نے نئی دکان کھولی اور خاصا نفع کمایا تو آپ اس سے اس کی دکان کے حالات پوچھیے کہ بھائی آپ کی دکان کیسی چل رہی ہے، کاروبار مندا تو نہیں جا رہا، بکری کتنی ہو رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یوں وہ خوش ہو گا اور آپ سے باتیں کرنا چاہے گا۔

رسول اللہ ﷺ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ احد میں اُن کے والد نو بیٹیاں چھوڑ کر شہید ہو گئے جن کا جابر کے سوا کوئی کفیل نہیں تھا۔ والد عبداللہ کے ذمے بہت سا قرض بھی تھا جو اب ان کے نوجوان بیٹے جابر کو ادا کرنا تھا۔ جابر ہمیشہ قرض کی ادائیگی اور بہنوں کی پرورش کے بارے میں پریشان اور فکرمند رہتے تھے۔ قرض خواہان نے صبح شام کے مطالبوں سے اُن کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

مسلمان نبی ﷺ کی معیت میں غزوۂ ذات الرقاع کے لیے روانہ ہوئے۔ جابر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ غربت کے مارے ایک انتہائی لاغر اونٹ پر سوار تھے جو چلنے سے انکاری تھا۔ سب لوگ ان سے آگے نکل گئے اور وہ قافلے کے آخر میں رہ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ آپ ہمیشہ قافلے کے پیچھے پیچھے آیا کرتے تھے۔ آپ کو جابر کا رینگتا اونٹ نظر آیا تو ان کے قریب گئے اور دریافت فرمایا:

''جابر! کیا بات ہے؟''

''اللہ کے رسول! میرا اونٹ پیچھے رہ گیا ہے۔'' جابر نے قدرے افسوس سے جواب دیا۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

''اچھا، ذرا اسے بٹھا دو۔''

انھوں نے اونٹ بٹھا دیا۔ نبی ﷺ نے بھی اپنی اونٹنی اس کے قریب بٹھا دی۔

آپ نے جابر سے مخاطب ہو کر کہا:

''ذرا اپنی لاٹھی دینا۔''

انھوں نے لاٹھی پکڑا دی۔ آپ نے لاٹھی سے اونٹ کو چند ہلکی ضربیں لگائیں۔ اونٹ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے چلنے سے عاری تھا، اُچھل کر کھڑا ہوا اور بھاگنے لگا۔ اُس کے انگ انگ میں چستی کی لہر دوڑ گئی۔ جابر رضی اللہ عنہ بھاگ کر اُس کی گردن سے لٹکے اور سوار ہو گئے۔ وہ نبی ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے کہ اُن کا کمزور اور بے فائدہ اونٹ پہلے کی طرح تیز رفتار ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جابر کی طرف متوجہ ہوئے اور چاہا کہ کوئی بات چھیڑیں۔ جابر عنفوانِ شباب میں تھے اور جوانی کے تفکرات عموماً شادی اور معاش کے گرد گھومتے ہیں۔ آپ نے یہیں سے گفتگو کا آغاز کیا اور پوچھا:

''جابر! شادی کی؟''

''جی ہاں۔'' جابر نے مسکرا کر جواب دیا۔

آپ نے دریافت کیا:

''کنواری ہے یا شادی شدہ؟''

''شادی شدہ ہے۔''

نبی ﷺ کو تعجب ہوا کہ نوجوان کنوارا آدمی پہلی شادی کے لیے عام طور پر کنواری عورت ہی چاہتا ہے۔ آپ نے ملائمت سے کہا:

''بھلا کنواری عورت سے شادی کرتے جو تم سے کھیلتی اور تم اس سے ہنسی مذاق کرتے!'' [1]

جابر نے وجہ بیان کرتے ہوئے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے والد غزوۂ احد میں نو بیٹیاں چھوڑ کر شہید ہو گئے ہیں جن کا میرے سوا کوئی کفیل نہیں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ انھی کی ہم عمر کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لوں اور وہ سارا سارا دن آپس میں لڑتی جھگڑتی رہا کریں، اس لیے میں نے بڑی عمر کی عورت سے شادی کی ہے جو ماں کی طرح میری بہنوں کو سنبھالے، اُن کی کنگھی پٹی کرے اور انھیں صاف ستھرا رکھے۔''

نبی ﷺ نے دیکھا کہ ان کے روبرو ایک ایسا نوجوان کھڑا ہے جس نے صرف اپنی بہنوں کی خاطر جوانی کے پُر کیف جذبات کی قربانی دی۔ آپ نے جابر سے دل لگی کرتے ہوئے کہا:

''شاید ہم مدینے کے قریب پہنچ کر صرار میں پڑاؤ کریں اور تمھاری بیوی کو ہماری آمد کی خبر ہو اور وہ تمھارے لیے تکیے سجا کر رکھے۔''

جابر کو اپنی اور اپنی بہنوں کی ناداری یاد آئی۔ انھوں نے فوراً کہا:

”تکیے! اے اللہ کے رسول! واللہ! ہمارے پاس تو کوئی تکیے نہیں۔“

آپ نے جواب دیا:

”ان شاء اللہ! تم لوگوں کے پاس تکیے ہوں گے۔“

وہ دونوں چلتے رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جابر رضی اللہ عنہ کی مالی مدد کرنا چاہی۔ آپ نے ایک بار پھر اُنھیں مخاطب کیا اور فرمایا:

”جابر! اپنا اونٹ مجھے بیچتے ہو؟“

جابر سوچ میں پڑ گئے کہ یہ اونٹ اُن کا کل سرمایہ ہے۔ پہلے تو یہ لاغر تھا لیکن اب قوی اور مضبوط ہو چکا ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی سوچا کہ رسول اللہ ﷺ کے مطالبے کو رد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ انھوں نے جوابًا کہا:

”اے اللہ کے رسول! ٹھیک ہے۔ بتائیے اسے کتنے میں خریدیں گے آپ؟“

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

”ایک درہم میں۔“

جابر نے حیران ہو کر پوچھا: ”صرف ایک درہم! یا رسول اللہ! آپ مجھے گھاٹے میں ڈالنا چاہتے ہیں؟“

رسول اللہ ﷺ نے بولی بڑھائی:

”چلو، دو درہم میں۔“

”نہیں، اے اللہ کے رسول! یوں میں خسارے میں رہوں گا۔“

رسول اللہ ﷺ قیمت بڑھاتے رہے حتی کہ بات چالیس درہم تک جا پہنچی۔

جابر نے مطمئن ہو کر کہا: ”اب ٹھیک ہے لیکن ایک شرط ہے کہ میں مدینہ پہنچنے تک

اونٹ پر سوار رہوں گا۔"

رسول اللہ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔

مسلمانوں کا قافلہ مدینہ پہنچا تو جابر رضی اللہ عنہ اپنے گھر گئے اور اونٹ سے سامان اتارنے کے بعد نبی ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھنے مسجد گئے اور اونٹ مسجد کے قریب ہی باندھ دیا۔ نبی ﷺ نماز کے بعد باہر تشریف لائے تو جابر نے کہا: "اے اللہ کے رسول! یہ رہا آپ کا اونٹ۔"

آپ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا:

"جابر کو چالیس درہم سے کچھ اوپر دے دو۔"

بلال نے حکم کی تعمیل کی اور چالیس درہم سے کچھ اوپر رقم جابر کے حوالے کر دی۔ جابر نے رقم لی اور یہ سوچتے ہوئے واپس ہوئے کہ اب ان پیسوں کا مصرف کیا ہو۔ نیا اونٹ خریدا جائے یا گھر کا سامان لیا جائے۔ اُدھر رسول اللہ ﷺ نے بلال سے کہا کہ یہ اونٹ پکڑو اور جابر کو دے آؤ۔ بلال نے اونٹ کی باگ تھامی اور جابر کی طرف چل پڑے۔ جابر نے بلال کو مع اونٹ کے آتے دیکھا تو حیران ہوئے کہ کیا سودا منسوخ کر دیا گیا ہے۔

بلال نے آتے ہی کہا: "جابر! اونٹ لے لیجیے۔"

جابر نے حیرت سے پوچھا: "کیا ہوا؟"

بلال نے جواب دیا: "رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اونٹ آپ کو دے آؤں۔ اور اس کی قیمت بھی آپ اپنے پاس رکھیے۔"

یہ سُن کر جابر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔ کیا آپ کو اونٹ کی ضرورت نہیں؟"

رسول اللہ ﷺ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''تم کیا سمجھتے ہو، میں نے تم سے بھاؤ تاؤ اس لیے کیا تھا کہ تمھارا اونٹ حاصل کر لوں؟''[3]

یعنی میں نے تم سے بھاؤ تاؤ اس لیے نہیں کیا کہ اونٹ مجھے مل جائے بلکہ میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ تمھاری مدد کے لیے کتنی رقم دے سکتا ہوں۔

یہ بہت بلند اخلاق ہونے کی علامت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نوجوان کے من پسند موضوع پر بات کا آغاز کیا اور جب اس پر صدقہ کرنا چاہا تو اسے ادب اور لطافت کے خوشنما غلاف میں پیش کیا۔

ایک دن جُلیبیب نامی نوجوان صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا شمار نوجوان، نیک طینت اور نادار صحابہ میں ہوتا تھا۔ جُلیبیب خوبصورت نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے شادی کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے پیش کش کی کہ میں تمھاری شادی کراتا ہوں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''آپ کو میری قیمت زیادہ نہیں ملے گی۔''

''لیکن تم اللہ کے نزدیک کم قیمت نہیں ہو۔''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ جُلیبیب کے لیے رشتے کی تلاش میں رہے۔ ایک انصاری اپنی شادی شدہ بیٹی کا رشتہ نبی ﷺ کے لیے لے کر آیا۔ آپ نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''فی الحال میں شادی کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آپ کی بیٹی کی شادی کسی اور سے کرا سکتا ہوں۔''

انصاری نے پوچھا: ''کس سے؟''

آپ نے جواب دیا: ''جُلیبیب سے۔''

اس آدمی نے حیران ہو کر کہا: ''جُلیبیب!! جُلیبیب سے کیسے؟ اے اللہ کے رسول!

میں اپنی بیوی سے مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔"

انصاری گھر آیا اور اپنی بیوی سے کہنے لگا: "رسول اللہ (ﷺ) تمھاری بیٹی کا رشتہ مانگتے ہیں۔"

بیوی نے جواباً کہا: "بہت اچھی بات ہے۔ اسے رسول اللہ (ﷺ) سے بیاہ دو۔"

"لیکن وہ اپنے لیے نہیں مانگ رہے۔"

"پھر کس کے لیے؟"

"وہ جُلیبیب کے لیے ہماری بیٹی کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔"

یہ سن کر وہ عورت ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے واویلا کرتے ہوئے کہا:

"ہائے میں مرگئی! برباد ہوگئی، جُلیبیب کے لیے؟ نہیں، اللہ کی قسم! جُلیبیب کو تو میں اپنی بیٹی کا بال بھی اکھاڑ کر نہ دوں گی۔ ہم نے تو فلاں اور فلاں کے بہترین رشتوں کو بھی ہم پلہ نہ جانتے ہوئے ٹھکرا دیا تھا۔"

انصاری کو اپنی بیوی کا فیصلہ سن کر رنج ہوا۔ وہ اُٹھ کر جانے لگا تو اس کی بیٹی پردے کے پیچھے سے بولی: "میرا رشتہ کس نے مانگا ہے؟"

والدین نے جواب دیا: "رسول اللہ (ﷺ) نے۔"

لڑکی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا: "آپ لوگ رسول اللہ (ﷺ) کا کہنا کیوں ٹالتے ہیں؟ آپ مجھے رسول اللہ (ﷺ) کے حوالے کر دیں۔ وہ کبھی مجھے ضائع نہیں ہونے دیں گے۔"

لڑکی کی یہ بات سُن کر والدین مطمئن اور ہلکے پھلکے ہو گئے۔ اس کا والد نبی ﷺ کی طرف گیا اور بولا: "یا رسول اللہ! جیسے آپ کی مرضی! میں اپنی بیٹی کا بیاہ جُلیبیب سے کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اس پر رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے اور اس لڑکی کا نکاح جُلیبیب سے کر دیا۔ آپ نے دونوں میاں بیوی کو دعا دی:"

«اَللّٰهُمَّ صُبَّ عَلَيْهِمَا الْخَيْرَ صَبًّا وَّ لَا تَجْعَلْ عَيْشَهُمَا كَدًّا»

"یا اللہ! ان دونوں پر خیر و برکت کی برکھا برسا اور ان کی زندگی دشوار نہ بنانا۔"

جُلیبیب کی شادی کو چند ہی دن گزرے تھے کہ نبی ﷺ مع اپنے اصحاب کے کسی غزوے پر روانہ ہوئے۔ جُلیبیب رضی اللہ عنہ بھی مجاہدین کے ہمراہ تھے۔ لڑائی اختتام کو پہنچی تو لوگ اپنے اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے چند لوگوں کو میدانِ جنگ میں سرگرداں دیکھا تو دریافت کیا:

"کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

جواب آیا: "ہم فلاں اور فلاں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

آپ چند ثانیے خاموش رہے، پھر پوچھا:

"کسے ڈھونڈتے ہو؟"

لوگوں نے کہا: "ہم فلاں اور فلاں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

آپ نے کچھ دیر خاموش رہ کر پھر وہی سوال کیا:

"کسے تلاش کرتے ہو؟"

لوگوں نے پھر وہی جواب دیا: "ہم فلاں اور فلاں کو تلاش کر رہے ہیں۔"

آپ نے بے چین ہو کر فرمایا:

"لیکن میں تو جُلیبیب کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

بس پھر کیا تھا۔ سب لوگ جُلیبیب کو تلاش کرنے لگے۔ مقتولین میں دیکھا تو نہ ملے، پھر میدانِ جنگ کے قریب ہی ایک جگہ سات مقتول مشرکین کے درمیان ان کی

لاش پڑی نظر آئی، جنھیں جُلیبیب نے قتل کیا تھا اور جُلیبیب کو مشرکین نے قتل کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ جُلیبیب کی لاش کے قریب کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے، پھر یکایک کہنے لگے:

''اس نے سات کو مارا اور مشرکین نے اسے قتل کیا۔ اس نے سات کو مارا اور مشرکین نے اسے مار ڈالا۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے جُلیبیب کی لاش اپنے ہاتھوں پر اٹھائی اور صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ اس کی قبر کھودیں۔

انس کہتے ہیں کہ ہم قبر کھودتے رہے اور جُلیبیب رسول اللہ ﷺ کے بازوؤں کو بستر بنائے لیٹا رہا۔ قبر تیار ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں اُنھیں لحد میں اتارا۔

انس رضی اللہ عنہ نے جُلیبیب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کی پاکبازی اور حسن و جمال کی بابت بتایا: ''اللہ کی قسم! انصار میں کوئی ایسی بیوہ نہیں تھی جس کے اتنے زیادہ رشتے آئے ہوں۔''[4]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر آدمی سے اس کے علم و عمل اور عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے گفتگو کرتے تھے۔ اس طریقِ کار کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ سامعین بولنے والے کی باتوں سے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتے۔

رسول اللہ ﷺ ایک دن اپنی بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھے۔

یہاں دیکھنا یہ ہے کہ میاں بیوی اکٹھے بیٹھیں تو ان کے درمیان کیسی باتیں ہونی چاہئیں۔ عائشہ سے آپ نے رومیوں سے جنگ کرنے کے متعلق مشورہ نہیں کیا، نہ یہ بات چھیڑی کہ جنگ میں کیسا اسلحہ استعمال کرنا چاہیے کیونکہ مخاطب ابوبکر رضی اللہ عنہ نہیں تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے مسلمانوں کی غربت اور کس مپرسی کی زندگی کا ذکر نہیں کیا کیونکہ مخاطب عثمان رضی اللہ عنہ نہیں تھے۔

بلکہ آپ نے ایک دلدار شوہر کے محبت بھرے لہجے میں کہا:

''جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو اور جب ناراض ہوتی ہو تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا نے دلچسپی بھری حیرت سے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

آپ نے فرمایا:

''جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو کہتی ہو: محمد کے رب کی قسم! اور جب ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو: ابراہیم کے رب کی قسم!''

اس پر عائشہ رضی اللہ عنہا نے شرما کر کہا: ''یا رسول اللہ! واللہ! میں صرف آپ کا نام ہی ترک کرتی ہوں۔'' [5]

سوال یہ ہے کہ کیا آج ہم بھی ان باتوں کا لحاظ رکھتے ہیں؟

نقطۂ نظر

''لوگوں سے ایسی باتیں کریں جن میں وہ دلچسپی لیں، نہ کہ ایسی باتیں جن سے آپ کو دلچسپی ہو۔''

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2097، وصحيح مسلم، حديث: 715 (بعد الحديث: 1466)، ومسند أحمد:3/376. [2] مسند أحمد:3/376. [3] صحيح مسلم، حديث: 715 (بعد الحديث: 1599)، وسنن النسائي، حديث: 4641، وسنن الكبرى للبيهقي: 5/337. [4] مسند أحمد: 4/422. [5] صحيح البخاري، حديث: 5228، وصحيح مسلم، حديث: 2439.

پہلا تأثر ہی حتمی تأثر ہے

(گربہ کشتن روزِ اول)

مصر کے بعض دیہات میں قدیم زمانے سے ایک روایت پائی جاتی ہے جس کے مطابق دُولھا شبِ زفاف سے پہلے اپنے کمرے میں ایک بلی چھپا دیتا ہے۔ دُولھن کو کمرے میں لا کر بٹھایا جاتا ہے، پھر دُولھا آتا اور کرسی کو حرکت دیتا ہے جس کے نیچے چُھپائی ہوئی بلی باہر نکل آتی ہے۔ اب دُولھا اپنی بے پناہ مردانہ طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلی کو پکڑ کے اسے کی گردن مروڑتا اور مار ڈالتا ہے، صرف اس لیے کہ پہلی ہی ملاقات پر شوہر کا رعب و دبدبہ بیوی کے ذہن میں بیٹھ جائے۔

میں یہ باب لکھ رہا تھا کہ مجھے یاد آیا، جن دنوں میں یونیورسٹی کی تعلیم سے فراغت پا کر ایک مقامی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوا، کالج کے ایک پرانے پروفیسر میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

"اپنے پہلے لیکچر میں طلبہ پر خوب سختی کریں اور اپنے اوپر غصہ طاری کیے رکھیں۔ یوں پہلے ہی دن اُن پر آپ کی دھاک بیٹھ جائے گی اور وہ ہمیشہ آپ سے دَب کر رہیں گے۔"

یاد رکھیں، پہلی ملاقات کا تاثر آپ کی شخصیت کے کل تاثر کا ستر فیصد ہوتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر مخاطب کے ذہن میں آپ کی ذات کا نقش بیٹھتا ہے۔

پہلا تاثر ہی حتمی تاثر ہے

سرکاری افسران کے ایک گروپ نے تربیتی ورکشاپ میں شرکت کے لیے امریکہ کا سفر کیا۔ ورکشاپ کا موضوع تھا: ''رفقائے کار کا باہمی طرزِ عمل۔''

پہلے دن سب طلبہ صبح ہی صبح تیار ہو کر کمرۂ جماعت میں حاضر ہوئے اور ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرانے لگے۔ اچانک پروفیسر صاحب آن وارد ہوئے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ پروفیسر کی نظر ایک طالب علم پر پڑی جو ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

اُنھوں نے نہایت غصے میں چلا کر کہا: ''تم کیوں ہنس رہے ہو؟''

''معاف کیجیے گا، جناب! میں نہیں ہنسا۔'' طالب علم نے اطمینان سے جواب دیا۔

''نہیں، تم ہنس رہے تھے۔'' پروفیسر صاحب نے اسی رنگ میں کہا۔

پھر وہ طالب علم کو ڈانٹنے لگے: ''تم ایک غیر سنجیدہ انسان ہو۔ بہتر ہو گا کہ اولین فلائیٹ سے گھر لوٹ جاؤ۔ میں تم جیسوں کو پڑھانے سے رہا۔''

طالب علم بے چارے کا ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ وہ کبھی معصومیت سے پروفیسر کی طرف دیکھتا اور کبھی دیگر طلبہ پر سفارش طلب نظر ڈالتا۔

آخر پروفیسر صاحب نے تیوری چڑھا کر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''نکل جاؤ کلاس سے۔''

طالب علم پریشانی کے عالم میں کمرۂ جماعت سے چلا گیا۔

اب پروفیسر صاحب دیگر طلبہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

''میں ڈاکٹر فلاں ہوں اور آپ کو فلاں مضمون پڑھاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے آپ کو یہ فارم بھرنا ہو گا۔ یاد رہے کوئی طالب علم فارم پر اپنا نام نہ لکھے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے استاد کا کارکردگی فارم تمام طلبہ میں تقسیم کیا۔ فارم میں یہ پانچ سوال تھے:

① اپنے استاد کے اخلاق کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟
② استاد کے طریقۂ تدریس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟
③ کیا استاد مخالف کی رائے تسلیم کرتا ہے؟
④ کیا آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ یہی استاد آپ کو پڑھائے؟
⑤ ادارے سے باہر آپ استاد سے مل کر خوشی محسوس کرتے ہیں؟

ہر سوال کے آگے چار آپشن دیے گئے تھے:

① نمایاں ② عمدہ ③ قبول ④ کمزور

اِن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ تمام طلبہ نے اپنے اپنے فارم پُر کیے اور پروفیسر صاحب کو واپس کر دیے۔ پروفیسر صاحب نے تمام کاغذات کو ایک جانب رکھا اور دفاتر میں رفقائے کار کے باہمی رویوں اور ان کے اثرات پر لیکچر دینا شروع کیا، پھر اچانک بولے:

''اوہ! ہم آپ کے ہم جماعت کو استفادے سے محروم کیوں رکھیں۔''

یہ کہہ کر ہال سے باہر آئے۔ وہ طالب علم جسے کچھ دیر پہلے کلاس سے نکال دیا تھا، باہر ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ پروفیسر صاحب اس کے پاس گئے۔ مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا اور واپس کمرے میں لے آئے۔ طالب علم اپنی نشست پر بیٹھا تو انھوں نے خندہ پیشانی سے کہا:

''شاید میں آپ پر بے وجہ ناراض ہوا تھا۔ دراصل میں ایک ذاتی پرابلم کی وجہ سے پریشان تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں نے کسی اور کا غصہ آپ پر نکالا۔ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً پڑھائی کے معاملے میں خاصے پُر جوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آ بسے ہیں۔ میں آپ کا اور آپ سب طلبہ کا شکر گزار

ہوں۔ یہ امر میرے لیے باعثِ فخر ہے کہ میں آپ جیسے محنتی طلبہ کو پڑھاؤں۔‘‘

پروفیسر صاحب اسی طرح طلبہ پر اظہارِ شفقت کرتے اور مسکراتے رہے، پھر انھوں نے چند نئے فارم اٹھائے اور مسکرا کر کہا: ’’آپ کا ہم جماعت یہ فارم پُر نہیں کر سکا۔ لگے ہاتھوں آپ سبھی یہ فارم دوبارہ بھر دیں تو کیسا رہے گا؟‘‘

یہ کہہ کر انھوں نے وہ فارم طلبہ میں بانٹ دیے۔ طلبہ نے فارم پر کر کے پروفیسر صاحب کو لوٹا دیے۔ پروفیسر صاحب نے پہلی بار بھرے ہوئے فارم اپنی میز کی دراز سے نکالے اور ان کا موازنہ دوسری بار بھرے ہوئے فارموں سے کیا۔ پہلے فارموں میں ’’کمزور‘‘ کے خانے پُر تھے، البتہ دوسرے فارموں میں سب نے ’’نمایاں‘‘ یا ’’عمدہ‘‘ کے خانے پُر کیے تھے۔

وہ ہنسے اور طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا: ’’جو کچھ آپ نے دیکھا وہ اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ بُرے طور اطوار اور بد اخلاقی کا منفی اثر دفتر کی فضا پر ضرور پڑتا ہے۔ آپ کے ہم جماعت سے میں نے جو رویہ اختیار کیا وہ مثال کے طور پر تھا۔ محض رویے کی تبدیلی سے میرے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر چند ساعتوں میں تبدیل ہو گیا۔‘‘

دراصل یہ انسان کی فطرت ہے، اس لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ خاص طور پر جن لوگوں کے ساتھ آپ کی ملاقات پہلی بار ہو رہی ہو اُن کے لیے آپ کا رویہ اور طرزِ عمل نہایت اہم ہوتا ہے۔ معلم اول محمد ﷺ پہلی ہی ملاقات میں لوگوں کے دل موہ لیا کرتے تھے۔

فتحِ مکہ کے بعد اسلام کو بالا دستی حاصل ہو گئی اور عرب قبائل کے وفود نبی ﷺ سے ملنے پے بہ پے مدینہ آنے لگے۔ وفود کے اس سلسلے میں عبدالقیس کا وفد بھی مدینہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں آتے دیکھا تو قبل اس سے کہ وہ اپنی سواریوں سے اتر کر آپ

کے پاس آتے، آپ نے دور ہی سے پہل کرتے ہوئے کہا:

”قوم کو مرحبا، تمھارے لیے یہاں نہ رسوائی ہے نہ شرمندگی۔“

انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے خیر سگالی کے یہ الفاظ سنے تو بہت خوش ہوئے۔ فوراً سواریوں سے چھلانگیں لگائیں اور آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپ کو سب سے پہلے سلام کرے۔

دورۂ مدینہ کے دوران ایک موقع پر عبدالقیس کے وفد نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے اور آپ کے درمیان قبیلۂ مضر کے مشرکین سے تعلق رکھنے والا ایک ذیلی قبیلہ آباد ہے۔ ہم آپ کے پاس حرمت کے مہینے ہی میں آ سکتے ہیں جب لڑائی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہمیں دین کی چند اچھی اچھی باتیں بتا دیجیے جن پر عمل پیرا ہو کر ہم جنت میں جائیں اور اپنی قوم کو ان کی طرف بلائیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

”میں آپ لوگوں کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے منع کرتا ہوں۔ میں آپ کو اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں اللہ پر ایمان لانا کیا چیز ہے؟“

انھوں نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔“

آپ نے فرمایا:

”اس امر کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا اور یہ کہ تم غنائم کا خمس دو۔“

”اور میں آپ کو چار باتوں سے روکتا ہوں: ”کدّو کے برتن، چوبیں برتن، سبز لاکھی گھڑے اور تارکول ملے برتن کی نبیذ سے۔“ [1]

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ہمراہ رات کے وقت محوِ سفر تھے۔ تا دیر چلتے رہے۔ اخیر رات میں راستے سے ہٹ کر آرام کرنے کے لیے پڑاؤ کیا۔ سب لوگ ایسے سوئے کہ سورج طلوع ہونے پر ہی آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ جاگے، پھر عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سرھانے بیٹھ گئے اور بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے حتی کہ آپ بھی بیدار ہو گئے۔ سورج ذرا بلند ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ نماز اختتام کو پہنچی تو آپ نے اپنا رخ نمازیوں کی طرف کیا۔ آپ کو ایک آدمی نظر آیا جو لوگوں سے الگ بیٹھا تھا۔ اس نے جماعت سے نماز ادا نہیں کی تھی۔ آپ نے اس سے دریافت کیا:

''اے بھائی! آپ نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟''

اس نے جواب دیا: ''مجھے جنابت ہوئی ہے اور پانی نہیں ملا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ زمین سے تیمّم کر لو۔ اس شخص نے تیمّم کر کے نماز ادا کی۔

اس کے بعد آپ نے صحابۂ کرام کو کوچ کا حکم دیا۔ اُن کے پاس پانی نہیں تھا۔ راستے میں اُنھیں شدید پیاس نے آلیا۔ تلاش کے باوجود کوئی کنواں، چشمہ یا جوہڑ نظر نہ آیا۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم یونہی پیاسے چلے جا رہے تھے کہ ایک شتر سوار عورت ملی۔ اس کے پاس پانی بھری دو مَشکیں تھیں۔

ہم نے اس سے پوچھا: ''پانی کہاں ہے؟''

''یہاں آس پاس کوئی پانی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمھارے گھر اور پانی کے درمیان کتنی مسافت ہے؟''

''ایک دن رات کی۔''

''اللہ کے رسول کے پاس چلو۔'' ہم نے مطالبہ کیا۔

اس نے قدرے حیرت سے کہا: ''اللہ کا رسول؟ اللہ کا رسول کیا ہوتا ہے؟''

ہم اُسے اپنے ساتھ لے آئے کہ ہمیں پانی کی جگہ بتائے گی۔ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے بھی اس عورت سے پانی کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو بھی وہی جواب دیا جو ہمیں دیا تھا، البتہ اس نے آپ سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ یتیم بچوں کی ماں ہے۔

آپ نے اس کی ایک مشک اتروائی اور اللہ کا نام لے کر مشک پر ہاتھ پھیرا، پھر آپ مشک سے ہمارے برتنوں میں پانی انڈیلنے لگے۔ ہم چالیس پیاسے آدمیوں نے پانی پیا اور سیر ہو کر پیا اور اپنے پاس موجود تمام مشکیں بھی لبالب بھر لیں، پھر ہم نے اس عورت کی مشکیں واپس اس کے اونٹ پر چڑھا دیں۔ وہ پہلے سے بھی بھرپور نظر آ رہی تھیں۔

بعد ازاں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آپ کے پاس (کھانے کی) جو چیزیں ہیں وہ لائیں۔''

آپ نے خاصی مقدار میں روٹی اور کھجور کے ٹکڑے ایک کپڑے میں باندھ کر اس عورت کے حوالے کیے اور فرمایا:

''یہ اپنے گھر والوں کے لیے لے جاؤ۔ ہم نے تمھارا پانی ذرّہ برابر کم نہیں کیا لیکن اللہ نے ہمیں پانی پلایا ہے۔''

وہ عورت خوشی خوشی اپنے اونٹ پر سوار ہوئی اور چل دی۔ گھر پہنچ کر اس نے سب کو بتایا: ''میں سب سے بڑے جادوگر کے ہاں سے ہو کر آئی ہوں، یا وہ نبی ہے اور اس کے پیروکاروں کا یہی خیال ہے۔''

قوم کو اس کا واقعہ سن کر نہایت تعجب ہوا، پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ عورت

اور اس کی قوم حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔[2]

ایک دن ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور آپ سے مال کا تقاضا کیا۔ نبی ﷺ نے اسے دو پہاڑیوں کے دامن میں چرتا ہوا بکریوں کا ایک ریوڑ عطا کیا۔ وہ واپس اپنی قوم کی طرف گیا اور کہا:

''میری قوم کے لوگو! مسلمان ہو جاؤ۔ محمد تو اس آدمی کی طرح (کھلم کھلا) عطا کرتے ہیں جو فاقے سے نہیں ڈرتا۔''[3]

انس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے:

''آدمی دنیا (اور اس کے مال و متاع) کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے ہاں آتا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد دینِ اسلام اسے دنیا و مافیہا سے زیادہ پیارا اور عزیز ہو جاتا۔''

مشورہ

''پہلی ملاقات کا تاثر آپ کی شخصیت کے کُل تاثر کا ستر فیصد ہوتا ہے، اس لیے پہلی ملاقات کے رویے کا تعین یہ سوچ کر کیجیے کہ یہ اس شخص سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات ہے۔''

---

1 صحیح البخاري، حدیث: 4368. 2 صحیح البخاري، حدیث: 3571، وصحیح مسلم، حدیث: 682. 3 صحیح مسلم، حدیث: 2312.

لوگوں کی فطرت زمین کے مانند ہے

لوگوں کے مختلف مزاج پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے مزاج کا یہ اختلاف زمین کے مزاج کے مختلف ہونے کی طرح ہے۔ بعض لوگ نرم اور سہل خو ہوتے ہیں اور بعض سخت کھردرے۔ کچھ لوگ بار آور اور زرخیز زمین کی طرح فراخ دل و فیاض ہوتے ہیں اور کچھ بنجر زمین کی صورت جہاں نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ سبزہ اگتا ہے، بخیل ہوتے ہیں۔

زمین کی مختلف انواع کے ساتھ انسان کا طرزِ عمل اُن کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ پتھریلی اور اونچی نیچی زمین پر انسان آہستہ خرامی اور احتیاط سے چلتا ہے جبکہ نرم اور ہموار زمین پر اطمینان سے بھاگا چلا جاتا ہے۔ لوگوں کا بھی یہی حال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ،فَجَاءَ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ، وَالْأَبْيَضُ، وَالْأَسْوَدُ، وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ، وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيثُ، وَالطَّيِّبُ»

”اللہ نے ساری زمین سے مٹھی بھر مٹی لی اور اس سے آدم پیدا کیا۔ اب آدم کے بیٹے زمین کے مطابق پیدا ہوئے ہیں۔ کوئی سرخ ہے تو کوئی سفید اور کوئی کالا ہے

اور کوئی ان کے درمیان درمیان ہے۔ کوئی نرم مزاج ہے تو کوئی درشت۔ کوئی خبیث ہے اور کوئی اچھا۔" [1]

لوگوں سے تعامل میں اس امر کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے، یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ لوگوں کے مزاج کا لازمی اثر اُن کے فیصلوں اور ارادوں پر پڑتا ہے۔ یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔

زندگی میں کبھی آپ کو خدانخواستہ ازدواجی معاملات میں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑ جائے تو اپنے ایسے ساتھی، دوست یا رفیقِ کار سے جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ سخت اور کھردرے مزاج کا مالک ہے، مشورہ کر کے دیکھیے۔ مثلاً آپ اس سے کہیں کہ میری بیوی بہت مسائل کھڑے کر رہی ہے۔ وہ میرا ذرہ برابر احترام نہیں کرتی۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

یقیناً اس کا جواب یہی ہوگا: "بیویاں صرف ڈنڈے کے بَل پر سیدھی رہتی ہیں۔ مرد بنو مرد۔ اس کا غرور خاک میں ملا دو اور ایسی پھینٹی لگاؤ کہ ساری عمر یاد رکھے۔"

آپ طیش میں آکر اس کی ہدایت پر عمل کریں گے اور اپنا ہنستا بستا گھر اُجاڑ بیٹھیں گے۔

اب یہی پرابلم اپنے اس دوست، ساتھی یا رفیقِ کار کے سامنے رکھیں جس کے متعلق معروف ہے کہ وہ نرم مزاج اور حساس دل کا مالک ہے۔

میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کی رہنمائی کچھ اس طرح کرے گا: "بھائی میرے! خیال کرنا، تمھاری بیوی صرف تمھاری بیوی ہی نہیں، تمھارے بچوں کی ماں بھی ہے۔ اور دنیا میں کون سا ایسا بندھن ہے جسے باہمی اختلافات اور مشکلات کا سامنا نہیں! تمھیں صبر اور برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جو بھی ہو وہ تمھاری زوجہ اور شریکِ حیات ہے۔ میرا تو

یہی مشورہ ہے۔ آگے تمھاری مرضی۔"

ملاحظہ کریں کہ آدمی کی طبیعت اس کے خیالات ونظریات اور فیصلوں پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قاضی کو غصے کی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع کیا ہے، اس لیے کہ غصہ اس کی نفسیات تبدیل کر کے اس کے فیصلے پر اثر ڈال سکتا ہے۔

اگلے وقتوں میں ایک قاتل ہو گزرا ہے جس نے ایک دو یا دس بیس نہیں، پورے ننانوے قتل کیے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ لوگوں کے انتقام سے کیونکر بچ پایا۔ شاید لوگوں پر اس کی دہشت اس حد تک طاری تھی کہ وہ اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے تھے یا وہ دشتوں صحراؤں میں چھپتا پھرتا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو، قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ اس نے ننانوے قتل کیے تھے۔

وہ اپنے کیے پر نادم ہوا اور توبہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے اڑوس پڑوس کے لوگوں سے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم کا پتا پوچھا۔ لوگوں نے اسے ایک عبادت گزار راہب کے بارے میں بتایا جو دن رات مصلّے پر کھڑا گریہ وزاری میں مصروف رہتا تھا۔ راہب تھا تو نرم مزاج لیکن تھوڑا جذباتی تھا۔ قاتل راہب کے ہاں اس کی خانقاہ میں گیا اور اس سے ملتے ہی کہا: "میں نے ننانوے قتل کیے ہیں۔ کیا میرے لیے توبہ کی کوئی سبیل ہے؟"

راہب جو ایک چیونٹی کے قتل کو بھی کبیرہ گناہ سمجھتا تھا، اس کا یہ سوال سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے جھر جھری لی اور چلا کر کہا:

"نہیں، تمھارے لیے کوئی توبہ نہیں، تمھارے لیے کوئی توبہ نہیں۔"

کم علم راہب سے جو فیصلہ کرتے وقت جذبات کو سامنے رکھے، اس سے زیادہ کیا

توقع کی جا سکتی تھی۔

قاتل جو ایک سخت مزاج اور درشت آدمی تھا، راہب کا یہ جواب سن کر طیش میں آ گیا۔ اس نے شعلہ بار نظروں سے راہب کی طرف دیکھا اور یکا یک اپنا خنجر نکال کر اس کے جسم میں اتار دیا اور تقریباً بھاگتا ہوا خانقاہ سے نکل گیا۔

چند دن گزرے اور قاتل کو ایک بار پھر توبہ کا خیال آیا۔ اس نے کسی بڑے عالم کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے اسے ایک عالم کا پتا بتایا۔ وہ پیدل ہی اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب اس کا عالم سے سامنا ہوا تو اسے ایک معاملہ فہم آدمی نظر آیا جسے علم کے وقار نے بارعب اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ قاتل نے جرأت مندانہ عرض کی: ''میں نے سو قتل کیے ہیں۔ کیا میرے لیے توبہ کی کوئی راہ ہے؟''

عالم نے فوراً جواب دیا: ''سبحان اللہ! تمھارے اور توبہ کے درمیان کون رکاوٹ بن سکتا ہے؟'' یہ ایک عمدہ جواب تھا۔ واقعی اس کے اور توبہ کے درمیان کون رکاوٹ بن سکتا تھا۔ ربِّ ارض و سما کے دربار میں حاضر ہو کر گریہ وزاری اور عاجزی کرنے سے اسے کون روک سکتا تھا۔

عالم نے جو علم و شریعت کی بنا پر فیصلہ کرتا تھا نہ کہ اپنے جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''لیکن تم بدکرداروں کے علاقے میں رہتے ہو۔ تم فلاں شہر چلے جاؤ۔ وہاں کے لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ کی عبادت کرنا۔''

وہ آدمی تائب ہو کر سرشاری کے عالم میں چل پڑا۔ لیکن منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت نے آ لیا۔ اس کی روح وصول کرنے رحمت اور عذاب کے فرشتے نازل ہوئے۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا: ''یہ آدمی توبہ تائب ہو کر آیا تھا۔'' اس پر عذاب کے

فرشتوں نے اعتراض کیا: ''اس نے کبھی بھلائی کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔''

اللہ نے ان کی جانب ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں بھیجا جس نے ان کے اختلاف کا یہ حل نکالا کہ دونوں شہروں کی درمیانی زمین ماپی جائے۔ وہ جس شہر کے قریب ہوا اسی کے باشندوں میں شمار کیا جائے گا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے نیکوکاروں کے شہر کو حکم دیا کہ تم میرے اس بندے کے قریب آجاؤ اور معصیت کاروں کے شہر سے کہا کہ تم میرے بندے سے دور ہو جاؤ، چنانچہ نیکوکاروں کے شہر کے قریب پا کر رحمت کے فرشتے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔[2]

آپ نے کئی ایک مفتی صاحبان کا مشاہدہ کیا ہو گا جو مسائل شرعیہ میں فتویٰ صادر کرتے وقت جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔

میرا پڑوسی اپنی بیوی سے ہمیشہ جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن اُن کے اختلاف نے شدت اختیار کی اور اس نے بیوی کو ایک طلاق دے دی، پھر رجوع کر لیا۔ دوبارہ جھگڑا ہوا، اس نے پھر ایک طلاق دی اور بعد میں رجوع کر لیا۔ میں اس سے جب بھی ملتا اسے سمجھاتا کہ تمھارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، ان کا خیال کون رکھے گا۔ میں اسے یہ بھی یاد دلاتا رہتا کہ اب ایک آخری طلاق باقی ہے۔ یہ طلاق بھی تم دے بیٹھے تو تمھاری بیوی تمھارے لیے حلال نہیں رہے گی، الاّ یہ کہ وہ کسی اور آدمی سے نکاح کرے، پھر وہاں سے طلاق ہو، اس لیے خدا کا خوف کرو اور اپنا گھر برباد نہ کرو۔

لیکن افسوس اس نے میری کسی ہدایت پر کان نہیں دھرا۔ ایک روز وہ میرے ہاں آیا۔ اس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ کہنے لگا: ''یا شیخ! آج پھر جھگڑا ہوا اور میں نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دی۔'' اس کی یہ بات مجھے عجیب نہیں لگی۔ لیکن جب اس نے کہا کہ آپ کسی ایسے مفتی کو جانتے ہیں جو مجھے اس بار بھی رجوع کرنے کا فتویٰ دے سکے تو اس کا یہ سوال

سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے اس کی حالت پر غور کیا تو اسی نتیجے میں پہنچا جس کے متعلق میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ بہت سے لوگ زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت اپنے جذبات اور مزاج سے اثر لیتے ہیں۔ بعض افراد جن کے متعلق آپ کو علم ہے کہ وہ پیسے سے پیار کرتے ہیں، انھیں اہلِ ثروت کے آگے جھکتے ہوئے دیکھ کر آپ کو چنداں حیرت نہیں ہو گی۔ وہ اپنے گھر اور اہل وعیال کی ضروریات نظر انداز کر کے مال جمع کریں گے، کنجوسی سے کام لیں گے اور زندگی کے ہر معاملے میں اپنے اسی لالچی مزاج کے تابع ہو کر راستے کا تعین کریں گے۔

آپ کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے تو سب سے پہلے یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ لوگ مال کے پجاری ہیں اور کوشش کیجیے کہ تعامل کے دوران اُن کے مزاج کی یہ خاص کیفیت آپ کے پیشِ نظر رہے۔

رسول اللہ ﷺ کا لوگوں سے تعامل ان کے مزاج کے موافق ہوتا تھا۔ آپ اسلامی لشکر کے ہمراہ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اسلامی فوجوں کے مکہ میں داخل ہونے سے قبل رسول اللہ ﷺ سے ملے اور اسلام لے آئے۔ طویل روایت ہے جس میں سے قابلِ ذکر یہ ہے کہ جب ابوسفیان ایمان لے آئے تو عباس رضی اللہ عنہ نے درخواست کی: ''اے اللہ کے رسول! ابوسفیان اعزاز پسند آدمی ہے۔ اسے کوئی اعزاز دے دیجیے۔''

آپ نے فرمایا:

''ہاں، ٹھیک ہے۔ جو ابوسفیان کے گھر چلا جائے اسے امان ہے۔ جو اپنا دروازہ بند کر لے اسے بھی امان ہے۔ اور جو مسجد میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔''[3]

ابوسفیان مکہ جانے کے لیے واپس ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی جانب دیکھا کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں قریش کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔

یہ وہی ہے جس نے کئی معرکوں میں قریش کی قیادت کی اور جس نے جنگوں کو اور جنگوں نے اسے پیس کر رکھ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اِس نومسلم قائد کو اسلام کی قوت دکھانا چاہی۔

آپ نے عباس رضی اللہ عنہ سے کہا:

''عباس! ابوسفیان کو وادی کی تنگنائے میں پہاڑ کے دہانے پر روک رکھیں تاکہ وہ وہاں سے گزرنے والی خدائی فوجوں کو دیکھ سکے۔''

عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو ساتھ لیا اور وادی کی تنگنائے میں کھڑے ہو گئے جہاں اسلامی لشکر کے دستے سیلاب کی مانند امڈے چلے آرہے تھے۔ قبائل اپنے اپنے پھریرے لیے گزر رہے تھے۔ پہلا قبیلہ گزرا تو ابوسفیان نے پوچھا: ''یہ کون لوگ ہیں؟''

عباس نے جواب دیا: ''یہ بنوسُلَیم ہیں۔''

انھوں نے کہا: ''مجھے سلیم سے کیا واسطہ!''

پھر ایک اور دستہ گزرا، ابوسفیان نے اس کے بارے میں پوچھا تو عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا:

''یہ مزینہ کا قبیلہ ہے۔''

انھوں نے کہا: ''مجھے مزینہ سے کیا مطلب!''

جو بھی قبیلہ گزرتا ابوسفیان رضی اللہ عنہ عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق استفسار کرتے، عباس خبر دیتے تو ہر بار یہی کہتے: ''مجھے فلاں قبیلے سے کیا تعلق!''

رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار کے سبز دستے کے جلو میں گزرے جنھوں نے اپنے

جسم لوہے سے ڈھانپ رکھے تھے اور لوہے کی ایک باڑھ سی گزرتی دکھائی دے رہی تھی۔

ابوسفیان نے بے اختیار پوچھا: ''سبحان اللہ! عباس یہ کون لوگ ہیں؟''

عباس نے جواب دیا: ''یہ مہاجرین وانصار کے جلو میں رسول اللہ ﷺ ہیں۔''

انھوں نے کہا: ''یہ سرخ موت ہے۔ کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہیں۔''

''ابوالفضل! تمھارے بھتیجے کی بادشاہت تو واللہ زبردست ہوگئی۔''

''ابوسفیان، یہ نبوت ہے نبوت۔'' عباس نے وضاحت کی۔

''ہاں! اب تو یہی کہا جائے گا۔'' ابوسفیان نے اثبات میں سر ہلایا۔

گھوڑ سوار دستے گزر چکے تو عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اب جلدی سے اپنی قوم کے پاس جاؤ۔''

ابوسفیان بھاگم بھاگ مکہ پہنچے اور بلند آواز سے کہا: ''اے مَعْشَرِ قریش! یہ محمد ﷺ ہیں۔ تمھارے پاس اتنا لشکر لے کر آئے ہیں کہ تم میں مقابلے کی طاقت نہیں، اس لیے جو ابوسفیان کے گھر آجائے اسے امان ہے۔''

لوگوں نے کہا: ''اللہ تجھے مارے! تیرا گھر ہمارے کتنے آدمیوں کے کام آئے گا؟''

ابوسفیان نے اعلان جاری رکھا: ''اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے اسے بھی امان ہے۔ اور جو مسجد میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔''

لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے یا مسجد میں چلے گئے۔[4]

رسول اللہ ﷺ کی معاملہ فہمی دیکھیے کہ آپ نے ابوسفیان سے اس کے مزاج کے مطابق سلوک کیا۔

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آپ جس شخص سے بات کرنا چاہتے ہیں پہلے اس کی افتادِ طبع اور نفسیات کے متعلق معلومات بہم پہنچائیے۔ یوں آپ کو یہ اندازہ

کرنے میں آسانی رہے گی کہ اس شخص سے بات چیت کا کون سا طریقہ مناسب ہے۔

غزوۂ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ مہاجرین وانصار اور عرب کے دیگر حلیف قبائل کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کی تعداد 1400 تھی۔ ہدی کے جانور ساتھ تھے اور انھوں نے عمرے کا احرام باندھ رکھا تھا تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ مسلمان بیت اللہ کی زیارت کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہدی کے جانوروں میں رسول اللہ ﷺ کے ستر اونٹ بھی تھے۔ مسلمان مکہ پہنچے تو قریش نے اُنھیں شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ سے کچھ دور واقع ایک مقام حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔

قریش نے مذاکرات کے لیے اپنے آدمی بھیجنا شروع کیے۔ ان کا پہلا سفیر مکرز بن حفص تھا جو تعلق تو قریش سے رکھتا تھا لیکن عہد کی پاسداری کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ وہ ایک بدکار و بدعہد آدمی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آتے دیکھا تو کہا:

''یہ بدعہد آدمی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے مکرز سے اس کا مزاج ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے۔ ہم صرف عمرے کی نیت لے کر آئے ہیں۔ آپ نے اسے کوئی وثیقہ لکھ کر نہیں دیا۔ آپ جانتے تھے کہ یہ اس کا اہل نہیں ہے۔ مکرز بن حفص اپنا سامنہ لے کر بغیر کسی نتیجے کے جیسے آیا تھا ویسے لوٹ گیا۔ اب قریش نے سید الاحابیش حُلَیس بن علقمہ کو قلمدانِ سفارت تھمایا اور رسول اللہ ﷺ سے مذاکرات کرنے بھیجا۔ احابیش عرب کی ایک قوم تھی جو حرم کعبہ کی تعظیم کی خاطر مکہ میں آباد ہو گئی تھی اور قریش سے اس کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حلیس بن علقمہ کو دیکھا تو فرمایا:

''اس آدمی کا تعلق ایسی قوم سے ہے جو قربانی کے جانوروں کی بے حد تعظیم کرتی ہے، اس لیے ہدی کے جانور اس کے سامنے کھڑے کر دو کہ وہ انھیں (اچھی

طرح) دیکھ لے۔"

حُلیس نے قلادے پہنے، حرم میں ذبح کے لیے تیار، بھوک اور پیاس کے ستائے ہوئے قربانی کے اونٹ اور بکریوں کے ریوڑ دیکھے جو وادی میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر کانپ اُٹھا اور رسول اللہ ﷺ سے ملے بغیر قریش کے پاس واپس چلا گیا۔ اس نے کہا کہ ایسے لوگوں کو کیونکر بیتِ حرام میں آنے سے روکا جا سکتا ہے جو عمرے کی غرض سے آئے ہیں۔

قریش نے اسے ڈانٹ دیا: "ارے، بیٹھ جاؤ، تم اعرابی ہو، تمھیں کیا معلوم؟"

اس پر حُلیس کو تاؤ آ گیا۔ اس نے کہا: "اے معشرِ قریش! ہم نے اس بات پر تم سے عہد نہیں باندھا تھا نہ اس ظلم پر تمھارے حلیف بنے تھے۔ کیا جو لوگ بیت اللہ کی عظمت دلوں میں بسائے اس کی زیارت کو آئے ہیں انھیں بیت اللہ میں آنے سے روکا جائے گا؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے! تم محمد کے راستے میں نہیں آؤ گے یا پھر میں احابیش کے ہمراہ تم پر ہلا بول دوں گا۔"

قریش نے جواب دیا: "تم خاموش رہو۔ ہمیں اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔" پھر انھوں نے کسی بڑے آدمی کو بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے عروہ بن مسعود ثقفی کا انتخاب کیا گیا۔

عروہ نے کہا: "اے معشرِ قریش! تم نے محمد کی طرف سے ناکام واپس آنے والوں سے جو بدسلوکی کی وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری اولاد اور تم میرے والد کی جگہ ہو۔"

لوگوں نے جواب دیا: "تم نے سچ کہا۔ تم ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد ہو۔"

عروہ جو اپنی قوم میں سردار مانا جاتا تھا اور اُن کے درمیان اس کی بڑی قدر و منزلت

تھی، روانہ ہوا، رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا اور آپ کے روبرو بیٹھ کر بولا: ”محمد! تم ان اوباشوں کو اکٹھا کر کے یہاں لے آئے ہو تاکہ ان کی مدد سے یہ شہر فتح کر لو؟ تم کیا سمجھتے ہو؟ یہ قریش ہیں قریش! اُنھوں نے تمھارے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے اور جوان اونٹوں پر سوار اپنے بال بچوں سمیت نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اللہ سے عہد باندھا ہے کہ اس شہر میں کوئی زبردستی داخل نہیں ہو سکے گا۔ اور اللہ کی قسم! گویا میں تمھارے ان ہجولیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ کل یہ تمھیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔“

ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے عقب میں کھڑے تھے۔ عروہ کی یہ بات سن کر وہ طیش میں آگئے اور کہا: ”جا، جا کر لات کی شرمگاہ چاٹ، کیا ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے!“

یہ تیز اور تیکھا جواب سن کر اپنی قوم کا بادشاہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ ایسے جواب سننے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن اس کے سَر میں سمائے ہوئے غرور کو توڑنے کے لیے ایسے ہی جواب کی ضرورت تھی۔

عروہ منہ کی کھا کر ڈگمگایا، پھر ذرا ہوش میں آیا تو جواب دینے والے کے متعلق پوچھا: ”محمد! یہ کون ہے؟“

”یہ ابن ابی قحافہ ہیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے بتایا۔

اس نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا: ”تمھارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا تو میں اس بات کا تمھیں ضرور جواب دیتا۔ لیکن یہ اس احسان کا بدلہ سمجھو۔“

اس کے بعد عروہ نے سخت الفاظ استعمال نہیں کیے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کے دوران آپ کی داڑھی چھونے لگا۔ مغیرہ بن شعبہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے جو سر سے پیروں تک آہنی لباس پہنے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے، تلوار کی نوک سے اس کا ہاتھ

پرے کیا۔ عروہ نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر اللہ کے رسول کی داڑھی چھونے کی کوشش کی تو مغیرہ بن شعبہ نے دوبارہ تلوار کی نوک سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ تیسری بار اس نے ہاتھ بڑھایا تو مغیرہ نے کہا: ''اپنا ہاتھ نبی ﷺ کے چہرے سے پرے رکھو، اس سے پہلے کہ تمھارا ہاتھ تم تک واپس نہ پہنچے۔''

عروہ نے کہا: ''تمھارا برا ہو۔ تم کتنے درشت اور سنگ دِل ہو!''

''محمد! یہ کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

اللہ کے رسول نے مسکرا کر جواب دیا:

''یہ آپ کا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔''

اس پر عروہ نے کہا: ''ارے او پیمان شکن! ابھی کل ہی تو تم نے اپنی شرمگاہ دھونا سیکھی ہے۔''

عروہ تھوڑی دیر اور رُکا، پھر قریش کے پاس لوٹ آیا۔ اس نے قریش کے سرکردہ افراد سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے مَعْشَرِ قریش! واللہ! میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔ واللہ! میں نے ایسا کوئی بادشاہ نہیں دیکھا جس کے رفقاء اس کی اسی طرح تعظیم کرتے ہوں جس طرح محمد (ﷺ) کے اصحاب محمد کی تعظیم کرتے ہیں۔''

یہ سُن کر قریش کے دلوں میں ایسا رُعب پڑا کہ اس سے قبل اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اب قریش نے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ ﷺ کی طرف حدیبیہ بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آتے دیکھا تو فرمایا:

''تمھارا معاملہ کچھ سہل ہو گیا۔''

پھر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان عہد نامہ طے پا گیا۔ [5]

رسول اللہ ﷺ لوگوں کی مختلف طبائع کا خیال رکھتے اور ان سے تعامل کے سلسلے میں مناسب ترین انداز اختیار کرتے تھے۔ سیرتِ طیبہ کے اس پہلو کی ادنیٰ سی جھلک اوپر بیان کردہ صلح حدیبیہ کے اس واقعے میں آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا اندازہ ان سے بات چیت کے دوران بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ایک بار میں نے خطبۂ جمعہ میں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بیان کیا۔ جب میں وہ کیفیت بیان کرنے لگا کہ ابولؤلؤ مجوسی خلیفۃ المسلمین پر کیسے حملہ آور ہوا تو میں نے آواز کو ذرا بلند کر کے کہا: ''پھر اچانک ابولؤلؤ محراب کی ایک جانب سے نمودار ہوا اور عمر رضی اللہ عنہ پر خنجر کے پے در پے تین وار کیے۔ پہلا وار سینے پر، دوسرا پیٹ میں اور پھر اس نے اپنی باقی ماندہ قوت جمع کر کے زیرِ ناف تیسرا وار کیا اور خنجر کھینچا تو آپ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں۔''

میں لوگوں کے چہروں پر تاثرات پڑھنے لگا۔ چند نے تو ایک دم آنکھیں میچ لیں گویا یہ سب کچھ اُن کے سامنے ہو رہا ہے۔ کچھ رو پڑے اور کچھ بغیر کسی تاثر کے یوں سنتے رہے جیسے سونے سے پہلے کہانی سُن رہے ہوں۔

لوگوں میں ایسے افراد بڑی تعداد میں ہیں جو نہایت کند ذہن ہوتے ہیں، وہ نہ اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور نہ سامعین کا دِل دُکھانے سے باز رہتے ہیں۔

لوگوں کی اسی صنف سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب بھری محفل میں کسی تاجر کے ساتھ اپنا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ درمیان میں کہنے لگے: ''یہ تاجر گدھے جتنا بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ بالکل خالد کی طرح۔'' یہ کہہ کر انھوں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آدمی جو گدھے جیسا نظر آتا تھا، خالد کے مشابہ کیونکر ہوا۔

اختتام سے قبل ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا اپنے مزاج کو اس حد تک تبدیل کر لینا ممکن

ہے کہ وہ دوسرے کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جائے؟

جواب ہے کہ جی ہاں، بالکل، ایسا ممکن ہے۔

امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں معروف تھا کہ اُن کے مزاج میں سختی اور شدت پائی جاتی ہے۔ ایک دن کسی آدمی کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ مسئلے کے حل کے لیے عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنے آیا۔ جب وہ امیر المومنین کے دروازے پر پہنچا اور دستک دینی چاہی تو اندر سے عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کی آواز آئی جو چلاّ رہی تھیں اور عمر خاموشی سے سن رہے تھے۔

آدمی کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ پلٹنے لگا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر آہٹ محسوس کی تو باہر آئے اور اس آدمی کو آواز دے کر پوچھا: ''تمھارا کیا مسئلہ ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین! میں آپ کے پاس اپنی بیوی کی شکایت لے کر آیا تھا۔ لیکن جب دیکھا کہ آپ کی بیوی آپ کو جھڑک رہی ہے تو واپس جانے لگا ہوں۔''

اس پر امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''بھائی میرے! یہ میری بیوی ہے۔ میری ازدواجی ضرورت پوری کرتی ہے۔ میرے لیے کھانا بناتی ہے۔ میرے کپڑے دھوتی ہے۔ تو کیا میں اس کی معمولی تلخ کلامی بھی برداشت نہ کروں؟''[1]

اس کے باوجود بعض لوگوں کی بد مزاجی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ ایسے لاعلاج افراد سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور اپنے آپ کو ان کے تقاضے کے مطابق ڈھالنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ بعض نوجوانوں نے مجھ سے اپنے والد کے سخت رویے کی شکایت کی۔ میں نے علاج سمجھایا۔ ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ سارے طریقے آزمائے لیکن بے سود!

پھر اس مشکل کا حل کیا ہے؟

میرے نزدیک اس مسئلے کا حل صرف اور صرف صبر ہے۔ ایسے انسان کی بدمزاجی کو صبر سے برداشت کیا جائے۔ اس کی خوبیوں پر نظر رکھی جائے اور خامیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ حالات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش جاری رکھی جائے، اس لیے کہ بعض مسائل کا کوئی حل نہیں ہوتا۔

نتیجہ

''جس شخص سے آپ کا میل جول ہے، اس کا مزاج سمجھ لینا آپ کی مشکلات میں کمی کا باعث ہوسکتا ہے۔''

---

1 سنن أبي داود، حديث:4693، وجامع الترمذي، حديث:2955. 2 صحيح مسلم، حديث: 2766. 3 صحيح مسلم، حديث: 1780، و مسند أحمد: 538/2. 4 السيرة النبوية لابن هشام:46:4. 5 صحيح البخاري، حديث:2732,2731.

6 یہ روایت ہمیں نہیں ملی۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی رسّی

وہ ہائر سیکنڈری اسکول کے آخری سال کے طلبہ کو ریاضی کا مضمون پڑھاتا تھا۔ وہ چند دنوں سے بعض طلبہ کو نوٹ کر رہا تھا کہ اُن کا سبق میں دھیان نہیں رہا اور وہ بدمحنت ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے اُن طلبہ کا قبلہ درست کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دن وہ اپنا پیریڈ لینے کمرۂ جماعت میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہی کہا: ''تمام طلبہ کتابیں ایک طرف رکھیں اور کاغذ قلم نکال لیں۔''

طلبہ نے پوچھا: ''کیوں، جناب؟''

''ٹیسٹ، ہنگامی ٹیسٹ۔'' استاد نے پُر جوش انداز میں کہا۔

طلبہ پہلے تو ذرا تنگ پڑے، پھر کھسر پُھسر کرتے ہوئے استاد صاحب کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔ طلبہ میں بڑے ڈیل ڈول کا ایک بے وقوف طالب علم بھی تھا جو نہایت بدمزاج، اکھڑ اور غصیلا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا:

''جناب! ابھی ہم ٹیسٹ نہیں دینا چاہتے۔ پہلے ہم اگلے پچھلے اسباق دہرا لیں، پھر آپ خوشی سے ٹیسٹ لیجیے گا۔ جب ہمیں کچھ یاد نہیں تو ٹیسٹ کس چیز کا دیں گے؟''

استاد صاحب اس کی یہ بات سن کر اشتعال میں آگئے۔ انھوں نے شعلہ بار ہو کر کہا: ''تمھاری مرضی نہیں چلے گی۔ ٹیسٹ ہر حال میں دینا پڑے گا۔ سمجھے؟! تم ٹیسٹ نہیں دینا

چاہتے تو کلاس سے نکل جاؤ۔"

اس پر طالب علم بھی طیش میں آ گیا۔

"آپ باہر نکل جائیں۔" اس نے بلند آواز سے کہا۔

استاد صاحب اس کا گستاخانہ پن دیکھ کر سٹپٹا اٹھے۔ وہ طالب علم کو کوستے ہوئے اس کی جانب بڑھے: "او بے ادب، ارے او بے حیا، گستاخ، کمینے، بے غیرت.........."

طالب علم بھی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ طالب علم اور استاد دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ بات انتظامیہ تک پہنچی۔ انھوں نے سزا کے طور پر طالبِ علم کو دو سال پیچھے کر دیا اور تحریری بیان لیا گیا کہ آئندہ وہ اساتذہ کا احترام ملحوظ رکھے گا۔

یہ تو طالب علم کا انجام تھا۔ استاد صاحب اس کے بعد ہر چھوٹے بڑے کی گفتگو کا موضوع بن گئے۔ جماعتوں میں ان پر تبصرے کیے جانے لگے۔ انھوں نے اس صورت حال سے تنگ آ کر وہ اسکول چھوڑ دیا۔

ایک اور استاد کو بھی یہی مشکل پیش آئی۔ تاہم اس نے نہایت خوش اسلوبی سے مسئلے کا حل نکال لیا۔ اس نے بھی ایک دن کلاس میں آ کر اچانک حکم صادر کیا: "سب طلبہ کاغذ قلم نکالیں۔ ٹیسٹ ہوگا۔"

یہاں بھی ایک طالب علم موجود تھا جو ہٹ دھرم اور تند مزاج تھا۔ اس نے چیخ کر کہا:

"جناب! آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔ ٹیسٹ اپنے وقت پر ڈسپلن کے مطابق ہوگا۔"

استاد صاحب جو حوصلے کا پہاڑ تھے، جانتے تھے کہ مشتعل مزاج آدمی سے سختی کے ساتھ نمٹنا بے وقوفی ہے۔ وہ مسکرائے اور طالبِ علم کی طرف دیکھ کر کہا: "مطلب یہ کہ آپ ٹیسٹ نہیں دینا چاہتے۔"

وہ پھر چلایا: ''نہیں۔''

استاد صاحب نہایت اطمینان سے بولے: ''ٹھیک ہے۔ جو ٹیسٹ نہیں دینا چاہتا ہم اُس سے ڈسپلن کے مطابق پیش آئیں گے۔''

لڑکو تم لکھو: پہلا سوال: حسب ذیل مساوات کا نتیجہ لکھیں:

$$15+a=y+x$$

یوں استاد صاحب سوال لکھوانے لگے۔ ضدی طالب علم سے نہ رہا گیا۔ وہ طیش میں آ کر بولا: ''میں نے آپ سے کہا ہے کہ میں ٹیسٹ نہیں دینا چاہتا۔''

استاد صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے اور کہا:

''آپ سے ٹیسٹ لے کون رہا ہے؟ آپ آزاد ہیں۔ ہم آپ سے امتحان نہیں لیتے۔''

اب مزید بھڑکنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ طالب علم سکون سے بیٹھ گیا، پھر اس نے کاغذ قلم نکالا اور اپنے ہم جماعتوں کی طرح وہ بھی سوال لکھنے لگا۔ بعد میں انتظامیہ کی طرف سے اس طالب علم کی بدمزاجی پر مواخذہ بھی کیا گیا۔

یہ فرضی واقعہ میرے ذہن میں آیا تو میں نے سوچا کہ اس جیسی پیچیدہ صورتِ حال سے نمٹنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں غصے کی آگ بھڑکانے اور اسے ٹھنڈا کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگا۔ یہ واقعہ ہے کہ مشتعل مزاج آدمی کو آڑے ہاتھوں لینے کا نتیجہ خطرناک ہوتا ہے اور اس سے اختلاف بجائے کم ہونے کے، شدت اختیار کر جاتا ہے۔ آگ کا مقابلہ آگ سے کیا جائے یا آگ کو آگ سے بجھانے کی کوشش کریں تو شرارے بڑھتے اور آگ کی لپٹ میں تیزی ہی آتی ہے۔ اور سرد مہری کے مقابلے میں بھی سرد مہری ہو تو الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس لیے لوگوں سے آپ کا سبھاؤ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی رسّی کے مانند ہونا چاہیے۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ بیس برس امیر (گورنر) کے عہدے پر فائز رہے، پھر آپ کو خلیفہ ہوئے بھی بیس برس ہونے کو ہیں۔ اتنا لمبا عرصہ آپ نے لوگوں پر حکومت کی، اس کا راز آخر کیا ہے؟ وہ کیا طریقہ ہے جسے اپنا کر آپ اتنے برس حکمران رہے؟
وہ کہنے لگے: ''میرے اور رعایا کے درمیان ایک رسّی ہے جس کا ایک سرا میرے ہاتھ میں اور دوسرا ان کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ اُدھر سے رسّی کھینچتے ہیں تو میں اِدھر سے ڈھیلی کر دیتا ہوں تاکہ رسّی ٹوٹنے نہ پائے اور جب وہ اُدھر سے ڈھیل دیتے ہیں تو میں ادھر سے رسّی کھینچ دیتا ہوں۔''[1]

معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ طریقہ واقعی لاجواب تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دو مشتعل مزاج میاں بیوی کبھی پُرسکون زندگی نہیں گزار سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ دو مغلوب الغضب آدمیوں کی دوستی زیادہ دیر قائم رہ سکے۔

ایک بار میں نے جیل میں لیکچر دیا۔ لیکچر کا اہتمام خاص طور پر قتل کے مجرمان کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکچر اختتام کو پہنچا تو سب لوگ اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے۔ ایک آدمی شکریہ ادا کرنے میری طرف آیا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ مجرمانِ قتل کے اس سیکشن میں تعلیمی سرگرمیوں کا نگران ہے۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ قتل کی زیادہ تر وارداتوں کے پیچھے اصل محرّک کیا ہوتا ہے؟

اس نے بلا توقف جواب دیا: ''غصہ۔''

''واللہ! یا شیخ! ان میں سے بعض قاتلوں نے شاپنگ سنٹر یا گیس اسٹیشن پر چند روپوں کی خاطر غصے میں آ کر قتل کا ارتکاب کیا ہے۔''

اس کی اس بات پر مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یاد آ گئی۔ آپ نے فرمایا تھا:

«لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ

الْغَضَبِ»

’’طاقتور وہ نہیں جو ہر ایک کو پچھاڑ دے۔ طاقتور دراصل وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔‘‘[2]

جی ہاں! بہادر وہ نہیں جو قوی ہیکل اور عظیم الجثہ ہو اور جس سے بھی لڑے اسے نیچا دکھا دے، بلکہ بہادر وہ ہے جو یہ جانتا ہو کہ پیچیدہ صورتِ حال سے کیونکر نمٹنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَقْضِ الْقَاضِي بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ»

’’قاضی دو آدمیوں کے درمیان غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔‘‘[3]

آپ نے حکم دیا ہے کہ مسلمان اپنے نفس کو تحمل اور برداشت کا خوگر بنائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّمَا الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ»

’’برداشت، برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔‘‘[4]

جی ہاں! پہلے پہل آپ غصے پر قابو پائیں گے تو آپ کو سو فیصد محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن دوسری، تیسری اور پھر چوتھی بار آپ کا زور بہت کم لگے گا اور آپ منٹوں میں غصے پر قابو پا لیں گے۔ یوں آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی اور تحمل و برداشت آپ کی فطرت کا حصہ بن جائیں گے۔

غصے کے متعلق ایک لطیفہ میں قارئین کی نذر کرنا چاہوں گا۔

ایک دن میں جدّہ کے شمال میں 600 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک شہر املج میں لیکچر دینے کے لیے گیا۔ سامعین میں ایک نوجوان بہت غصیلا اور مشتعل مزاج تھا۔ اس کے متعلق مجھے پتا چلا کہ ایک بار وہ کار پر سفر کر رہا تھا۔ کار کی رفتار آہستہ تھی۔ پیچھے سے ایک تیز

رفتار گاڑی ہارن بجاتی ہوئی آئی۔ نوجوان نے راستہ دینے کے بجائے گاڑی کی رفتار مزید آہستہ کر دی اور پچھلی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم بھی اپنی رفتار آہستہ کرو۔ پچھلی گاڑی والے نے تنگ آ کر گاڑی سڑک سے اتاری اور تیزی سے آگے گزر گیا۔ اس کی اس جرأت پر نوجوان بھڑک اٹھا۔ اسے تو معمولی باتوں پر بھی شدید غصہ آجایا کرتا تھا۔ اپنی اس قدر توہین وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور قریب پہنچ کر گاڑی کی بتیوں سے اشارے کیے۔ اُنھوں نے گاڑی روک دی۔ نوجوان نے اپنا غترہ (روایتی کپڑا جسے عرب سر پر اوڑھتے ہیں) ایک طرف پھینکا اور لوہے کا پانا تھامے نہایت غصے کے عالم میں اس گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے دروازے کھلے اور اس میں سے تین ہٹے کٹے جوان برآمد ہوئے۔ انھوں نے نوجوان کو لڑائی کے لیے تیار ہو کر آتے دیکھا تو مشتعل ہو کر اس کی طرف بھاگنے لگے۔ نوجوان تین دیوہیکل آدمیوں کو اپنی طرف دوڑتے دیکھ کر کانپ اٹھا۔ وہ تینوں اس کے قریب آئے اور ہاتھ میں پکڑے پانے کو گھورنے لگے۔ نوجوان نے جلدی سے پانے والا ہاتھ اٹھایا اور عاجزی سے کہا: "معاف کیجیے گا۔ آپ کا پانا گر گیا تھا۔" ان میں سے ایک نے جھپٹ کر پانا اس کے ہاتھ سے لیا اور تینوں اپنی گاڑی کی طرف مڑ گئے۔ وہ نوجوان اُنھیں ہاتھ ہلا کر الوداع کہتا رہ گیا۔

مساوات

مشتعل + مشتعل = دھماکا

---

1 یہ روایت ہمیں نہیں ملی۔ 2 صحيح البخاري، حديث: 6114، وصحيح مسلم، حديث: 2609. 3 سنن أبي داود، حديث: 3589، وسنن ابن ماجة، حديث: 2316، وجامع الترمذي، حديث: 1334. 4 شعب الإيمان للبيهقي: 398/7، ومجمع الزوائد: 128/1. یہ ابو داود کی موقوف حدیث ہے، سند صحیح ہے۔ تاریخ دمشق میں مرفوعاً آئی ہے لیکن سند ضعیف ہے۔

نفسیات کا لحاظ

زندگی میں انسان کو مختلف قسم کے حالات پیش آتے ہیں۔ خوشی غمی، تندرستی، صحت اور بیماری، امیری غریبی اور ثبات واضطراب کی بدلتی صورتیں حیاتِ انسانی کا لازمہ ہیں۔ انسانوں کی طبائع کا اختلاف بھی فطری حقیقت ہے۔ زندگی کے نشیب وفراز میں پیش آمدہ مسائل کا سامنا بھی سب انسان اپنی اپنی شعوری حالتوں کے مطابق کرتے ہیں۔ لوگوں سے بات چیت یا ان سے معاملہ طے کرنے کے سلسلے میں ان کی نفسیات اور ذاتی احساسات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

فرض کریں ایک عورت جس کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے، اسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ وہ فیصلہ کرتی ہے کہ اب اپنے بھائی کے ساتھ ان کے گھر میں رہے گی۔ صبح سویرے اس کی پڑوسن اسے ملنے آتی ہے۔ وہ عورت اسے خوش آمدید کہتی اور قہوہ یا چائے پیش کرتی ہے۔ پڑوسن سوچتی ہے کہ کیا بات چھیڑے۔ مطلقہ عورت اس سے پوچھتی ہے: ''کل میں نے آپ لوگوں کو گھر سے نکل کر کہیں جاتے دیکھا تھا؟''

پڑوسن جواب دیتی ہے: ''دراصل حامد کے ابو نے اصرار کیا تھا کہ ہم رات کا کھانا گھر سے باہر کھائیں۔ وہ مجھے ساتھ لے گئے۔ راستے میں بازار سے گزرے تو بہن کی شادی پر پہننے کے لیے مجھے گاؤن خرید دیا، پھر جیولر کی دکان پر ٹھہرے اور میرے لیے سونے کے

دو چھچھماتے ہوئے کنگن اُٹھا لائے۔ توبہ! بہت فضول خرچ ہیں۔ گھر پہنچے تو بچے منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر بچوں کو منایا کہ تمھیں اختتامِ ہفتہ (Weekend) پر سیر کرانے لیے چلیں گے۔''

مطلقہ بے چاری اس کی باتیں سنتی اور اپنی حالتِ زار پر افسوس کرتی رہی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسی عورت کے سامنے یہ موضوع زیر بحث لانا مناسب تھا جو خود ازدواجی زندگی میں ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کا اپنی پڑوسن سے تعلق بڑھے گا؟ اُسے اس کے پاس بیٹھ کر یا اُس سے مل کر خوشی ہوگی؟ اِن سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔

پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ کیا پڑوسن اس کے سامنے جھوٹ بولتی؟

نہیں بلکہ اسے چاہیے تھا کہ مختصر جواب دیتی: ''ہاں! ایک ضروری کام کے سلسلے میں روانہ ہوئے تھے۔'' اس کے بعد وہ موضوع بدل کر مطلقہ کی غمخواری کرتی اور اس کے لیے ہمدردی کے چند بول کہتی۔

یا فرض کریں کہ دو دوست جنھوں نے اکٹھے ہائر سیکنڈری کا امتحان دیا، ان میں سے ایک امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا ہے اور دوسرا چند مضامین میں فیل ہو جاتا ہے۔ اس کے نمبروں کا تناسب کم ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ یونیورسٹی داخلہ نہیں بھیج سکتا۔ کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ پاس ہونے والا اپنے دوست سے ملے اور ان یونیورسٹیوں کا ذکر چھیڑ دے جنھوں نے اس کا داخلہ منظور کر لیا ہے؟ یا یونیورسٹیوں کی طرف سے جاری کردہ مراعات کے لمبے چوڑے قصے بیان کرنے لگے؟ یقیناً یہ مناسب نہیں ہوگا، پھر سوال یہ ہے کہ فیل ہونے والے دوست سے ملاقات پر وہ کیا موضوع چھیڑے؟

میرا خیال ہے کہ وہ عمومی انداز اختیار کرے تاکہ اس کے دوست کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

مثلاً وہ کہے کہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے والوں کا خاصا رش ہے۔ یونیورسٹی والے بھی بہت کم داخلے منظور کر رہے ہیں۔ مسترد ہو جانے کے خوف سے اکثر طلبہ داخلہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہیں۔ یوں دوست کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گا۔

اسے یہ سوچ کر قدرے اطمینان حاصل ہو گا کہ صرف میں ہی نہیں، میری طرح اور لوگ بھی بیشتر مسائل کا شکار ہیں۔ وہ اپنے دوست سے بات کرنا، اس سے ملنا اور اس کے قریب بیٹھنا چاہے گا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی نفسیات اور ان کے احساسات کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

«لَا تُدِيمُوا النَّظَرَ إِلَى الْمَجْذُومِينَ»

''کوڑھی افراد کو ٹکٹکی باندھ کر مت دیکھو۔''[1]

کوڑھ یا جذام بے حد خبیث مرض ہے۔ اس سے متاثرہ افراد کی جلد انتہائی بھدّی اور غلیظ ہو جاتی ہے، اس لیے یہ کسی طور پر مناسب نہیں کہ کوڑھی لوگوں کے درمیان آئے تو وہ اسے گھور گھور کر دیکھتے رہیں۔ یوں اسے اپنی مصیبت یاد آئے گی اور وہ غمزدہ ہو جائے گا۔

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والدِ گرامی ابوقحافہ سے انتہائی لطف و کرم کا معاملہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے ہمراہ فتح مکہ کے لیے آئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ نے جو بہت بوڑھے اور نابینا تھے، اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا: ''مجھے ذرا جبلِ ابوقبیس کی چوٹی پر لے چلو۔ دیکھوں تو، لوگ جو کہہ رہے ہیں کہ محمد آ گئے ہیں، کیا وہ سچ ہے۔'' لڑکی اُنھیں ساتھ لیے پہاڑ پر چڑھی۔ ابوقحافہ نے پوچھا: ''بیٹی! تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟'' ''ابا جان! میں ایک بڑا لشکر دیکھ رہی ہوں جو پیش قدمی کر رہا ہے۔''

''یہ گھوڑ سوار لشکر ہے۔'' ابوقحافہ نے وضاحت کی۔

"سب سے آگے ایک آدمی ہے جو دائیں بائیں دوڑتا پھر رہا ہے۔" لڑکی نے بتایا۔

"بیٹی! یہ ان کا کماندار ہے جو شہ سوار دستوں کو ہدایات دے رہا ہے۔"

"ابا جان! واللہ! لشکر بکھر گیا۔" لڑکی نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"تب تو گھوڑ سوار دستے مکہ پہنچ چکے ہوں گے۔" ابو قحافہ نے جلدی سے کہا۔ "مجھے فوراً گھر لے چلو۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ جو اپنے گھر بیٹھ رہے اسے امان ہے۔"

لڑکی ابو قحافہ کو ساتھ لیے تیزی سے اتری۔ لیکن گھر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھوڑ سوار دستہ انھیں مل گیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے والد کے پاس آئے۔ ان کا ہاتھ پکڑا اور مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو قحافہ کو دیکھا کہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ قویٰ مضمحل اور ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ دو چار دن کے مہمان ہیں۔ اور ابو بکر جو اپنے والد کی طرف محبت سے دیکھ رہے ہیں، انھوں نے کئی سال پہلے اپنے والد کو خیر باد کہہ دیا تھا اور دین کی خدمت میں مصروف ہو گئے تھے۔ آپ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور اُن کی دلجوئی اور بلند مرتبی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ بزرگ کو گھر ہی پہ رہنے دیتے۔ میں خود اُن کے پاس چلا جاتا۔"

ابو بکر جانتے تھے کہ مسلمان حالتِ جنگ میں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کماندار ہیں۔ آپ کے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ آپ کو گھر آنے کی تکلیف نہ دی جائے۔ انھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "یا رسول اللہ! آپ کو ان کی طرف چل کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُن کا فرض بنتا ہے کہ آپ کے پاس چل کر آئیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو قحافہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اُن کے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"اسلام لے آیئے۔"

ابو قحافہ کا چہرہ دمک اٹھا۔ انھوں نے فوراً کہا: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔“

ابو بکر رضی اللہ عنہ والدِ گرامی کے اسلام لانے پر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اُن کی مسرت و فرحت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے سر اور داڑھی کے سفید بال دیکھے تو صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”ان بالوں کا رنگ بدل دو، البتہ انھیں سیاہی نہ لگانا۔“[2]

جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے تعامل میں ان کی نفسیات کا اسی طرح خیال رکھتے تھے۔

جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے، آپ نے لشکر کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا۔ انصار کے دستے کا جھنڈا جلیل القدر اور نڈر صحابی سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا۔ علمبردار کے لیے عَلَم اعزاز کا باعث ہوتا ہے۔ سعد نے اہل مکہ کی طرف دیکھا تو انھیں وہی لوگ نظر آئے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ آپ پر مکہ کی زمین تنگ کر دی تھی۔ لوگوں کو آپ کے قریب آنے سے زبردستی روکا تھا۔ انھی نے سمیہ اور یاسر کو شہید کیا تھا۔ بلال اور خباب کو اذیتیں دی تھیں۔ ان کی نظر میں اہلِ مکہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان سے انتقام لیا جائے۔ سعد نے پھریرا لہراتے ہوئے کہا:

اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَة

اَلْيَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْحُرْمَة

”آج خونریزی اور مار دھاڑ کا دن ہے۔ آج حرمت حلال کر لی جائے گی۔“[1]

سعد کی یہ بات قریش پر شاق گزری۔ انھیں خدشہ ہوا کہیں سعد قریش کے اندر مار دھاڑ نہ مچا دیں۔ قریش کی ایک خاتون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راستے میں روکا اور سعد کی

شکایت کی۔ اس نے فی البدیہہ شعر کہے:

يَا نَبِيَّ الْهُدٰى إِلَيْكَ لَجَا حَيُّ قُرَيْشٍ وَّلَاتَ حِينَ لَجَاءِ
حِينَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ سَعَةُ الْأَرْضِ وَعَادَاهُمُ إِلٰهُ السَّمَاءِ

''اے نبی ہدایت! قریش تجھی سے مدد کے طالب ہیں جبکہ مدد حاصل کرنے کا اب وقت نہیں ہے۔ جبکہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود اُن پر تنگ پڑ چکی ہے اور آسمان کا رب ان سے ناراض ہے۔''

إِنَّ سَعْداً يُرِيدُ قَاصِمَةَ الظَّهْرِ بِأَهْلِ الْحَجُونِ وَالْبَطْحَاءِ
خَزْرَجِيٌّ لَوْ يَسْتَطِيعُ مِنَ الْغَيْظِ رَمَانَا بِالنَّسْرِ وَالْعَوَّاءِ

''سعد جبل حجون کے باسیوں اور اہلِ بطحاء پر کمر توڑ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس خزرجی کے غصے کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو ہم پر تیر و تفنگ کی بارش کر دے۔''

فَانْهَيَنْهُ فَإِنَّهُ الْأَسَدُ الْأَسْوَدُ وَاللَّيْثُ وَالِغٌ فِي الدِّمَاءِ
فَلَئِنْ أَقْحَمَ اللِّوَاءَ وَنَادَى يَا حُمَاةَ اللِّوَاءِ أَهْلَ اللِّوَاءِ

''آپ اسے روکیں۔ وہ اسد ہے، شیر ہے، ببر شیر ہے جس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ جھنڈا لے کر ہم پر آ چڑھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پکار لیا۔''

لَتَكُونَنَّ بِالْبِطَاحِ قُرَيْشٌ بُقْعَةَ الْقَاعِ فِي أَكُفِّ الْإِمَاءِ
إِنَّهُ مُصْلِتٌ يُرِيدُ لَهَا الرَّأْيَ صَمُوتٌ كَالْحَيَّةِ الصَّمَّاءِ

''تو وادیِ بطحاء میں قریش کی حالت زمین کے اس ٹکڑے کی سی ہو گی جو لونڈیوں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ وہ تلوار سونتے کھڑا ہے اور قریش کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

وہ گونگے سانپ کے مانند گھنتا ہے۔"[4]

رسول اللہ ﷺ نے یہ اشعار سنے تو آپ کو قریش پر رحم آیا۔ آپ نے پسند نہ کیا کہ اس خاتون کو مایوس لوٹائیں۔ سعد سے جھنڈا واپس لے کر آپ انھیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے سعد کو حکم دیا تو انھوں نے پھریرا اپنے بیٹے قیس بن سعد کو تھما دیا۔ قیس بن سعد جھنڈا پکڑے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان کے والد سعد دوش بدوش تھے۔ خاتون اور قریش یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ سعد کا ہاتھ جھنڈے سے خالی ہے۔ سعد بھی ناراض نہیں ہوئے کہ قائد وہی ہیں لیکن جھنڈا اٹھائے رکھنے کی زحمت سے انھیں سبکدوش کر دیا گیا ہے اور ان کی طرف سے جھنڈا صاحبزادے قیس نے اٹھا رکھا ہے۔ فریقین کو راضی رکھنے کا یہ بہت منفرد طریقہ تھا۔

کوشش کیجیے کہ کسی کو ضائع نہ کریں۔ سب افراد کو ساتھ لے کر چلیں، ہر چند ان کے مزاج اور فطری تقاضے مختلف ہی ہوں۔

موافقت

"ہمارا واسطہ دلوں سے پڑتا ہے نہ کہ اجسام سے۔"

---

[1] سنن ابن ماجة، حديث:3543، ومسند أحمد:233/1. یہ حدیث ضعیف ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام:48/4. [3] صحيح البخاري، حديث:4280، والبداية والنهاية:294/4. [4] البداية والنهاية:290/4.

لوگوں کی قدر و قیمت کا احساس

یہ امر انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی قدر و قیمت کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے انسان عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ لوگ بڑی بڑی کہانیاں گھڑتے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوسرے ان کی طرف متوجہ ہوں یا انھیں دیکھ کر حیرت اور پسندیدگی کا اظہار کریں۔ رسول اللہ ﷺ انسانی مزاج کے اس پہلو کا بھی خیال رکھتے تھے۔ آپ سے ملنے والا ہر انسان یہی سمجھتا تھا کہ اس کا مسئلہ آپ کا مسئلہ ہے۔ اسے محسوس ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اس کی مشکل کے لیے اسی قدر پریشان اور فکر مند ہیں جتنا وہ خود فکر مند ہے۔

رسول اللہ ﷺ جمعے کا خطبہ دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک آدمی مسجد کے دروازے سے اندر آیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ ایک آدمی آیا ہے۔ وہ آپ سے دین کے متعلق پوچھنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو یہ بادیہ نشین اعرابی تھا جو شاید خطبہ ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ آپ منبر سے اترے، کرسی منگائی، اعرابی کو اپنے سامنے بٹھایا اور اسے دین کے احکام بتانے لگے۔ وہ بات خوب سمجھ گیا تو آپ اٹھے، منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اپنی گفتگو مکمل کی۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی متحمل مزاجی اور برداشت کے کیا کہنے! صحابۂ کرام نے بھی آپ سے یہی تربیت پائی تھی۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح لوگوں کو ان کی قدر و قیمت کا احساس دلاتے، ان کے معاملات کو اہمیت دیتے اور ان کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور نظر جاتی رہی ہے، جوانی کی یادیں تازہ کر رہے ہیں اور غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کا واقعہ سامعین کے گوش گزار کر رہے ہیں۔ آیئے ان کی زبانی یہ دلچسپ حکایت سنتے ہیں:

''یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری غزوہ تھا، آپ نے لوگوں میں کوچ کا اعلان کر دیا۔ ارادہ یہ تھا کہ لوگ جنگ کی تیاری کریں۔ آپ نے ان سے لشکر کے سامان کی فراہمی کے لیے قابلِ فروخت اشیاء بھی جمع کر لیں۔ لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ فصلیں پک گئی تھیں اور کٹائی کے لیے تیار تھیں۔ سفر بھی دور کا تھا اور دشمن بھی زبردست اور قوی۔ مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی لیکن ان کے ناموں کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ میں ان دنوں بہت آسودہ حال تھا۔ میرے پاس دو سواریاں تھیں اور میں اپنے زعم میں جہاد کے لیے مکمل تیاری کی حالت میں تھا۔ دل میں فصل پکنے کی خوشی، جوش اور ولولہ تھا۔ کھڑی فصل اور پختہ پھل چھوڑ کر جانا قیامت معلوم ہوتا تھا۔ امنگوں کی ولولہ انگیزی کا یہی عالم تھا کہ ایک صبح رسول اللہ ﷺ روانہ ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا کہ کل بازار جاؤں گا اور اپنا سامان خرید کر ان سے جا ملوں گا۔ اگلے دن بازار گیا۔ وہاں ایک مسئلہ بن گیا اور میں سامان خریدے بغیر واپس آ گیا۔ میں نے سوچا کل ان شاء اللہ پھر بازار جاؤں گا اور بعد میں لشکر سے جا ملوں گا۔ لیکن پھر کوئی رکاوٹ پیش آ گئی اور میں اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ میں نے کہا ان شاء اللہ کل جاؤں گا۔ اسی شش و پنج میں کئی دن گزر گئے اور میں اسلامی لشکر سے پیچھے رہ گیا۔ اب میں بازاروں میں چلتا پھرتا اور مدینے میں گھومتا تو مجھے

(پیچھے رہ جانے والوں میں) دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے، وہ جسے نفاق نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے یا وہ جسے اللہ نے معذور قرار دیا ہے۔ اُدھر رسول اللہ ﷺ اپنے تیس ہزار اصحاب کے ہمراہ تبوک پہنچے تو لشکر کے سرکردہ افراد پر نظر ڈالی۔ بیعتِ عقبہ میں حاضر ہونے والا ایک مردِ صالح آپ کو دکھائی نہیں دیا۔ آپ نے دریافت کیا:

''کعب بن مالک کیا ہوئے؟''

ایک آدمی نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! انھیں ان کی دونوں چادروں (کی خوبصورتی) اور اپنے پہلوؤں پر فاخرانہ نگاہ نے روک لیا ہے۔''

اس پر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے غلط کہا۔ اے اللہ کے نبی! واللہ! ہم تو یہی جانتے ہیں کہ وہ بھلے آدمی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا جواب سُن کر خاموش رہے۔

غزوۂ تبوک اختتام کو پہنچا اور مسلمانوں کی واپسی کا نقارہ بجا تو میں سوچنے لگا کہ ایسا کیا طریقہ ہو کہ میں رسول اللہ ﷺ کی ناراضی سے بچ جاؤں۔ اس سلسلے میں، میں نے خاندان کے سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد سے مشورہ بھی کیا۔

مسلمان مدینہ پہنچ گئے۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ سچ کے سوا کسی چیز سے نجات ملنے والی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے مسجد گئے۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر لوگوں کی خاطر مسجد ہی میں بیٹھ گئے۔ پیچھے رہ جانے والے آتے، عذر بیان کرتے، قسم کھاتے، رسول اللہ ﷺ ان کا ظاہر قبول کرتے اور باطن اللہ کے سپرد کر کے ان کے لیے مغفرت کی دعا کر دیتے تھے۔

میں بھی آپ کے پاس مسجد میں آیا اور سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ مجھے دیکھ کر اس آدمی کی طرح مسکرائے جو سخت غصے میں ہو۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

”آپ کیوں پیچھے رہ گئے؟ آپ نے تو سواری بھی خرید رکھی تھی؟“

میں نے جواب دیا: ”جی ہاں۔“

”پھر پیچھے کیوں رہ گئے؟“

رسول اللہ ﷺ کے سوال میں رنج وغم اور خفگی کے آثار نمایاں تھے۔

میں کہنے لگا: ”اے اللہ کے رسول! میں آپ کے علاوہ اہلِ دنیا میں سے کسی اور کے پاس بیٹھتا تو واللہ آپ دیکھتے کہ میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس کی ناراضی سے بچ جاتا۔ اللہ نے مجھے بحث وتکرار کی خصوصی صلاحیت سے نوازا ہے۔ لیکن واللہ! میں جانتا ہوں کہ آج میں نے آپ کو جھوٹ بول کر راضی کر لیا تو جلد ہی میرا پول کھل جائے گا اور اللہ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر میں سچ کہہ دوں تو وقتی طور پر آپ ضرور ناراض ہوں گے لیکن امید ہے کہ یوں اللہ میرا گناہ معاف کر دے گا۔ اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! میرا کوئی عذر نہیں۔ واللہ! میں کبھی اتنا قوی اور آسودہ حال نہیں رہا جتنا اب ہوں۔“

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کی طرف دیکھا اور فرمایا:

”انھوں نے سچ کہا ہے۔“

پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

”آپ چلے جائیں، حتی کہ اللہ آپ کے متعلق کوئی فیصلہ کر دے۔“

میں بہت غمگین ہوا اور بوجھل قدموں سے مسجد سے باہر آ گیا۔

میری قوم نے یہ صورتِ حال دیکھی تو بعض افراد مجھے ملامت کرنے اور کہنے لگے: ”واللہ! آج سے پہلے آپ نے کبھی ایسی غلطی نہیں کی۔ آپ شاعر آدمی ہیں۔ لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے بڑے بڑے عذر تراشے۔ آپ بھی کوئی بہانہ کر دیتے۔ اللہ کے رسول ﷺ آپ کے لیے بھی مغفرت کی دعا کرتے اور اللہ آپ کو معاف کر دیتا۔“

کعب کہتے ہیں: ''وہ مجھے سرزنش کرتے رہے، حتی کہ میں نے ارادہ کرلیا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس جاؤں اور اپنا بیان بدل دوں۔''

پھر میں نے پوچھا: ''کسی اور سے بھی یہی کہا گیا ہے؟''

انھوں نے بتایا: ''ہاں! دو اور آدمیوں نے بھی آپ کی طرح سچ بولا اور ان سے بھی وہی کہا گیا جو آپ سے کہا گیا ہے۔ میں نے پوچھا: ''کون ہیں وہ؟''

''مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ۔'' انھوں نے دو نیک آدمیوں کا نام لیا جو بدر میں شامل تھے اور جن کی ذات میرے لیے نمونہ تھی۔

میں نے کہا: ''واللہ! میں اس سلسلے میں دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بالکل نہیں جاؤں گا اور نہ اپنا بیان بدلوں گا۔'' اس کے بعد کعب ہمت ہار کر گھر بیٹھ گئے۔ چند ہی دن گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو کعب اور اُن کے دونوں ساتھیوں سے بات کرنے کی ممانعت کر دی۔

کعب کہتے ہیں: ''اس پر لوگ ہم سے اجتناب کرنے لگے۔ وہ ہمارے لیے اجنبی ہو گئے۔ اب میں گاہے گاہے بازار جانے لگا لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کے چہرے بدل گئے۔ یہ وہ چہرے نہیں تھے جن سے ہم واقف تھے۔ در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ یہ وہ در و دیوار نہیں تھے جنھیں ہم پہچانتے تھے۔ زمین ہمارے لیے بیگانہ ہو گئی۔ یہ وہ زمین نہیں تھی جس سے ہم شناسا تھے۔

میرے دونوں ساتھی تو گھروں میں پڑے دن رات روتے رہتے تھے۔ اپنے سر باہر نہ نکالتے اور راہبوں کی طرح پُر مشقت عبادت کرتے۔ میں جوان اور مضبوط آدمی تھا۔ گھر سے نکلتا، مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا تھا۔ مجھ سے کوئی کلام نہیں کرتا تھا۔ مسجد جاتا تو نبی ﷺ کے قریب آ کر آپ کو سلام کرتا۔ دل میں

سوچتا کہ اللہ کے رسول نے میرے سلام کے جواب میں لب ہلائے یا نہیں۔ پھر میں آپ کے قریب نماز پڑھتا اور کن اکھیوں سے دیکھتا رہتا۔ میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ مجھے دیکھتے اور جب میں دیکھتا تو آپ منہ پھیر لیتے۔

یونہی گردشِ شام وسحر جاری رہی کہ ایک اور آزمائش نے سر اٹھایا۔ کعب اپنی قوم کے معزز آدمی اور فصیح و بلیغ شاعر تھے۔ آس پاس کے بادشاہوں کو اُن کے اشعار پہنچتے اور وہ اس شاعر سے ملنے کی تمنا کرتے۔ ایک دن کعب بازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک نصرانی جو شام سے آیا تھا، پوچھتا پھرتا تھا: ''مجھے کعب بن مالک کا پتا کون بتائے گا؟'' لوگوں نے کعب کی طرف اشارہ کر کے اسے بتایا۔ وہ کعب کے پاس آیا اور شاہِ غسان کا خط انھیں دیا۔ کعب نے خط کھولا۔ اس میں مرقوم تھا:

''امابعد۔ کعب بن مالک! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے صاحب نے بے وفائی کی ہے اور تمھیں اپنے سے دور کر دیا ہے۔ اللہ نے تمھیں ذلت کے گھر میں رہنے اور ضائع ہونے کے لیے نہیں بنایا۔ ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمھاری غم خواری کریں گے۔'' کعب نے خط پڑھا اور کہا: ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اہلِ کفر میری طمع کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک اور آزمائش ہے۔'' پھر فوراً خط تنور میں جا پھینکا اور بادشاہ کی پیش کش پر مطلق دھیان نہیں دیا۔

کعب کے لیے دربارِ شاہی کا دروازہ کھلا۔ رؤسائے عالم انھیں اپنا مصاحب بنا کر اعزاز بخشنا چاہتے ہیں۔ مدینہ میں بسنے والے چہروں کے تیور بدل چکے ہیں۔ کعب سلام کرتے ہیں تو جواب نہیں دیا جاتا۔ سوال کرتے ہیں تو سنا نہیں جاتا۔ اس کے باوجود انھوں نے کافروں کی طرف التفات نہیں کیا۔ شیطان انھیں ڈگمگا دینے اور خواہش کا بندہ بنانے میں ناکام رہا۔ انھوں نے شاہِ غسان کا خط آگ میں ڈال دیا۔ دن پر دن گزرتے رہے۔ پورا ایک مہینہ بیت گیا۔ کعب اسی حال میں رہے۔ گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا

تھا۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ انھیں بحال کر رہے تھے اور نہ وحی ہی کوئی فیصلہ دے رہی تھی۔ چالیس دن پورے ہوئے تو نبی ﷺ کا قاصد کعب کے ہاں آتا اور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ کعب جلدی سے باہر آتے ہیں کہ شاید آسانی در آئی۔ قاصد کہتا ہے: ''رسول اللہ ﷺ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جائیں۔''

کعب نے پوچھا: ''طلاق دے دوں یا کیا کروں؟''

اس نے کہا: ''نہیں، لیکن علیحدہ رہیں اور اس کے قریب نہ جائیں۔''

کعب فوراً بیوی کے پاس گئے اور کہا: ''اپنے گھر چلی جاؤ اور اُن کے ہاں رہو حتی کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔''

رسول اللہ ﷺ نے دیگر دونوں اصحاب کی طرف بھی یہی پیغام بھیجا۔

ہلال بن امیہ کی اہلیہ نبی ﷺ کے ہاں آئیں اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! ہلال بن امیہ بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔ آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ اُن کی خدمت کرتی رہوں؟''

فرمایا:

''ہاں! لیکن وہ آپ کے قریب نہ آئیں۔''

وہ کہنے لگیں: ''اے اللہ کے نبی! واللہ! وہ تو حرکت کرنے سے عاجز اور نہایت افسردہ ہیں۔ جب سے یہ معاملہ پیش آیا ہے، دن رات روتے رہتے ہیں۔''

کعب کے لیے ایک ایک دن قیامت کا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنے ایمان کے متعلق فکر مند ہو گئے۔

وہ مسلمانوں سے بات کرتے لیکن مسلمان ان سے کتراتے۔ رسول اللہ ﷺ کو سلام کرتے تو جواب نہ ملتا۔ آخر وہ کہاں جاتے اور کس سے مشورہ کرتے؟

کعب کہتے ہیں: ''آزمائش نے طوالت اختیار کی تو میں اپنے عم زاد ابوقتادہ کے ہاں گیا جن سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنے باغ میں تھے۔ میں باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور انھیں سلام کیا۔ اللہ کی قسم! انھوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔

میں نے پوچھا: ''ابوقتادہ! تمھیں اللہ کا واسطہ! تم جانتے ہو نا کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے؟''

وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ پوچھا:

''ابوقتادہ! جانتے ہو نا کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے؟''

وہ اس بار بھی چپ رہے۔ میں نے تیسری بار پوچھا:

''ابوقتادہ! میں تمھیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں! جانتے ہو نا کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔''

کعب نے اپنے محبوب ترین بھائی اور عم زاد کا یہ جواب سنا تو برداشت نہ کر پائے اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیے، پھر وہاں سے لوٹے اور گھر چلے گئے۔ خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ تسلی دینے کے لیے نہ بیوی اور نہ محبت بگھارنے کو کوئی قریبی۔ آج پچاسویں رات تھی۔ رات کے تیسرے پہر نبی ﷺ پر تینوں اصحاب کی قبولیتِ توبہ کے متعلق وحی نازل ہوئی۔ آپ اس رات ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے۔ آپ نے آیات تلاوت کیں۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! ہم کعب بن مالک کو خوش خبری نہ سنائیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''تب لوگ ٹوٹ پڑیں گے اور بقیہ رات آپ کو سونے نہیں دیں گے۔''

نبی ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی تو لوگوں میں اعلان کر دیا کہ اللہ نے تینوں اصحاب کی

توبہ قبول کر لی ہے۔ اعلان سنتے ہی لوگ خوش خبری سنانے دوڑ پڑے۔

کعب کہتے ہیں: ''میں نے اپنے گھر کی چھت پر فجر کی نماز ادا کی تھی۔ میں اسی حالت میں بیٹھا تھا جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو چکی تھی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ پڑ گئی تھی۔ اب یہی جی چاہتا تھا کہ مر جاؤں اور رسول اللہ ﷺ میری نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ انھی سوچوں میں غرق تھا کہ کسی آدمی کی آواز سنائی دی جو جبلِ سلع پر کھڑا پکار رہا تھا: ''اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ۔''

میں وہیں سجدے میں پڑ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اللہ کی طرف سے راحت آ پہنچی ہے۔ اس کے بعد ایک گھوڑ سوار بھی خوش خبری لے کر آیا لیکن آواز گھوڑے سے زیادہ تیز رفتار نکلی۔ جس آدمی نے جبلِ سلع پر خوش خبری سنائی تھی وہ میرے پاس آیا تو میں نے انعام میں اپنے کپڑے اتار کر اسے پہنا دیے۔ اللہ کی قسم! اس کے سوا میرے پاس کوئی لباس نہیں تھا، پھر میں نے دو کپڑے عاریتاً لے کر پہنے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں لوگ فوج در فوج مجھ سے ملاقات کرنے آ رہے تھے۔ وہ مجھے قبولیت توبہ کی مبارک باد دیتے اور کہتے: ''اللہ کی طرف سے توبہ کی قبولیت مبارک ہو۔''

میں چلتا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے۔ صحابۂ کرام نے مجھے دیکھا تو طلحہ بن عبیداللہ اُٹھ کر میری طرف آئے۔ وہ مجھ سے گلے ملے، مبارکباد دی اور اپنی جگہ لوٹ گئے۔ طلحہ کی یہ بات میں نہیں بھول سکا، پھر میں رسول اللہ ﷺ کے قریب گیا، آپ کو سلام کیا، خوشی سے آپ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب آپ خوش ہوتے تو چہرہ یوں جگمگاتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا:

''یہ دن مبارک ہو جو آپ کی زندگی کا، جب سے آپ کو آپ کی والدہ نے جنا

ہے، سب سے اچھا دن ہے۔''

میں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے۔''

فرمایا:

''نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے۔''

اس پر آپ ﷺ نے قرآنی آیات تلاوت کیں۔ میں آپ کے روبرو بیٹھا اور کہا:

''میری توبہ ہی کا حصہ یہ امر بھی ہے کہ میں اپنا سارا مال صدقہ کرتا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بہتر ہے کہ کچھ مال اپنے پاس بھی رکھیں۔''[1]

میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ نے مجھے صرف سچ کی بدولت نجات دی۔ میری توبہ ہی سے یہ امر بھی ہے کہ جب تک زندہ رہوں سچ ہی بولوں۔''

اس واقعے میں ہمارے مطلب کی بات یہ ہے کہ طلحہ نے کعب کو دیکھا تو اُٹھ کر ان کی طرف گئے، نہایت گرمجوشی سے معانقہ کیا اور انھیں مبارکباد دی۔ کعب کے دل میں ان کی محبت بڑھ گئی اور وہ طلحہ کی وفات کے کئی برس بعد یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واللہ! میں طلحہ کی یہ بات نہیں بھلا سکتا۔

طلحہ نے ایسا کیا کیا تھا کہ کعب کے دل پر اتنا اثر ہوا؟ دراصل انھوں نے ایک بے مثال مہارت استعمال کی تھی۔ طلحہ نے انھیں اہمیت دی اور ان کی خوشی میں شریک ہوئے جس کے باعث وہ کعب کے دل میں نمایاں جگہ پا گئے۔

لوگوں کو اہمیت دینے اور ان کے احساسات میں شرکت کرنے سے ان کے دلوں میں آپ کے لیے نمایاں جگہ بنتی ہے۔ مثلاً امتحانات کے ہنگامے میں آپ کے موبائل فون پر یہ پیغام آتا ہے:

’’مجھے اپنی کامیابی کی خوش خبری سنانا مت بھولنا۔ مجھے تمھارا خیال ہے اور میں تمھارے لیے دعا گو ہوں۔ تمھارا دوست، ابراہیم۔‘‘

کیا اس دوست سے آپ کا تعلق نہیں بڑھے گا؟ ضرور بڑھے گا۔

یا مثال کے طور پر آپ کے والد خدانخواستہ بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ آپ ہمہ وقت والد کی خدمت میں رہتے ہیں اور آپ کی تمام توجہ کا مرکز صرف انھی کی ذات ہے، ایک دوست آپ کو فون کر کے کہتا ہے: ’’کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔‘‘

آپ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

کیا آپ کو احساس نہیں ہو گا کہ آپ کا دل اس دوست کا دیگر اَصدقاء سے زیادہ گرویدہ ہو چکا ہے؟

اسی دوران، آپ کا کوئی اور دوست فون کرتا ہے: ’’یار! ہم پکنک منانے سمندر پر جا رہے ہیں۔ کیوں چلو گے؟‘‘

تو بجائے اس کے وہ آپ کے والد کے لیے دعا کرے اور معذرت کرے کہ ان کے متعلق پوچھ نہیں سکا، ڈھٹائی سے کہتا ہے: ’’میں مانتا ہوں کہ وہ بیمار ہیں لیکن یار وہ ہسپتال میں ہیں۔ وہاں ان کی دیکھ بھال کرنے والے بہت ہیں۔ تمھارے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ ہمارے ساتھ چلو۔ مزے کریں گے، خوب ہلا گلا ہو گا۔‘‘ یہ سب باتیں وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے۔ گویا آپ کے والد کی بیماری اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس دوست کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہو گا۔ یقیناً آپ کے دل میں اس کی قدر کم ہو جائے گی کیونکہ اسے آپ کی مشکلات کا احساس نہیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر مجھے خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

میں چند دن کے لیے جدہ کا سفر کر رہا تھا اور انتہائی مصروف تھا۔ سفر کے دوران مجھے

موبائل فون پر اپنے بھائی سعود کا پیغام موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا:

''ہمارا فلاں عم زاد جرمنی میں وفات پا گیا ہے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔''

میں نے فی الفور بھائی کو کال کی تو اس نے بتایا کہ ہمارے فلاں عم زاد، جو بہت بوڑھے تھے، دو دن پہلے دل کے علاج کے لیے جرمنی روانہ ہوئے تھے جہاں وہ آپریشن کے دوران وفات پا گئے ہیں۔ ان کی میت جلد ہی الریاض کے ہوائی اڈے پر پہنچ رہی ہے۔

میں نے چچیرے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کی اور کال منقطع کر دی۔

اس کے دو دن بعد جدہ میں میرا کام ختم ہوا تو میں ہوائی اڈے گیا اور الریاض کے لیے اپنی فلائٹ چھوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس اثنا میں کئی نوجوان مجھے پہچان کر قریب آئے اور سلام کیا۔ ان میں سے کئی نوجوانوں نے سر کے بال عجیب وغریب طریقے سے کٹوا رکھے تھے۔ اس کے باوجود میں ان سے ہنسی کرتا اور لطافت آمیز لہجے میں ان کی عجیب و غریب ہیئت کذائی پر پھبتیاں بھی کستا رہا، پھر میں ایک ٹیلی فون سننے لگا۔ ٹیلی فون سن کر فارغ ہوا تو ایک نوجوان جو خوشنما پتلون قمیص میں ملبوس تھا، میری طرف آیا۔ اس نے مجھے سلام کہا اور مصافحہ کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا، خوش آمدید کہا اور اسی رَو میں مذاق کر دیا:

''واہ، کیا شاندار لباس ہے۔ بالکل دُولھے لگ رہے ہو۔''

اسی قسم کے چند اور جملے بھی کہے۔ نوجوان چند ثانیے خاموش رہا، پھر گویا ہوا:

''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں فلاں ہوں۔ میں والد کی میت لے کر ابھی جرمنی سے پہنچا ہوں اور اگلی فلائٹ پر الریاض جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔''

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ نوجوان کا والد فوت ہو گیا تھا۔ اس کی میت ابھی جہاز میں تھی اور مجھے مذاق کی سوجھی تھی۔ بڑی عجیب بات تھی۔ میں تھوڑی دیر کچھ نہ بول سکا، پھر

بڑی مشکل سے کہنے لگا: ”مجھے بہت افسوس ہے۔ واللہ میں تمھیں پہچان نہیں پایا۔ میں چند دن سے یہاں ہوں۔ اللہ تمھارے والد کی مغفرت کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔“

اگرچہ اسے نہ پہچاننے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، کیونکہ میری اس نوجوان سے زیادہ ملاقات نہیں رہی تھی۔ جب بھی میں اسے ملا وہ عام لباس میں ملبوس ہوتا تھا۔ اب جبکہ وہ پتلون پہنے جدّے کی بھیڑ میں اچانک سامنے آ گیا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ وہی نوجوان ہے۔

معلوم ہوا کہ لوگوں کو اہمیت دینے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ان کے احساسات میں شرکت کی جائے اور اُنھیں باور کرایا جائے کہ ان کا غم سب کا غم ہے، اور یہ کہ آپ ان کی خیر خواہی کرنا چاہتے ہیں۔

ترقی یافتہ کمپنیوں کے ہاں باقاعدہ تعلقاتِ عامہ کا ادارہ موجود ہوتا ہے۔ مختلف مواقع پر مبارکباد کے پیغامات اور تحفے تحائف بھیجنا اس ادارے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

آپ لوگوں کو ان کی قدر و قیمت کا احساس دلا کر ان کے دل جیت سکتے ہیں۔ لوگ آپ سے محبت کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے خصائل میں آپ کی یہ عادت بھی بیان کی گئی ہے کہ آپ کسی سے ہاتھ ملاتے تو اس وقت تک آپ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہتا جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لیتا۔[3]

آپ ﷺ جس سے بات کرتے پورے جسم کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے اور ہمہ تن گوش ہو کر بات سنتے۔

تجربہ

”لوگوں کو ان کی قدر و قیمت جتا کر آپ ان کے دل جیت سکتے ہیں۔“

1 یہ روایت ہمیں نہیں ملی۔ 2 صحیح البخاري، حدیث: 4418، وصحیح مسلم، حدیث: 2769.
3 سنن ابن ماجة، حدیث: 3716. یہ حدیث ضعیف ہے۔

دوسروں کو بتائیں کہ آپ اُن کی بھلائی چاہتے ہیں

آپ کا دل دوسروں کی خیر خواہی اور محبت کے احساس سے معمور ہو، آپ صدق دل سے ان سے اچھا برتاؤ کریں اور لوگوں کو محسوس ہو کہ آپ ان سے پیار کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں بھی آپ کی محبت اور مقبولیت لازمًا پروان چڑھے گی۔

ایک لیڈی ڈاکٹر تھیں جن کا کلینک مریض عورتوں سے بھرا رہتا تھا۔ خواتین ہمیشہ ان سے رجوع کرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ ہر عورت یہی سمجھتی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ اس کی خاص دوست ہیں۔ اس کا راز ڈاکٹر صاحبہ کا اچھوتا طرزِ عمل تھا جس کے ذریعے سے وہ دوسروں پر جادو کر دیتی تھیں۔ انھوں نے اپنی سیکرٹری سے طے کر رکھا تھا کہ جب بھی کوئی مریضہ فون کرے اور ڈاکٹر صاحبہ سے بات کرنا چاہے تو وہ اسے خوش آمدید کہے اور نام پتا پوچھ کر پانچ منٹ بعد دوبارہ رابطہ کرنے کو کہے۔ اس دوران سیکرٹری مریضہ کی فائل ڈاکٹر صاحبہ کو پیش کرے۔ ڈاکٹر صاحبہ مریضہ کی فائل میں درج تمام معلومات پڑھتیں کہ اس کا مشغلہ کیا ہے اور اس کے بچوں کے نام کیا ہیں۔ مریضہ دوبارہ رابطہ کرتی تو ڈاکٹر صاحبہ اس کی بیماری کی تفصیلات پوچھتیں، اس کے بچوں کا حال دریافت کرتیں اور اس کی ملازمت کے بارے میں سوال کرتیں۔ مریضہ حیران ہوتی کہ ڈاکٹر صاحبہ کو اس سے اس درجہ تعلقِ خاطر ہے کہ وہ اس کے بچوں کے نام تک جانتی ہیں اور اس کی ملازمت سے بھی

واقف ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی ڈاکٹر کو ترجیح دیتی۔ کیا خیال ہے دلوں کو مسخر کرنا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔ آپ دوسروں سے اپنی محبت کا برملا اظہار کریں، اس میں کوئی حرج نہیں۔ اپنے جذبات لوگوں سے چھپا کر نہ رکھیں۔ آپ جس سے محبت کرتے ہیں اس سے بلا جھجک کہیں کہ مجھے آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔ آپ میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے دشمن سے بھی کہیں: ''آپ مجھے بہت لوگوں سے پیارے ہیں۔'' آپ نے جھوٹ تو نہیں کہا۔ وہ آپ کو لاکھوں یہود و نصاریٰ سے پیارا ہے۔ ذہانت سے کام لیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ عمرہ کرنے گیا۔ طواف و سعی کے دوران تمام مسلمانوں کی بھلائی، حفاظت اور نصرت کی دعائیں کرتا رہا۔ اکثر میں یہ دعا کرتا: ''یا اللہ! میرے احباب و اقارب کو بخش دے۔''

مناسکِ عمرہ ادا کرنے کے بعد میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس عبادت کی توفیق دی، پھر میں نے شب بسری کے لیے ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لیا۔ رات کو سونے کے لیے تکیے پر سر رکھا تو کچھ سوچ کر اٹھ بیٹھا۔ موبائل فون پر ایک پیغام لکھا: ''میرا عمرہ اختتام کو پہنچا۔ میں نے اپنے احباب کو یاد رکھا۔ آپ بھی میرے احباب میں شامل ہیں، لہٰذا میں اپنی دعاؤں میں آپ کو نہیں بھولا۔ اللہ آپ کی حفاظت کرے اور عملِ صالح کی توفیق دے۔''

یہ پیغام میں نے پانچ سو افراد کو ارسال کر دیا جن کے نام موبائل فون کی فائل میں محفوظ تھے۔ ان سب پر اس پیغام کا جو عجیب و غریب اثر ہوا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک نے مجھے پیغام بھیجا: ''واللہ! میں آپ کا پیغام پڑھ کر رو رہا ہوں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔''

دوسرے نے لکھا: ''واللہ! اے ابو عبدالرحمٰن، میں نہیں جانتا کہ آپ کو کیا جواب دوں۔

بس اتنا کہتا ہوں کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

تیسرے نے کہا: "میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی دعا قبول کرے۔ واللہ! ہم بھی آپ کو نہیں بھولے۔"

ہمیں ہر آن ضرورت ہے کہ ہم لوگوں کو اپنی محبت یاد دلائیں۔ اس کا بہترین ذریعہ موبائل فون کے پیغامات ہیں۔ آپ اپنے احباب کو مختلف پیغامات ارسال کر سکتے ہیں مثلاً:

"میں نے آپ کے لیے اذان اور اقامت کے درمیان دعا کی۔" یا

"میں نے آپ کے لیے جمعے کی آخری گھڑی میں دعا کی۔"

آپ کی نیت درست ہے تو ایسے اقدامات میں ریا کاری کا کوئی شائبہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس سے مسلمانوں میں محبت اور الفت بڑھتی ہے۔

ایک بار میں نے طائف شہر میں منعقد دعوتی سمر کیمپ میں لیکچر دیا۔ شفا کے پہاڑوں میں واقع یہ ایک تفریح گاہ تھی جہاں نوجوانوں کی بڑی تعداد آئی ہوئی تھی۔ لیکچر کے حاضرین کی اکثریت کا تعلق ان نوجوانوں سے تھا جن پر تقویٰ اور بھلائی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ دیگر بے شمار نوجوان جو لیکچر سننے نہیں آئے تھے، تفریح گاہ کے اطراف و جوانب میں لہو ولعب میں مشغول تھے۔ لیکچر اختتام پذیر ہوا۔ کئی نوجوان میرے قریب آئے، سلام دعا ہوئی۔ ان میں ایک نوجوان تھا جس کے بالوں کی تراش خراش بڑی مضحکہ خیز تھی۔ اس نے جینز کی تنگ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور شکریہ ادا کیا۔ میں نے گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "آپ کا چہرہ تو کسی بڑے داعی کا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔"

وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

اس کے دو ہفتے بعد اچانک اس نے فون کیا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ یا شیخ! میں

وہی ہوں جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ تمھارا چہرہ کسی داعی کا چہرہ لگتا ہے۔ واللہ! میں ان شاء اللہ ایک بڑا داعی بنوں گا۔"

پھر وہ مجھے بتانے لگا کہ اِن کلمات کے بعد اس کے احساسات و جذبات کیا تھے۔

آپ نے دیکھا کہ جذبات کی سچائی لوگوں پر کیسا انوکھا اثر ڈالتی ہے۔

جلیل القدر صحابۂ کرام ابوبکر صدیق اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بھلائی کے کاموں میں ہمیشہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس دوڑ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اکثر آگے نکل جاتے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ منہ اندھیرے نماز کے لیے نکلتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسجد میں موجود پاتے۔ مساکین کو کھانا کھلانے کا معاملہ ہوتا تو بھی ابوبکر سبقت لے جاتے۔

ایک بار مسلمانوں کی ہنگامی ضرورت پوری کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے صدقہ کرنے کو کہا۔ ان دنوں عمر رضی اللہ عنہ کے پاس خاصا مال جمع تھا۔ انھوں نے کہا: "آج میں ابوبکر سے آگے بڑھ جاؤں گا۔" عمر رضی اللہ عنہ گھر گئے اور اپنا نصف مال لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اتنا مال دیکھتے ہی پہلی بات کیا کہی؟ یہ نہیں دریافت کیا کہ مال کتنی مقدار میں ہے یا یہ نہیں پوچھا کہ سونا ہے یا چاندی بلکہ پہلا سوال آپ نے عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کیا:

"عمر! آپ نے گھر والوں کے لیے بھی کچھ بچایا ہے کہ نہیں؟"

عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اسی قدر مال گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔"

اب عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی بہت سا مال لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ آپ نے اُن سے بھی پہلا سوال یہی کیا:

"ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہیں؟"

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! میں ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر کا سارا مال صدقے کے طور پر لے آئے تھے۔

اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بلاشبہ میں کبھی ابوبکر سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔''[1]

لوگ محسوس کرتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ بھی آپ کی محبت میں سرشار تھے۔ ایک روز آپ نے نماز جلدی پڑھا دی۔ سلام پھیرا تو صحابۂ کرام کو حیران دیکھ کر فرمایا:

''شاید آپ کو تعجب ہوا ہے کہ میں نے نماز جلدی پڑھا دی۔ دراصل میں نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو مجھے اس کی ماں پر رحم آگیا۔''[2]

نبی ﷺ لوگوں سے اسی طرح محبت کرتے اور اپنے طرزِ عمل سے اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔

چند لفظی بات

''اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ جرأت کر کے کہہ دیں: ''مجھے آپ سے محبت ہے۔ میں آپ سے مِل کر خوش ہوتا ہوں۔ آپ میرے نزدیک قیمتی ہیں۔''

[1] جامع الترمذي، حديث: 3675. [2] صحيح البخاري، حديث: 707، وصحيح مسلم، حديث: 470، وجامع الترمذي، حديث: 376.

نام یاد رکھیں

کسی شخص سے سرِ راہ آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ آپ کو اپنا نام بتاتا ہے، پھر آپ کسی اور موقع پر اس سے ملتے ہیں اور اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ یقینی طور پر آپ کی محبت کا نقش اس کے دل پر بیٹھ جائے گا۔

پہلی ملاقات میں کسی کا نام یاد رکھنا گویا اس امر کا اظہار ہے کہ آپ نے اسے اہمیت دی ہے۔ ایک استاد کو اپنے شاگردوں کے نام یاد ہیں اور دوسرے کو یاد نہیں، دونوں میں بڑا فرق ہے۔

میرے عوامی خطابات کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کوئی ہاتھ ملاتا ہے تو کوئی شکریہ ادا کرتا ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ ہر ایک سے اس کا نام دریافت کروں۔ ایک دن لیکچر کے بعد بہت سے لوگ مجھے ملنے آئے، پھر چلے گئے۔ ایک آدمی کوئی سوال پوچھنے دوبارہ آیا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے گرم جوشی سے کہا: ''آئیے خالد صاحب! کیسے مزاج ہیں؟'' وہ ایک دم بہت خوش ہو کر کہنے لگا: ''ماشاءاللہ! آپ تو میرا نام بھی جانتے ہیں؟''

لوگ عام طور پر پسند کرتے ہیں کہ انھیں ان کے ناموں سے مخاطب کیا جائے۔ ملٹری افسر سینے پر نام کی ننھی تختی سجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے چھاؤنی میں لیکچر

دیا۔ لیکچر کے بعد کئی افسر مجھ سے ملنے آ گئے۔ ایک صاحب شرم کے مارے کبھی آگے آتے اور کبھی پیچھے ہٹتے۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا اور ان کے نام کی تختی دیکھی، پھر ہاتھ بڑھا کر کہا: ”آئیے، اسلم صاحب، کیسے مزاج ہیں؟“

اُنھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا اور حیرت سے مسکراتے ہوئے کہا: ”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہے؟“

میں نے کہا: ”بھائی! ہم جن سے محبت کریں لازم ہے کہ ان کے اسمائے گرامی سے بھی واقف ہوں۔“

میری بات کا اُن صاحب پر خاصا اثر ہوا۔ بے شمار لوگ اس اصول کی اہمیت تسلیم کرتے اور دوسروں کے نام یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لوگوں کے نام یاد نہ رہنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ملاقات کے دوران آدمی کی ذات کو اہمیت نہ دینا، تعارف کے وقت توجہ نہ دینا یا آپ کو یقین ہو کہ دوبارہ اس آدمی سے ملاقات نہیں ہوگی، اس لیے نام یاد رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یا آپ کا مدّمقابل عام انسان ہو جس کی آپ کے نزدیک غیر معمولی اہمیت نہ ہو۔

یہ چند اسباب ہیں جن کے باعث لوگ دوسروں کے نام بھول جاتے ہیں یا سرے سے یاد ہی نہیں رکھتے۔

اس کا حل یہ ہے کہ آپ ناموں کی اہمیت باور کریں اور نام سنتے وقت آدمی کے چہرے پر نظریں گاڑے رہیں۔

اس سلسلے میں یہ کوشش بھی سود مند ثابت ہو سکتی ہے کہ مخاطب کی باتیں غور سے سنی جائیں اور اس کی مسکراہٹ پر دھیان دیا جائے تاکہ اس کا تصور ذہن میں بیٹھ جائے۔ گفتگو کے دوران بار بار مخاطب کا نام لیں مثلاً ٹھیک ہے خالد۔ آپ درست کہہ رہے ہیں

انور۔ حامد میں آپ کی بات سُن رہا ہوں۔

یہ بہت اہم بات ہے۔ اسے معمولی نہ سمجھیں۔ قرآن میں جا بجا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ان کے ناموں سے مخاطب کیا ہے:

﴿ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ ﴾

’’اے ابراہیم، اس سے درگزر کر۔‘‘[1]

﴿ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ ﴾

’’اے نوح! یہ تیرے اہل سے نہیں۔‘‘[2]

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾

’’اے داود! ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔‘‘[3]

بالاختصار

’’میرا نام یاد رکھیں۔ مجھے میرے نام سے مخاطب کریں اور اپنے نزدیک میری اہمیت جتائیں تاکہ میں آپ سے محبت کروں۔‘‘

---

[1] هود 76:11. [2] هود 46:11. [3] ص 26:38.

دوسروں کی تعریف کریں

زندگی میں بے شمار کام ہم اپنے بجائے لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔آپ دعوتِ ولیمہ پر مدعو ہیں تو خوبصورت ترین لباس زیب تن کرتے ہیں۔آپ ایسا صرف اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوں، آپ کو دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کریں۔آپ یہ محسوس کر کے بہت خوش ہوتے ہیں کہ لوگوں کو آپ کی خوش لباسی یا خوش روئی پسند آئی ہے۔آپ گھر کا مہمان خانہ دیگر کمروں سے بڑھ کر سجاتے ہیں صرف اس لیے کہ لوگ یہاں آ کر بیٹھیں گے اور کمرے کے محاسن دیکھ کر خوش ہوں گے۔آپ اپنے دوستوں کو کھانے پر بلاتے ہیں تو آپ اور آپ کی بیگم معمول سے زیادہ اور متنوع کھانے بنانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ہم اس وقت خوشی سے پھولے نہیں سماتے جب کوئی ہمارے لباس اور گھر کی آرائش یا کھانے کی تعریف کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يَأْتُوا إِلَيْهِ»

”جو آدمی پسند کرتا ہے کہ لوگ اس سے ملنے آئیں، اسے چاہیے کہ وہ لوگوں سے ملنے آئے۔“[1]

آپ کا دوست خوشنما لباس پہنے تو آپ اس کی تعریف کریں، خوش کن جملے استعمال

کریں: ”ماشاءاللہ! کیا خوبصورت لباس ہے۔ آپ تو بالکل دُولھے معلوم ہوتے ہیں۔“

ایک صاحب آپ سے ملنے آتے ہیں۔ ان کے کپڑوں سے مسحور کُن خوشبو پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ آپ ان کی تعریف کریں۔ انھوں نے آپ ہی کی خاطر خوشبو لگائی ہے۔ اچھے الفاظ میں خوشبو کی ستائش کریں:

”سبحان اللہ! کیسی عمدہ خوشبو ہے۔ آپ کے ذوق کی داد دینی پڑے گی۔“

کوئی صاحب آپ کو کھانے پر مدعو کرتے ہیں تو کھانے کی تعریف کریں۔ اُن کے گھر والوں نے کھانا تیار کرنے میں اتنی تگ و دو کا مظاہرہ یقیناً آپ ہی کے لیے کیا ہے۔ انھیں محسوس ہو کہ آپ ان کے احسان مند ہوئے ہیں اور ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ آپ اپنے کسی دوست کے گھر جاتے ہیں۔ گھر کا آرایشی سامان آپ کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے تو اس کی خوبصورتی اور گھر والوں کے اعلیٰ ذوق کی تعریف کریں۔ (یاد رہے تعریف میں مبالغہ آرائی نہیں ہونی چاہیے تاکہ گھر والے اسے مذاق نہ سمجھیں۔) آپ بھری محفل میں شریک ہوتے اور ایک شخص کو حاضرینِ محفل سے رواں گفتگو کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کی باتوں سے سب پر فسوں طاری ہے۔ آپ اس کی تعریف کریں۔ مجلس برخاست ہونے کے بعد اس سے کہیں:

”ماشاءاللہ! آپ بہت عمدہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ کے آنے سے محفل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔“

تجربہ کر کے دیکھیں۔ وہ یقیناً آپ سے محبت کرنے لگے گا۔

آپ بیٹے کو باپ کا اکرام کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے والد کے ہاتھ پر بوسہ دیتا ہے۔ ان کے جوتے قریب کرتا ہے۔ آپ اس کی ستائش کریں۔

آپ بہن سے ملنے اس کے گھر گئے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کا خیال رکھتی

ہے۔ اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی تعریف کریں۔

آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا دوست اپنی اولاد اور اہلیہ کا خیال رکھتا ہے۔ اُنھیں وقت دیتا ہے۔ مہمانوں کی غیر معمولی تکریم کرتا ہے۔ جرأت مند بنئے۔ اس کی تعریف کریں۔ اندر چھپے پسندیدگی کے جذبات باہر نکالیں۔ آپ کسی کی گاڑی میں سفر کرتے ہیں یا کوئی ٹیکسی پکڑتے ہیں۔ آپ کو گاڑی کی صفائی ستھرائی متاثر کرتی ہے۔ ڈرائیور کی ڈرائیونگ سے آپ خوش ہوتے ہیں تو اس کی تعریف کریں۔

آپ کہیں گے کہ یہ سب تو معمولی باتیں ہیں۔ ٹھیک ہے یہ معمولی باتیں ہیں لیکن اثر دار ہیں۔ میں نے خود اس مہارت کا ہر طرح کے لوگوں میں تجربہ کیا ہے۔ میں نے ان کے عجیب وغریب تاثرات دیکھے ہیں۔ خاص طور پر وہ الفاظ تو بہت اہم ہیں جن کے بارے میں لوگ انتظار کرتے ہیں کہ آپ کب انھیں منہ سے نکالیں گے۔ ایک دولھا جس سے آپ کی ملاقات شادی کے ایک ہفتے بعد ہوتی ہے۔ ایک آدمی اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کرتا ہے۔ ایک شخص نیا گھر خریدتا ہے۔ یہ سب لوگ بلاشبہ انتظار میں ہیں کہ آپ ان کے لیے تعریفی کلمات کہیں، اس لیے ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کریں۔

میرا چچیرا بھائی سیکنڈری اسکول کا طالب علم تھا۔ آخری امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے داخلہ دلوانے یونیورسٹی لے چلیں۔ ایک صبح میں نے اس سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور گاڑی لیے اس کے گھر سے گزرا تاکہ وہ میرے ساتھ یونیورسٹی چلے۔ اس کا دل امنگوں سے بھرپور تھا۔ وہ زندگی کے نئے مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یونیورسٹی کے کس شعبے میں داخلہ لے گا۔ جونہی وہ گاڑی میں بیٹھا، نہایت تیز خوشبو کا جھونکا میرے نتھنوں میں داخل ہوا۔ لگ رہا تھا کہ اس نے کپڑوں پر پرفیوم کی پوری بوتل خالی کر دی ہے۔ تیز خوشبو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے گاڑی کی کھڑکیاں

کھول دیں تاکہ تازہ ہوا اندر آئے۔ اس بے چارے نے کپڑوں کی آرائش اور انھیں معطر کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا تھا۔ اس کے باوجود میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا: ''ماشاء اللہ! یہ میٹھی خوشبو کون سی ہے؟''

میری اتنی سی بات سے اس کے دل کو جتنی خوشی ملی اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر نہایت جوشیلے انداز سے کہا:

''ابو عبدالرحمٰن! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ واللہ! یہ نہایت قیمتی عطر ہے۔ میں ہمیشہ یہی عطر استعمال کرتا ہوں لیکن لوگ ذرا توجہ نہیں کرتے۔''

پھر اس نے غترہ ایک طرف سے سونگھتے ہوئے کہا:

''واللہ! بڑی میٹھی خوشبو ہے۔''

یہ واقعہ پیش آئے پندرہ برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ عبدالمجید چند سال ہوئے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ملازمت پر تعینات ہو گیا ہے۔ لیکن میرے یہ الفاظ آج بھی اس کے ذہن میں تازہ ہیں۔ وہ کبھی کبھار ہنسی کے موڈ میں ہو تو ہم دونوں یہ واقعہ یاد کر کے خوش ہوتے اور مذاق کرتے ہیں۔

جی ہاں! ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔ لوگوں کی توجہ اور محبت حاصل کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن ہم اکثر اوقات ان معمولی مہارتوں سے غافل رہتے ہیں۔ خلقِ عظیم کے حامل پیغمبر ﷺ ان مہارتوں کو بطریقِ احسن استعمال میں لاتے تھے۔

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی اور انھیں اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ مہاجرین میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جو مکہ کے بالاتر تاجر تھے لیکن مدینہ آئے تو نادار ہو گئے۔ مسلمانوں کی محتاجی اور ناداری کے فوری حل کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کر دی۔

عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ربیع انصاری کے بھائی بن کر اُن کے گھر چلے گئے۔ ان لوگوں کے دل صاف اور نفس کدورت سے پاک تھے۔ سعد نے عبدالرحمٰن سے کہا:

''بھائی جان! میں اہلِ مدینہ میں سب سے مال دار ہوں۔ میں اپنے مال کے دو حصے کرتا ہوں۔ ایک حصہ آپ رکھ لیں اور دوسرا میرے لیے چھوڑ دیں۔''

پھر سعد کو خیال آیا کہ عبدالرحمٰن شادی کرنا چاہتے ہوں گے۔ انھوں نے عبدالرحمٰن کو پیش کش کی کہ میں آپ کی شادی کرا دیتا ہوں۔ لیکن عبدالرحمٰن نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''اللہ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے۔ مجھے بازار کا راستہ دکھا دیجیے۔''

عبدالرحمٰن اگرچہ اپنی ساری دولت مکہ چھوڑ آئے اور اہلِ مکہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، تاہم وہ نہایت عقل مند، باصلاحیت اور تجربہ کار انسان تھے۔ سعد نے انھیں بازار کا راستہ بتایا تو وہ بازار گئے، کچھ سامان اُدھار خریدا اور اسے بیچ کر نفع کمایا۔ فنِ تجارت پر جو قریش کا قدیم پیشہ تھا، انھیں عبور تھا۔ یوں ان کے پاس خاصا مال جمع ہو گیا اور انھوں نے شادی کر لی۔ شادی کے اگلے دن وہ نبی ﷺ کی طرف گئے۔ ان کی قمیص پر زعفران کے زرد نشان تھے جسے عرب کی عورتیں خوشبو کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تبدیلی بھانپ لی۔ آپ نے زعفرانی نشان دیکھے تو مسکراتے ہوئے عبدالرحمٰن سے پوچھا:

''کیا ماجرا ہے؟''

عبدالرحمٰن نے خوش ہو کر بتایا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کو تعجب ہوا کہ جو آدمی ابھی کچھ ہی دن پہلے ہجرت کر کے آیا ہے وہ اتنی جلدی شادی پر کیسے قادر ہو گیا؟

آپ نے پوچھا:

”حق مہر کتنا دیا تھا؟“

ابنِ عوف نے بتایا: ”کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا۔“

رسول اللہ ﷺ نے ان کی خوشی میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا:

”ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کا ہو۔“[2]

پھر آپ نے ان کے لیے مال اور کاروبار میں برکت کی دعا کی۔ اس دعا کے اثرات ان کی زندگی پر خوب خوب مرتب ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تجارت میں نفع کا حال بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

”میں سونا یا چاندی کی امید سے پتھر بھی اٹھا لیتا تھا۔“

یہی نہیں، رسول اللہ ﷺ فقراء و مساکین سے بھی ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ آپ انھیں اہمیت دیتے اور ان کا احساس کرتے تھے۔ آپ انھیں باور کراتے کہ میری توجہ آپ لوگوں پر ہے اور آپ میرے لیے اہم ہیں۔ آپ ﷺ ہمیشہ ان کے جذبات کی قدر کرتے تھے۔

مدینہ میں ایک صالح حبشی عورت تھی جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ نبی ﷺ اس کا شوق دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ چند دن گزرے، رسول اللہ ﷺ کو وہ حبشی عورت نظر نہ آئی۔ آپ نے اس کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا:

”اے اللہ کے رسول! وہ وفات پا گئی ہے۔“

آپ نے فرمایا:

”آپ لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

دراصل لوگوں نے اس حبشی عورت کے معاملے کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ انھوں نے کہا: ”وہ رات کو فوت ہوئی تھی۔ ہم نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“

رسول اللہ ﷺ کو خواہش ہوئی کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں کیونکہ اس کا عمل لوگوں کی نظر میں اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اللہ کے نزدیک اس کی بڑی قدر تھی۔

آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''مجھے اس کی قبر کا پتا بتاؤ۔''

لوگوں نے بتایا تو آپ نے قبر پر جا کر اس کی نمازِ جنازہ ادا کی۔

پھر فرمایا:

«إِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِي عَلَيْهِمْ»

''یہ قبریں ان کے رہنے والوں کے لیے تاریک ہوتی ہیں۔ میرے نمازِ جنازہ پڑھنے سے اللہ ان کی قبریں منور کر دیتا ہے۔''[1]

سبحان اللہ! جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک نادار عورت کے چھوٹے سے عمل کو اتنی اہمیت دیتے دیکھا ہوگا ان کے احساسات کیا ہوں گے اور ایسے حقیر اعمال کے لیے آئندہ وہ جس قدر پُر جوش رہے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے کان میں سرگوشی کروں: ''ہم جس معاشرے میں جی رہے ہیں وہ اس قسم کی مہارتوں کی قدر نہیں کرتا، اس لیے ہوشیار رہیں۔ آپ کا جوش وہ سخت مزاج اور گراں بار لوگ ٹھنڈا نہ کر دیں جو آپ کے تعریفی جملوں سے قطعی متاثر نہیں ہوں گے اور جواب میں آپ کو ان کی کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔''

اس قبیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان جسے میں جانتا ہوں، کسی بڑی دعوت میں مدعو تھا۔ اس دعوت میں شہر کے ممتاز افراد شریک ہونے والے تھے۔ راستے میں

وہ نوجوان بازار سے گزرا۔ وہ خوشبوؤں کی ایک بڑی دکان میں داخل ہوا گویا کوئی اعلیٰ درجے کا پرفیوم خریدنا چاہتا ہو۔ سیلزمین نے معمول کے مطابق گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس نے نوجوان کو کئی خوشبوئیں دکھائیں۔ نمونے کی خوشبوئیں دیکھ دیکھ کر جب نوجوان کے کپڑے خوشبو میں بس گئے تو اس نے سیلزمین سے کہا:

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے ان میں سے کوئی خوشبو پسند آئی تو میں واپس آ کر خریدوں گا۔''

اب وہ جلدی سے گیا اور دعوت میں شریک ہوا۔ کھانے کی میز پر وہ خالد کے پہلو میں جا بیٹھا۔ خالد نے اس کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو پر مطلق توجہ نہ دی۔ نوجوان نے حیرت سے کہا: ''خالد! تمھیں نہایت اعلیٰ درجے کے پرفیوم کی خوشبو نہیں آ رہی؟''

خالد نے کہا: ''نہیں۔''

نوجوان نے کہا: ''پھر تمھاری ناک بند ہو گی۔''

''میری ناک بند ہوتی تو تمھارے پسینے کی بدبو مجھے کیسے آتی؟''

خالد نے جواب دیا۔

اعتراف

''آدمی کامیابی کی کتنی ہی منزلیں طے کر لے، بہرحال وہ انسان ہے اور اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔''

---

1. سنن النسائي، حديث: 4196، وسنن ابن ماجة، حديث: 3956. 2. صحيح البخاري، حديث: 2049، وصحيح مسلم، حديث: 1427. 3. صحيح البخاري، حديث: 458، وصحيح مسلم، حديث: 956.

ہمیشہ صرف خوب صورتی کی تعریف کریں

بعض لوگ بڑے بے باک ہوتے ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات نوٹ کرتے اور اس پر منفی یا مثبت انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ یاد رکھیں جو چیز حد سے بڑھ جائے اس کا بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہو جاتا ہے اور جو شخص کوئی چیز وقت سے پہلے حاصل کرنا چاہے وہ اس سے محروم رہ جانے کی سزا بھگتتا ہے۔

اس لیے ہمیشہ عمدہ اور خوبصورت اشیاء نوٹ کیجیے جنھیں دکھا کر آدمی خوش ہوتا ہے اور لوگوں کی طرف سے تعریف کا منتظر رہتا ہے، وہ اشیاء جنھیں آدمی شرم کے مارے چھپائے، انھیں آپ بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کریں۔

مثال کے طور پر آپ اپنے دوست کے گھر جاتے ہیں۔ وہاں آپ کو پرانی کرسیاں نظر آتی ہیں۔ آپ اپنے دوست کے لیے مصیبت نہ بنیں اور مفت مشورے نہ دیں۔ آپ کی زبان سے اس قسم کے جملے ادا نہ ہوں: ''آپ کرسیاں کیوں نہیں بدلتے؟ فانوس پوری طرح روشن نہیں ہوتے۔ آپ نئے فانوس کیوں نہیں لگوا لیتے؟ دیواروں کا روغن اترا جاتا ہے۔ پرانا ہو گیا ہے۔ نیا روغن کیوں نہیں کرواتے؟''

بھائی میرے! اس نے آپ سے مشورہ طلب نہیں کیا۔ نہ آپ تعمیرات کے انجینئر ہیں کہ اسے بتائیں کہ اس کا گھر کہاں کہاں سے مرمت کا محتاج ہے۔ آپ خاموش رہیں۔

ہوسکتا ہے وہ گھر کی پرانی اشیاء تبدیل کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ عین ممکن ہے وہ مالی بحران کا شکار ہو۔ لوگوں کے لیے سب سے گراں شخص وہ ہوتا ہے جو ایسی چیزوں پر نکتہ چینی کرے جنھیں وہ چھپانا چاہتے ہیں۔ مثلاً آپ کے دوست کے کپڑے پرانے ہیں یا اس کی گاڑی کھٹارا ہو چکی ہے تو خاموش رہیں اور اگر کچھ کہنا ہی ہے تو اچھی بات کہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے دوست سے ملنے اس کے گھر گیا۔ دوست نے اُسے روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا۔ مہمان نے کہا: ''روٹی کے ساتھ چندروس (پودینے کی ایک قسم) بھی ہوتا تو کیا کہنے۔''

میزبان نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ چندروس ہے۔ بیوی نے جواب نفی میں دیا۔ وہ چندروس لینے بازار گیا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ دکان دار نے ادھار دینے سے انکار کر دیا۔ وہ لوٹا، گھر کا ایک بڑا برتن اٹھایا اور دکان دار کے پاس جا کر کہا کہ یہ برتن گروی رکھ لو اور چندروس دے دو۔ دکان دار نے چندروس اس کے حوالے کیا۔ میزبان نے چندروس لا کر مہمان کو پیش کیا اور اس نے کھایا۔ مہمان کھانے سے فارغ ہوا تو اس نے کہا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور جو کچھ ہمیں دیا اس پر کفایت شعار بنایا۔'' اس پر میزبان نے آہ بھری اور کہا: ''اگر اللہ نے آپ کو اپنے دیے پر کفایت شعار بنایا ہوتا تو میرا برتن گروی نہ رکھا ہوتا۔''

اسی طرح آپ کسی مریض کی عیادت کو جائیں تو اس کے سامنے یہ ہرگز مت کہیں: ''اوہ! آپ کا رنگ تو پیلا پڑ رہا ہے۔ آنکھیں ٹیڑھی ہو رہی ہیں۔ وزن بھی خاصا کم ہو گیا ہے۔''

حیرت ہے! کیا آپ اس کے ڈاکٹر ہیں؟ اچھی بات کہیں یا خاموش رہیں۔

حکایت ہے کہ ایک آدمی کسی مریض کی عیادت کرنے گیا۔ وہ تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھا۔ اس نے مریض سے اس کی بیماری پوچھی ۔ مریض نے بتایا بیماری خطرناک

ہے۔ وہ آدمی چلایا: ”آہ! یہی بیماری میرے فلاں دوست کو بھی تھی۔ اس بیماری نے اس کی جان لے کر چھوڑی۔ میرے بھائی کے دوست کو بھی اسی بیماری نے بستر پر ڈال دیا۔ بے چارہ سسک سسک کر مر گیا۔ میرے بہنوئی کا پڑوسی بھی اسی بیماری سے ہلاک ہوا۔“

مریض یہ سب سنتا رہا اور قریب تھا کہ پھٹ پڑے۔ وہ آدمی اٹھ کر جانے لگا تو مریض کی طرف دیکھ کر بولا: ”آہ! آپ مجھے کوئی وصیت کرنا چاہتے ہیں۔“

مریض نے کہا: ”ہاں، یہ کہ آپ چلے جائیں تو واپس تشریف مت لائیے گا۔ اور جب کسی بیمار کی عیادت کریں تو اس کے سامنے مُردوں کا ذکر نہ کیا کریں۔“

بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بڑھیا کی بوڑھی سہیلی بیمار پڑ گئی۔ وہ بڑھیا اپنے بیٹوں سے کہنے لگی کہ مجھے اس سے ملانے لے چلو۔ کوئی بیٹا اسے لے جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بڑھیا نے مزید اصرار کیا تو ایک بیٹے نے کہا کہ ٹھیک ہے امّاں! میں آپ کو لیے چلتا ہوں۔ اس نے والدہ کو گاڑی میں سوار کیا اور روانہ ہو گیا۔ مریضہ کے گھر پہنچے تو لڑکے کی والدہ اندر گئی اور وہ گاڑی میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ مریضہ کی بیماری جڑ پکڑ چکی تھی۔ اس نے بیمار سہیلی کو سلام کیا اور دعا دی۔ کچھ دیر بعد اجازت لے کر باہر نکلی تو صحن میں مریضہ کی بیٹیاں بیٹھی رو رہی تھیں۔ یہ ان کے قریب سے گزری اور کہا: ”میں بار بار آپ کے ہاں نہیں آسکوں گی۔ آپ کی ماں بیمار ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، اس لیے میری طرف سے پیشگی تعزیت قبول کریں۔“

آپ عقل مندی سے کام لیں۔ ان باتوں پر توجہ دیں جن سے دوسرے خوش ہوں اور ان باتوں کو نظر انداز کریں جو دوسروں کی افسردگی اور پریشانی کا باعث ہوں۔

مفت مشورہ

”آپ کسی کو اس کی غلطی بتانا چاہیں تو احسن انداز اختیار کریں۔“

ایسے کام میں دخل مت دیں جس سے آپ کا تعلق نہیں

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»

''آدمی کے حسنِ اسلام میں سے یہ امر بھی ہے کہ وہ ایسے کام چھوڑ دے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''[4]

یہ بہت خوبصورت عبارت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاک اور مبارک منہ سے نکلی ہے۔ بہت درست کہا کہ وہ کام نہ کریں جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو آپ کے معاملات میں جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، دخل دے کر آپ کو پریشان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ گھڑی پر وقت دیکھتے ہیں تو آپ کا دوست پوچھتا ہے؟

''یہ گھڑی آپ نے کتنے میں خریدی؟''

''یہ مجھے تحفے میں ملی تھی۔''

''اچھا! تحفے میں ملی تھی! کس نے دیا تھا تحفہ؟'' وہ اشتیاق سے پوچھتا ہے۔

''ایک دوست نے دیا تھا۔'' آپ تنگ آ کر کہتے ہیں۔

''کون سا دوست؟ یونیورسٹی کا؟ محلے کا؟ یا کوئی اور؟'' اس کا ارادہ آپ کو واقعی زچ کرنے کا ہے۔

''یونیورسٹی کا دوست ہے۔'' آپ جواب دیتے ہیں۔

''اچھا! کس موقع پر؟''

''بس یونیورسٹی کے دور میں۔''

''کس موقع پر؟ ٹھیک ہے۔تم لوگ سفر میں تھے یا ممکن ہے تم؟؟؟''

یوں ایک فضول اور بے فائدہ ٹاپک پر وہ آپ سے سوال جواب کرتا چلا جاتا ہے۔ سچ سچ بتایئے کیا آپ کا دل نہیں چاہے گا کہ چلا کر کہہ دیں: ''جس کام سے تمھارا کوئی تعلق نہیں اس میں دخل مت دو۔''

ایک روز مغرب کے بعد میں دوستوں کی محفل میں بیٹھا تھا، ایک دوست کے موبائل فون کی گھنٹی بجی جو میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔اس نے کہا: ''جی، بات کر رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے اس کی بیوی کی گرج دار آواز سنائی دی: ''گدھے! تم کہاں ہو؟''

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ میں بآسانی سن سکتا تھا۔ میرے دوست نے جواب دیا: ''خیریت سے ہوں۔اللہ تمھاری حفاظت کرے۔''

لگتا تھا اس نے بیوی سے مغرب کے بعد کہیں جانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ یہاں بیٹھا تھا۔اس کی بیوی نے غصے سے کہا: ''اللہ تمھیں سلامت نہ رکھے۔تم دوستوں میں تشریف فرما ہو اور ادھر میں تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔بَیل کہیں کے!''

اس نے کہا: ''اللہ تم سے راضی ہو۔میں عشاء کے بعد تم سے ملتا ہوں۔''

میں نے نوٹ کیا کہ اِس کی بات اُس کی بات سے ہم آہنگ نہیں ہے اور یہ اپنے آپ کو پریشانی سے نجات دلانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔کال منقطع ہوئی۔ میں حاضرین کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا کہ شاید اب اس سے مختلف سوال کیے جائیں کہ کس کا فون تھا۔وہ کیا چاہتا تھا۔اس سے بات کرنے کے بعد تمھارے چہرے کا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے۔ لیکن اللہ نے اس پر رحم کیا اور کسی نے اس کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔

یا مثال کے طور پر آپ کسی مریض کی عیادت کرتے ہیں۔ آپ اس سے بیماری کے متعلق پوچھتے ہیں۔ وہ آپ کو معمول کے الفاظ میں جواب دیتا ہے کہ الحمد للہ، معمولی بیماری ہے۔ گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہیں۔ یا اسی طرح کے دیگر الفاظ جن میں کوئی بات وضاحت سے نہیں کہی جاتی۔ آپ اسے کرید کر پریشان نہ کریں: ''معاف کیجیے گا۔ کیا بیماری ہے آپ کو؟ ذرا تفصیل سے بتایئے۔'' ان سوالات سے اسے پریشان کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

آدمی کے حُسنِ اسلام میں سے یہ امر بھی ہے کہ وہ ایسے کام چھوڑ دے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یعنی آپ انتظار نہ کریں کہ وہ یہ کہے: ''مجھے بواسیر ہے۔ یا مجھے فلاں مقام پر زخم ہے۔'' جب مریض نے آپ کو عام الفاظ میں جواب دے دیا ہے تو خواہ مخواہ بات کو طول دینے کا کوئی سوال نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ مریض سے اس کا حال بھی نہ پوچھیں یا اس کی بیماری دریافت نہ کریں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ زیادہ سوال کر کے کرید کرنے کی کوشش نہ کریں۔

یا مثلاً آپ برسرِ عام کسی طالب علم کو بلا کر پوچھتے ہیں: ''ارے احمد! تم پاس ہو گئے؟ وہ جواب دیتا ہے: ''ہاں، پاس ہو گیا ہوں۔''

آپ فوراً اگلا سوال داغتے ہیں: ''تمھارے نمبر کتنے ہیں؟ کلاس میں کون سی پوزیشن ہے؟'' اگر آپ واقعی اسے اہمیت دینا چاہتے ہیں تو اکیلے میں اس سے بات کیجیے۔ اس کے بعد باریکی میں جانے کی ضرورت نہیں کہ تمھارے نمبر کتنے ہیں؟ تم نے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کی؟ تم یونیورسٹی کیوں نہیں جاتے رہے؟ اگر آپ واقعی اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو اسے ایک طرف لے جایئے اور جو جی میں آئے کہیے، البتہ لوگوں کے سامنے اس کا پول کھولنا مناسب نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''آدمی کے حسنِ اسلام میں سے یہ امر بھی ہے کہ وہ ایسے کام چھوڑ دے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''[2]

لیکن خیال رکھیے کسی موضوع کو اتنا ہی وقت دیجیے جتنے کا وہ مستحق ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر میں نے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ وہاں مجھے چند لیکچر دینے تھے۔ میں نے ایک فاضل نوجوان سے طے کیا کہ وہ میرے دونوں صاحبزادوں عبدالرحمٰن اور ابراہیم کو عصر کے بعد تحفیظ القرآن کے حلقے یا کسی تفریحی جگہ لے جائے اور عشاء کے بعد واپس لے آئے۔

عبدالرحمٰن عمرِ عزیز کے دسویں سال میں تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ نوجوان اس سے خواہ مخواہ ایسے سوال کرے گا جن کا کوئی فائدہ یا سبب نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ تمھاری والدہ کا نام کیا ہے، تمھارا گھر کہاں ہے، تم کتنے بھائی ہو، تمھارے ابو تمھیں کتنا جیب خرچ دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے عبدالرحمٰن کو خبردار کر دیا: ''جب یہ بھائی تم سے کوئی غیر مناسب سوال کرے تو کہہ دینا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''آدمی کے حسن اسلام میں سے یہ امر بھی ہے کہ وہ ایسے کام چھوڑ دے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے حدیث کے الفاظ کئی بار دہرائے اور وہ اسے یاد ہو گئی۔

عبدالرحمٰن اور ابراہیم اس نوجوان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چل دیے۔ عبدالرحمٰن خاصا پروقار نظر آ رہا تھا۔ نوجوان نے لطافت بھرے لہجے میں کہا: ''عبدالرحمٰن، اللہ تمھیں خوش رکھے۔''

عبدالرحمٰن نے ترکی بہ ترکی کہا: ''اللہ آپ کو بھی خوش رکھے۔''

اس بے چارے نوجوان نے فضا نرم رکھنے کی کوشش میں پوچھا: ''تمھارے ابو کا آج کوئی لیکچر ہے؟''

عبدالرحمٰن نے حدیث دہرانے کی کوشش کی لیکن حافظے نے ساتھ نہیں دیا۔

پھر بھی اس نے چلا کر کہا: ''جو بات آپ سے متعلق نہیں اس میں دخل اندازی نہ کریں۔''

نوجوان نے کہا: ''نہیں، میرا مطلب ہے میں ان کے لیکچر میں حاضر ہو کر استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔''

عبدالرحمٰن نے سمجھا کہ وہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا ہے، اس نے دوبارہ وہی جواب دیا: ''جو بات آپ کے بارے میں نہیں اس میں دخل نہ دیں۔''

نوجوان ہکلایا: ''معاف کرنا۔ عبدالرحمٰن! میرا مطلب ہے کہ......

بچہ پھر چیخا: ''جو بات آپ سے تعلق نہیں رکھتی اس میں ٹانگ نہ اَڑائیں۔''

عبدالرحمٰن نے اپنا سخت رویہ برقرار رکھا حتی کہ وہ لوگ واپس آ گئے۔ عبدالرحمٰن نے بڑے فخر سے مجھے سارا ماجرا سنایا۔ اس کی باتوں پر مجھے بہت ہنسی آئی اور میں نے اسے دوبارہ بات سمجھائی۔

مشق

''نفس کو یہ باور کرانا کہ وہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دے ابتدا میں مشکل ہے لیکن یہ عمل آخر کار انسان کو بہت سکون پہنچاتا ہے۔''

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2317، وسنن ابن ماجة، حديث: 3976. [2] جامع الترمذي، حديث: 2317، و سنن ابن ماجة، حديث: 3976.

طفیلی سے کیسے نمٹا جائے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی دوست بغیر اجازت آپ کا موبائل فون لیتا ہے اور اس میں موجود پیغامات پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

میرا دوست شہر کی ایک بڑی دعوت میں شریک تھا جس کا اہتمام ایک قابلِ احترام جج نے کیا تھا۔ یہ رات کا کھانا تھا۔ مجلس میں زیادہ تعداد مشائخ و فضلاء کی تھی۔ میرا دوست بھی ان کے درمیان بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ جیب میں بھاری بھرکم موبائل فون کی موجودگی اسے اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔ اس نے موبائل فون نکالا اور پاس پڑی میز پر رکھ دیا۔ قریب بیٹھے شیخ بھی اس سے باتوں میں مشغول تھے۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق موبائل فون اٹھایا لیکن جب ان کی نظر سکرین پر پڑی تو چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے موبائل فون فوراً اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔ میرے دوست نے بڑی مشکل سے ہنسی دبائی۔

جب وہ دعوت سے نکلا تو میں بھی گاڑی میں اس کے ساتھ ہولیا۔ موبائل فون اس نے ایک طرف رکھ دیا جسے میں نے شیخ کی طرح اٹھایا اور اس کی سکرین دیکھ کر ہنس پڑا۔ جانتے ہیں، کیوں؟

لوگوں میں یہ چلن ہے کہ وہ اپنے موبائل فونوں کی سکرینوں پر مختلف عبارتیں لکھ دیتے

ہیں۔کوئی اپنا نام لکھ دیتا ہے تو کوئی ''اللہ کا ذکر کریں۔'' لکھ کر ذکر اللہ کی ترغیب دیتا نظر آتا ہے۔ میرے دوست نے موبائل فون کی سکرین پر لکھ رکھا تھا: ''اے او طفیلی! موبائل فون اس کی جگہ واپس رکھ دو۔''

اس نوع کے بہت سے لوگ دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ یہ عام سی بات ہے کہ ایک آدمی آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتا ہے، پھر سامنے کی دراز کھول کر کھود کرید کرنے لگتا ہے۔ یا ایک خاتون ہونٹوں پر سُرخی لگانے کے لیے ساتھی خاتون کا پرس کھول لیتی ہے۔ آپ سفر پر ہیں اور کوئی دوست آپ کے موبائل فون پر رابطہ کر کے پوچھتا ہے کہ آپ کہاں ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں سفر پر ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔ وہ پوچھتا ہے آپ کہاں ہیں؟ آپ کے ساتھ کون ہے؟ اور اسی طرح کے دیگر بے فائدہ سوال۔

چند افراد جن سے ہمارا تال میل ہوتا ہے، ہم سے یہی طرزِ عمل روا رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان سے کیسے نبٹیں۔

اس سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ آپ اپنا کوئی ساتھی ضائع مت کریں۔ کسی سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کریں۔ کوئی آپ سے ناراض نہ ہونے پائے۔ پیچیدہ صورتِ حال سے نکلنے میں ہوشیاری اور ذہانت کا مظاہرہ کریں۔ آپ کے اور اس کے درمیان کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ دشمن بنانے اور دوست ہاتھ سے گنوانے میں جلد بازی نہ کریں۔ سبب کچھ بھی ہو، احتیاط سے کام لیں۔ طفیلیوں سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سوال کا جواب سوال میں دیں یا مکمل طور پر موضوع بدل لیں تاکہ وہ اپنا سوال ہی بھول جائے۔ مثلاً طفیلی آپ سے سوال کرے کہ آپ کی ماہانہ تنخواہ کتنی ہے تو آپ مسکراتے ہوئے لطیفانہ جواب دیں:

''کیوں آپ نے میرے لیے کوئی اور پُرکشش ملازمت ڈھونڈ رکھی ہے؟''

وہ کہے گا: ''نہیں، بس یونہی پوچھا تھا۔''

آپ کہیں: ''تنخواہوں کی حالت آج کل پتلی ہی ہے۔ شاید پٹرول کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، اس لیے۔''

وہ کہے گا: ''پٹرول سے اس کا کیا تعلق؟''

آپ کہیں: ''پٹرول ہی تو قیمتیں کنٹرول کرتا ہے، اسی کی وجہ سے جنگیں برپا ہوتی ہیں۔''

وہ کہے گا: ''یہ بات درست نہیں۔''

آپ کہیں: ''اس کے دیگر اسباب بھی ہیں۔ دنیا میں ہر طرف جنگیں چھڑی ہوئی ہیں.....''

اب تک وہ اپنا پہلا سوال بھول چکا ہو گا۔ کیا خیال ہے؟ آپ ذرا سی ذہانت استعمال کر کے اس صورتِ حال سے بآسانی نکل سکتے ہیں۔

اسی طرح طفیلی آپ سے پوچھے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں یا آپ کہاں کا سفر کر رہے ہیں تو آپ کہیں: ''کیوں آپ بھی میرے ساتھ سفر کریں گے؟''

وہ کہے گا: ''نہیں، میں نہیں جانتا لیکن آپ مجھے بتائیے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

آپ کہیں: ''لیکن اگر آپ میرے ساتھ سفر کریں گے تو ٹکٹ آپ کے ذمے ہوں گے۔''

یوں ٹکٹ کی بات شروع ہو جائے گی اور وہ اپنا پہلا سوال بھول جائے گا۔ ہم اس جیسی صورتِ حال سے کسی مشکل کے بغیر اور دوسروں سے تعلقات خراب کیے بنا نکل سکتے ہیں۔

زرّیں

''آپ کا پالا کسی طفیلی سے پڑ جائے تو آپ بھی طفیلی نہ بنیں بلکہ اسے زچ کیے بغیر صورتِ حال سے باہر نکل آئیں۔''

تنقید نہ کریں

وہ دوست کی گاڑی میں سوار ہوا تو چھوٹتے ہی بولا: ''تمھاری گاڑی کتنی کھٹارا ہے؟''

اس کے گھر گیا تو سامانِ آرائش دیکھ کر کہا: ''اوہ! تم نے گھر کا سامان نہیں بدلا۔''

اس کے بچے دیکھے تو بولا: ''ماشاءاللہ! کتنے پیارے بچے ہیں۔ تم انھیں اس سے زیادہ خوب صورت کپڑے نہیں پہنا سکتے؟''

بیوی نے کھانا پیش کیا۔ بے چاری نے گھنٹوں باورچی خانے میں ٹھہر کر کھانا تیار کیا تھا۔ وہ بولا: ''تم نے چاول کیوں نہیں پکائے؟ اوہ! نمک کم ہے۔ یہ ڈش تو مجھے ذرا پسند نہیں۔''

پھلوں کی دکان پر جاتا ہے۔ دکان قسم قسم کے پھلوں سے اٹی پڑی ہے۔ وہ پوچھتا ہے: ''آم ملیں گے؟''

دکان دار جواب دیتا ہے: ''جی نہیں، آم گرمیوں میں ہوتا ہے۔''

وہ پوچھتا ہے: ''تربوز ہوگا؟''

دکان دار: ''نہیں۔''

وہ غصے میں لال پیلا ہو کر کہتا ہے: ''آپ کے پاس کوئی چیز نہیں تو یہ دکان کیوں کھول رکھی ہے؟'' اور یہ بھول جاتا ہے کہ دکان میں پھلوں کی چالیس سے زائد اقسام موجود ہیں۔

جی ہاں! بعض لوگ تنقید کر کر کے آپ کو زچ کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ انھیں جلدی کوئی چیز پسند آ جائے۔ مزیدار کھانے میں انھیں صرف وہ بال نظر آتا ہے جو انجانے میں گر پڑا تھا۔ صاف کپڑوں میں انھیں صرف سیاہی کا وہ ہلکا دھبہ ہی دکھائی دیتا ہے جو غلطی سے لگ گیا تھا۔ مفید کتاب میں انھیں کہیں سے پروف کی غلطی نظر آ جاتی ہے۔ ان کی تنقید سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ہمیشہ نکتہ چینی کرنے والے۔ ہر چھوٹی بڑی شے میں کیڑے نکالنے والے۔

میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو سیکنڈری اور یونیورسٹی کے دنوں میں طویل عرصے تک میرا ہم جماعت رہا ہے۔ ہمارے تعلقات اب بھی قائم ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ اس نے آج تک کسی شے کی تعریف کی ہو۔ میں نے اس سے اپنی کتاب کے بارے میں پوچھا جس کی لوگوں نے بڑی تعریف کی اور اس کے سیکڑوں ہزاروں نسخے اب تک نکل چکے ہیں۔ اس نے سرد مہری سے کہا: ''اچھی کتاب ہے۔ لیکن اس میں فلاں واقعہ غیر مناسب ہے۔ پوائنٹ کا سائز بھی مجھے پسند نہیں آیا۔ طباعت بھی گھٹیا قسم کی ہے۔ اور......''

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ فلاں کا اندازِ تقریر کیسا ہے۔ اس نے مقرر کا کوئی اچھا پہلو بیان نہ کیا۔ وہ مجھ پر بہت گراں بار ہو گیا۔ اب میں کسی بھی شے کے متعلق اس کی رائے نہیں پوچھتا۔

بعض افراد مثالیت (Idealism) کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا شخص چاہتا ہے کہ اس کی بیوی چوبیس گھنٹے گھر کو شیشے کی مانند چمکا کر رکھے اور اس کے بچے سارا دن صاف ستھرے اٹن شن رہیں۔ مہمان آئیں تو انھیں بہترین کھانا ملے۔ بیوی کے پاس بیٹھے تو وہ اس سے خوب صورت باتیں کرے، تلخی پیدا نہ کرے۔ بچے بھی ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اپنے رفقائے کار سے اور گلی، محلے، سڑک، بازار میں ملنے والے ہر شخص سے وہ یہی چاہتا

ہے کہ اس کا رویہ سو فیصد ٹھیک ٹھاک ہو۔ ان میں سے کوئی ذرا سی بھی کوتاہی کرے تو وہ اپنی تیز دھار زبان سے جا و بے جا تنقید کرتا اور قدم قدم پر نکتہ چینی سے دوسروں کو بدمزہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ لوگ اس سے اکتا جاتے ہیں کیونکہ اسے سفید براق صحیفوں میں صرف سیاہ دھبے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جس شخص کی یہ حالت ہے اس نے دراصل اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔ قریبی رشتے دار بھی اس سے کتراتے اور اس کی صحبت کو ثقیل سمجھتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

إِذَا أَنْتَ لَمْ تَشْرَبْ مِرَاراً عَلَى الْقَذَا
ظَمِئْتَ، وَأَيُّ النَّاسِ تَصْفُو مَشَارِبُهُ؟!

''تم ہر بار کڑوا پانی پینے سے انکار کرو گے تو پیاسے رہ جاؤ گے۔ اور کتنے لوگ ہیں جنھیں صاف پانی ملتا ہے؟!''

إِذَا كُنْتَ فِي كُلِّ الْأُمُورِ مُعَاتِبًا
رَفِيقَكَ، لَنْ تَلْقَ الَّذِي سَتُعَاتِبُهُ

''تم ہر کام میں اپنے رفیق پر نکتہ چینی کرو گے اور اسے ڈانٹ پلاؤ گے تو یاد رکھو! ایک وقت ایسا آئے گا جب تمھاری ڈانٹ برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔''

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ بھی ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا﴾

''اور جب تم بات کرو تو عدل و انصاف سے کام لو۔''[1]

امّی جان عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کا گھر والوں سے رویہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ بھوک ہوتی تو کھا لیتے

ورنہ چھوڑ دیتے۔''[2]

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی شے کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔

انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''واللہ! میں نے نو سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کوئی کام کیا ہو اور آپ نے پوچھا ہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ مجھ پر آپ نے کبھی نکتہ چینی نہیں کی اور واللہ! نہ کبھی آپ نے مجھے اُفّ کہا۔[3]

رسول اللہ ﷺ ایسے ہی تھے اور ہمیں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہاں یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ میں خدانخواستہ نصیحت نہ کرنے اور غلطیاں دیکھ کر خاموش رہنے کی دعوت نہیں دے رہا۔ لیکن ہر شے میں اور خاص طور سے دنیاوی معاملات میں دقیقہ سنج نہ بنئے اور حالات کے مطابق ڈھلنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کے گھر مہمان آتا ہے۔ آپ اسے چائے پیش کرتے ہیں۔ وہ پیالی میں جھانک کر کہتا ہے: ''آپ نے پیالی کیوں نہیں بھری؟'' آپ کہتے ہیں:

''کچھ اور چائے ڈال دوں۔''

وہ کہتا ہے: ''نہیں، نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ پانی مانگتا ہے۔ آپ پانی کا گلاس حاضر کرتے ہیں، وہ پانی پی کر کہتا ہے: ''پانی ٹھنڈا نہیں تھا۔'' پھر وہ ایئر کنڈیشنر کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے: ''یہ اے سی ٹھنڈک نہیں کرتا۔'' اور گرمی کا رونا رونے لگتا ہے۔ بتائیں! ایسے انسان کا وجود آپ کے لیے گراں نہیں ہوگا اور آپ تمنا نہیں کریں گے کہ وہ آپ کے گھر سے نکل جائے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔

ثابت ہوا کہ لوگ زیادہ تنقید پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ کسی جگہ سمجھتے ہوں کہ یہاں تنقید کی ضرورت ہے تو اسے خوشنما غلاف میں لپیٹ کر دوسروں کے سامنے پیش کیجیے۔

بالواسطہ، عام الفاظ میں یا مشورے کے انداز میں تنقید کریں۔

رسول اللہ ﷺ جب کسی کی غلطی ملاحظہ کرتے تو منہ پر اس کا اظہار نہ کرتے بلکہ کہتے:

''کچھ لوگوں کو کیا ہے کہ وہ ایسا اور ایسا کرتے ہیں؟''

ایک دن تین گرم جوش نوجوان مدینہ آئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی عبادت اور نماز کی کیفیت کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔ انھوں نے ازواجِ نبی ﷺ سے گھر میں آپ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھا۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے انھیں بتایا کہ آپ ﷺ کبھی روزہ رکھتے ہیں اور کبھی نہیں رکھتے۔ رات کا کچھ حصہ سوتے ہیں اور کچھ حصہ نماز پڑھتے ہیں۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا: ''یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ نے ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔''

یہ کہہ کر تینوں نے ایک ایک فیصلہ کیا۔

ایک نے کہا: ''میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔''

تیسرے نے کہا: ''میں رات کو آرام کے بجائے ہمیشہ قیام کروں گا۔''

ان تینوں کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی۔ آپ فوراً منبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا:

''چند افراد کو کیا ہو گیا ہے۔ انھوں نے یہ اور یہ باتیں کی ہیں۔ لیکن میں تو نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے کنارہ کشی کی وہ مجھ سے نہیں۔''[4]

ایک اور موقع پر نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ بعض نمازی دورانِ نماز آسمان کی طرف

دیکھتے ہیں۔ یہ غلطی تھی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ نماز کے دوران سجدہ گاہ پر نظر رکھی جائے۔
آپ ﷺ نے فرمایا:

''چند لوگوں کو کیا مشکل ہے کہ وہ نماز کے دوران آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔''

اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو آپ نے ان کے نام لے کر توجہ دلانے کے بجائے صرف اتنا کہا:

''یہ لوگ اس کام سے باز آ جائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔''[5]

مدینہ میں ایک لونڈی بریرہ تھی جو آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے آقا سے اس بارے میں بات کی۔ آقا نے کچھ رقم ادا کرنے کی شرط لگائی۔ بریرہ، عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور ان سے اس سلسلے میں مدد کی طالب ہوئی۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے کہا: ''تم چاہو تو میں تمھیں رقم دے دوں گی اور تم آزاد ہو جانا لیکن ولاء (آزادی کی نسبت) میری ہوگی۔''

بریرہ نے اپنے آقا سے بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھائے۔ آزادی کی قیمت بھی حاصل کرے اور نسبت بھی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے دریافت کیا تو آپ کو تعجب ہوا کہ بریرہ کا آقا کتنا لالچی ہے۔ بے چاری لونڈی کو آزاد ہونے سے روک رہا ہے۔ آپ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

''تم اسے خرید کر آزاد کر دو۔ ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرے۔''

پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''چند لوگوں کو کیا ہو گیا ہے (نام نہیں لیا) کہ وہ ایسی شرائط عائد کرتے ہیں جن کا کتاب اللہ میں کوئی وجود نہیں۔ جس نے ایسی شرط عائد کی جو کتاب اللہ میں نہیں اسے کچھ نہیں ملے گا، چاہے وہ سو شرطیں لگاتا پھرے۔''[6]

جی ہاں! بالکل اسی طرح دور سے ڈنڈے کا اشارہ کریں لیکن ماریں مت۔ مثلاً آپ

کی بیگم صاحبہ گھر کی صفائی ستھرائی پر توجہ نہیں دیتیں تو آپ ان سے کہہ سکتے ہیں: ''کل رات میں نے فلاں دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ اس کے گھر کی صفائی کا کیا کہنا۔ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔''

آپ کا صاحبزادہ نماز کے لیے مسجد نہیں جاتا تو آپ اس سے کہیں: ''خالد صاحب (پڑوسی) کے بیٹے حامد کو ہر نماز کے وقت مسجد میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔''

یہاں آپ مجھ سے سوال کر سکتے ہیں کہ لوگ تنقید کیوں پسند نہیں کرتے۔ دراصل تنقید انھیں کوتاہی کا احساس دلاتی ہے اور کوئی آدمی اپنے آپ کو کوتاہ باور نہیں کرنا چاہتا۔

کہتے ہیں کہ ایک سادہ آدمی کو یہ شوق چرایا کہ مجھے بھی کسی شے میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق ہونا چاہیے۔ اس نے پانی کے دو تھرماس لیے۔ ایک سبز اور دوسرا سُرخ۔ انھیں ٹھنڈے یخ پانی سے بھرا، پھر راستے میں بیٹھ گیا اور آواز لگانے لگا: ''ٹھنڈا یخ پانی بالکل مفت۔'' کوئی پیاسا اس کی طرف آتا اور سبز بوتل سے پانی پینے لگتا تو وہ کہتا: ''نہیں، سرخ سے پیو۔'' وہ سرخ بوتل سے پی لیتا۔ دوسرا آتا اور سُرخ بوتل سے پینا چاہتا تو وہ حکم دیتا: ''نہیں، سبز بوتل سے پیو۔'' کوئی اعتراض کرتا کہ دونوں بوتلوں کے پانی میں کیا فرق ہے تو وہ کہتا: ''پانی ٹھیک ہونے کی ذمّے داری مجھ پر ہے۔ آپ کو اچھا لگتا ہے تو پانی پیجیے ورنہ کوئی اور انتظام کر لیں۔''

یہ دراصل انسان کے اُس دائمی احساس کا اظہار ہے کہ اسے معتبر اور نہایت اہم گردانا جائے۔

شہد کی مکھی اور گھریلو مکھی

’’شہد کی مکھی کا طرزِ عمل اپنائیں جو میٹھے پر بیٹھتی اور کڑوے سے کتراتی ہے۔ گھریلو مکھی کی طرح نہ ہوں جو ہمیشہ زخموں کی تلاش میں رہتی ہے۔‘‘

---

[1] الأنعام 152:6. [2] صحيح البخاري، حديث: 5409، وصحيح مسلم، حديث: 2064.
[3] صحيح البخاري، حديث: 6038، وصحيح مسلم، حديث: 2309، و مسند أحمد: 227/3.
[4] صحيح البخاري، حديث: 5063، وصحيح مسلم، حديث: 1401. [5] صحيح البخاري، حديث: 750. [6] صحيح البخاري، حديث: 2560، وصحيح مسلم، حديث: 1504.

استاد بننے کی کوشش مت کریں

تین آدمیوں کا موازنہ کیجیے جن میں سے ہر ایک اپنے بیٹے کو امتحانات کے دنوں میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا پاتا ہے۔

پہلا کہتا ہے: ''حامد! چلو امتحان کی تیاری کرو۔''

دوسرا کہتا ہے: ''ماجد! تم نے امتحان کی تیاری نہ کی تو واللہ میں تمھیں ماروں گا اور جیب خرچ بھی نہیں دوں گا۔''

تیسرا آدمی اپنے بیٹے سے کہتا ہے: ''جواد بیٹا! اگر تم امتحان کی تیاری کرو تو یہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے بہتر ہے، ٹھیک ہے نا؟''

ان تینوں میں سے کس آدمی کا اندازِ تنبیہ اچھا ہے؟ یقیناً تیسرے آدمی کا۔ کیونکہ اس نے مشورے کے انداز میں حکم صادر کیا ہے۔

کوئی انسان غلطی کر بیٹھے تو اسے سمجھاتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیجیے کہ اسے احساس ہو کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی اپنی سوچ بھی وہی ہے۔ آپ کا بیٹا نماز کے لیے مسجد نہیں گیا تو آپ اس سے کہیں:

''سعد! تم جنت میں نہیں جانا چاہتے؟ جانا چاہتے ہو نا! تو نمازوں کی پابندی کیا کرو۔''

ایک اعرابی کے ہاں سیاہ بچے نے جنم لیا۔ اسے تعجب ہوا کہ میں اور میری بیوی دونوں

گورے ہیں تو یہ سیاہ بچہ کہاں سے آ گیا۔ شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ وہ پریشانی کی حالت میں مدینہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرے ہاں سیاہ بچے نے جنم لیا ہے جبکہ ہمارے خاندان میں کوئی آدمی سیاہ نہیں۔''

نبی ﷺ اسے دوسروں پر اعتماد کرنے اور بیوی پر تہمت نہ لگانے کے متعلق نصیحت کر سکتے تھے لیکن آپ نے اُسے سمجھانے کے لیے ایسا انداز اختیار کیا جس کے ذریعے سے وہ آدمی بذاتِ خود اپنی مشکل حل کرنے کی کوشش کرتا۔

آپ نے اُس کی طرف دیکھ کر دریافت کیا:

''کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں؟''

اس نے کہا: ''ہاں۔''

''کس رنگ کے؟''

''سرخ۔'' اعرابی نے جواب دیا۔

''ان میں کوئی سیاہ اونٹ بھی ہے؟''

''نہیں۔''

''کوئی خاکستری اونٹ؟''

''خاکستری ہے۔'' اعرابی بولا۔

''وہ کہاں سے آیا؟''

اعرابی نے تھوڑی دیر سوچا، پھر بولا: ''ہوسکتا ہے اُسے کوئی رگ کھینچ لائی ہو۔''

یعنی اونٹ کے آباء واجداد میں کوئی خاکستری اونٹ ہوگا اور مشابہت نسل میں باقی رہ گئی ہوگی جو اس اونٹ میں ظاہر ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہوسکتا ہے تمھارے اس لڑکے کو بھی کوئی رگ ہی کھینچ لائی ہو۔''[1]

آدمی نے یہ جواب سنا تو سوچ میں پڑ گیا۔ اسے ادراک ہوا کہ یہ جواب تو اس کا اپنا جواب ہے اور یہ سوچ بھی اس کی اپنی سوچ ہے۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے انھیں ابوابِ خیر (بھلائی کے دروازوں) کے متعلق بتاتے ہوئے کہا:

«وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ»

''مسلمان کی شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے۔''

صحابہ نے تعجب سے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کوئی اپنی شہوت پوری کرے تو اس میں بھی اجر ہوگا؟''

آپ نے انھیں ایسا جواب دیا جس سے انھیں احساس ہوا کہ یہ فکر ان کا اپنا فکر ہے اور وہ بغیر کسی بحث و تکرار کے مطمئن ہو گئے۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا:

''یہ بتائیں کہ اگر آدمی حرام طریقے سے شہوت پوری کرے تو اسے گناہ ہوگا؟''

صحابۂ کرام بیک زبان ہو کر بولے: ''جی ہاں۔''

اس پر آپ نے فرمایا:

''اسی طرح اگر وہ حلال طریقے سے شہوت پوری کرے تو اسے اجر ملے گا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ چودہ سو صحابۂ کرام کے ہمراہ عمرے کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس سلسلے میں حدیبیہ کے واقعات مشہور ہیں۔ قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد صلح پر اتفاق ہو گیا۔ قریش کی جانب سے صلح نامے پر سہیل بن عمرو نے دستخط کیے۔ رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو سے جن شرائط پر اتفاق کیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

① ”مسلمان عمرہ کیے بغیر الٹے پاؤں مدینہ لوٹ جائیں۔“

② ”اہل مکہ میں سے جو اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کرنا چاہے، مسلمان اسے مدینے میں نہیں آنے دیں گے۔“

③ ”جو اسلام سے مرتد ہو کر اہلِ مکہ سے ملنا چاہے، اسے روکا نہیں جائے گا۔“

ان شرائط سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان شکست کھا گئے ہیں۔ قریش دراصل مسلمانوں کے اتنے بڑے لشکر سے خائف تھے۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمان چاہیں تو مکہ فتح کر سکتے ہیں۔ یہی سوچ کر قریش نے مجبوراً مصالحت کی طرف قدم بڑھایا۔ انھوں نے کبھی خواب میں بھی یہ گمان نہیں کیا ہو گا کہ وہ ان شرائط پر معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاہدے کی شرائط پر صحابۂ کرام کی اکثریت تشویش کا شکار تھی۔ اعتراض کی مجال کسی کو نہیں تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے صلح نامے پر دستخط کرنے والی ہستی وہ تھی جس نے اپنی مرضی سے کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس موقع پر عمر رضی اللہ عنہ خاصے جذباتی نظر آ رہے تھے۔ اُن سے صبر نہ ہوا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس دل کا غبار نکالنے آ گئے۔ لیکن دامنِ حکمت ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ گفتگو کی ابتدا ایسی اصولی باتوں سے کی جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلا سوال یہ پوچھا:

”ابوبکر! کیا یہ اللہ کے رسول نہیں؟“

”بالکل ہیں۔“ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

”کیا ہم مسلمان نہیں؟“

”کیوں نہیں۔“

”کیا وہ لوگ مشرک نہیں؟“

”بالکل، مشرک ہیں۔“

''کیا ہم حق پر نہیں؟''

''کیوں نہیں، ہم حق پر ہیں۔''

''کیا وہ لوگ باطل پر نہیں؟''

''بالکل، وہ باطل پر ہیں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت تحمل سے جواب دیے جا رہے تھے۔

''پھر ہم اپنے دین کے معاملے میں گھٹیا شے کیوں قبول کریں؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ اس سوال پر چونک اٹھے۔ انھوں نے کہا:

''عمر! کیا وہ اللہ کے رسول نہیں؟''

''بالکل ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

''پھر اُن کا دامن تھامے رہیے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تاکید کی۔

عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ کہہ کر عمر رضی اللہ عنہ چل دیے۔ لاکھ صبر کیا لیکن سینے میں اُبال اٹھتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے۔

پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! آپ اللہ کے رسول نہیں؟''

فرمایا:

''کیوں نہیں!''

''کیا ہم مسلمان نہیں؟''

''بالکل (مسلمان ہیں۔)''

''کیا وہ لوگ مشرک نہیں؟''

''کیوں نہیں! (وہ مشرک ہیں۔)''

آپ ﷺ نے جواب دیا۔

''پھر ہم اپنے دین کے معاملے میں گھٹیا شے کیوں قبول کریں؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔''[3]

عمر رضی اللہ عنہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ معاہدے کی تحریر مکہ پہنچ گئی۔ مسلمان مدینہ لوٹ آئے۔ گردشِ ایام جاری رہی۔ قریش نے معاہدہ توڑ دیا اور نبی ﷺ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور اللہ کا محترم و مکرم گھر بتوں کی آلائش سے پاک کیا۔ تب عمر رضی اللہ عنہ کو ادراک ہوا کہ معاہدے کی شرائط پر ان کا اعتراض درست نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: ''اس دن جو باتیں میرے منہ سے نکلیں، ان پر مواخذے کے خوف سے میں تادیر روزے رکھتا، صدقہ کرتا، نوافل پڑھتا اور غلام آزاد کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے امید ہو گئی کہ اب بھلا ہو گا۔''

عمر رضی اللہ عنہ کے اندازِ گفتگو کے کیا کہنے اور رسول اللہ ﷺ کے اسلوبِ تعلیم پر قربان جائیے۔ دونوں حضرات کے اس طرزِ عمل سے ہم زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟

مثلاً آپ کا لڑکا قرآن کے حفظ پر زیادہ توجہ نہیں دیتا اور آپ چاہتے ہیں کہ اس کا شوق بڑھ جائے تو اس سے بات کرتے وقت سب سے پہلے ان باتوں کا تذکرہ کریں جن پر آپ دونوں متفق ہیں۔

''کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم سے محبت کرے؟''

''کیا تم نہیں چاہتے کہ جنت میں بلند درجہ پاؤ؟''

وہ یقیناً جواب میں کہے گا: ''کیوں نہیں۔''

اب مشورے کے انداز میں نصیحت کریں: ''تب اگر تم قرآن حفظ کرنے مسجد جایا کرو تو کیسا رہے گا؟'' یوں ہم احساس دلائے بغیر لوگوں سے اپنی توقعات پوری کرا سکتے ہیں۔

کرن

''مکھیوں کا چھتا توڑے بغیر آپ شہد کھا سکتے ہیں۔''

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1499، وسنن ابن ماجة، حديث: 2003. 2 صحيح مسلم، حديث: 1006، ومسند أحمد: 167/5. 3 صحيح البخاري، حديث: 3182، ومسند أحمد: 325/4.

عدل وانصاف سے کام لیں

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے تدریس کا شعبہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوب صورت اندازِ تدریس سے نوازا ہے۔ طلبہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ صبح ہمیشہ دیر سے نہ آیا کریں۔''

''تم خوب صورت ہو۔ گھر بھی صاف ستھرا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بچے کھیل کود کرتے ہیں، پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم ان کے لباس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھا کرو۔''

احمد کا لوگوں سے یہی رویہ تھا۔ وہ غلطی کرنے والے کے روشن پہلوؤں کا تذکرہ کرتا، پھر غلطی سے آگاہ کرتا تاکہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوں۔

تنقید کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ سب سے پہلے غلطی کرنے والے کی خوبیوں کا تذکرہ کریں۔ آپ کے مخاطب کو ہمیشہ یہ احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی نظر اس کے روشن پہلوؤں پر ہے اور یہ کہ آپ اسے غلطیوں سے آگاہ کر رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی نظروں سے گر چکا ہے یا آپ اس کی اچھائیاں فراموش کر کے صرف برائیوں کا حساب رکھتے ہیں۔

نہیں بلکہ اُسے احساس دلایئے کہ اس کی خامیاں، خوبیوں کے مقابلے میں، آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کو بہت محبوب تھے۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ آپ کا اُن سے طرزِ عمل عمدہ رویوں پر مشتمل تھا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی گویا گہری سوچ میں ڈوبے ہیں یا کسی شے کے منتظر ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''وقت آ گیا ہے کہ لوگوں کے درمیان سے علم اُچک لیا جائے گا اور لوگوں کے حافظے میں اس کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہے گا۔''

یعنی لوگ قرآن اور اس کے تعلیم و تعلّم سے منہ پھیر لیں گے، شرعی علوم حاصل کرنے سے کترائیں گے، نہ انھیں علم حاصل کرنے کا شوق ہوگا اور نہ وہ ان کی سمجھ میں آئے گا۔

جلیل القدر صحابی زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور جوش میں آ کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! علم ہمارے درمیان سے کیونکر اُچک لیا جائے گا جبکہ ہم قرآن پڑھ چکے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم اسے پڑھتے رہیں گے اور اپنے بیوی بچوں کو بھی پڑھا دیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ایک نظر اس نوجوان انصاری کو دیکھا جو غیرتِ دینی سے سرشار تھا۔ آپ نے اسے فہم کی غلطی سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

''زیاد! تمھاری ماں تمھیں گم پائے! میں تو تمھارا شمار اہلِ مدینہ کے فقہاء میں کیا کرتا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر برسرِ عام زیاد کی ستائش کی کہ وہ فقہائے مدینہ میں سے ہیں۔ یہ زیاد کی زندگی کے روشن صفحات کا تذکرہ تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہود و نصاریٰ کے پاس تورات و انجیل موجود ہیں۔ ان کتابوں نے انھیں آخر کیا فائدہ پہنچایا؟''[1]

مطلب یہ کہ قرآن کے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو اسے پڑھنا، اس کے

معانی ومطالب پر غور وفکر کرنا اوراس کے احکامات پر عمل کرنا ہے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک عرب قبیلے کے پاس سے ہوا۔ آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے نکلے تھے۔ قبیلے کا نام تھا: ''بنوعبداللہ'' آپ نے انھیں اللہ کی طرف بلاتے ہوئے کہا:

''اے بنوعبداللہ! اللہ نے تمھارے باپ کو بڑا اچھا نام دیا تھا۔''[2]

یعنی تم بنوعبدالعزی یا بنوعبداللات کے بجائے بنوعبداللہ ہو۔

تمھارے نام میں شرک نہیں، اس لیے اسلام کی چھاؤں میں آجاؤ۔

اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی بے مثال مہارت کا ایک خوب صورت پہلو یہ بھی تھا کہ آپ لوگوں کو بالواسطہ پیغامات بھیجتے جن میں اُن کی خوبیوں اوران کے لیے خیر خواہی کا ذکر ہوتا۔ لوگوں کو یہ بالواسطہ پیغامات پہنچتے تو ان کی تاثیر بعض اوقات براہِ راست دعوت سے زیادہ ہوتی۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو نہایت جری، بہادر، نڈر اور بے خوف جنگجو تھے، نبی ﷺ کی بے پناہ خواہش تھی کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ لیکن ایسا کیونکر ہوتا؟ خالد تو مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں پیش پیش رہے تھے۔ احد کے معرکے میں مسلمانوں کی ہزیمت کا بڑا سبب وہی تھے۔

ان کے متعلق ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ اگر ہمارے پاس آجائیں تو ہم ان کا اکرام کریں گے اور انھیں دوسروں پر ترجیح دیں گے۔ اس چھوٹے سے تعریفی جملے کی تاثیر جاننے کے لیے پورا واقعہ سماعت کیجیے۔

خالد بن ولید کا شمار کفار کے قائدین میں ہوتا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے ہمیشہ مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ نبی ﷺ مسلمانوں کو

ساتھ لے کر عمرے کی غرض سے حدیبیہ روانہ ہوئے تو خالد بن ولید بھی مشرکین کے چند گھڑسواروں کے ہمراہ نکلے۔ مسلمانوں سے اُن کا سامنا عسفان کے مقام پر ہوا۔ خالد نے اُن کے قریب ہی پڑاؤ ڈالا اور نبی ﷺ پر حملہ کرنے کے لیے مواقع کی تلاش میں رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو ظہر کی نماز پڑھائی تو انھوں نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ رسول اللہ ﷺ کو اُن کی موجودگی کا علم ہوا تو آپ نے مسلمانوں کے ساتھ عصر کی نماز صلاۃ الخوف کے طور پر ادا کی، یعنی آپ نے مسلمانوں کو دو دستوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دستے نے آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور دوسرا پہرے پر مامور رہا۔ خالد اور ان کے ساتھیوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''اس آدمی کی حفاظت کی جا رہی ہے۔''

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ کوچ کیا اور دائیں طرف کا مختلف راستہ اپنایا تاکہ اُن کا گزر خالد اور ان کے ساتھیوں کے قریب سے نہ ہو۔ آپ حدیبیہ پہنچے، قریش سے اس شرط پر صلح کا معاہدہ کیا کہ آئندہ سال عمرے کے لیے آئیں گے اور مدینہ لوٹ گئے۔

خالد نے دیکھا کہ عرب میں قریش کی قدر روز بروز گھٹ رہی ہے، انھوں نے سوچا کہ اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ اب میں کہاں جاؤں۔ نجاشی کے پاس چلا جاؤں؟ لیکن نہیں! وہ محمد (ﷺ) کا پیروکار ہو گیا ہے اور محمد کے ساتھی اس کے ہاں سکون سے رہ رہے ہیں۔ یا پھر ہرقل کے ملک چلا جاؤں؟ لیکن نہیں! میں اپنا دین چھوڑ کر یہودیت یا نصرانیت کیوں اپناؤں اور عرب کو خیر باد کہہ کر عجم کیوں جا بسوں؟

خالد اسی شش و پنج میں رہے اور ایک سال گزر گیا۔ مسلمان عمرہ کرنے مکہ آئے۔ خالد سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ وہ مکہ سے نکل گئے اور چار دن تک غائب رہے۔ رسول اللہ ﷺ

نے مکہ میں چار دن قیام کیا اور مناسکِ عمرہ ادا کیے۔ اس دوران آپ مکہ کے راستوں میں چلتے پھرتے، قدیم گھروں میں آتے جاتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ بہادر خالد بن ولید یاد آیا تو اُن کے بھائی ولید بن ولید سے مخاطب ہوئے جو مسلمان تھے اور مسلمانوں کی ہمراہی میں عمرہ کرنے آئے تھے۔ آپ نے خالد بن ولید کو بالواسطہ پیغام بھیجنا چاہا جس کے ذریعے سے وہ اسلام کی طرف راغب ہوتے۔

آپ نے ولید بن ولید رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا:

''خالد کہاں ہیں؟''

ولید کے لیے یہ سوال بہت اچانک تھا۔ انھوں نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ انھیں لے آئے گا۔''

آپ نے فرمایا:

''اُن جیسا انسان اسلام سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے اپنی بہادری اور تیزی سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا ہوتا تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا۔''

پھر آپ نے فرمایا:

''اگر وہ ہمارے پاس آجائیں تو ہم اُن کا اکرام کریں گے اور انھیں دوسروں پر ترجیح دیں گے۔''[3]

ولید یہ بات سن کر خوشی خوشی خالد بن ولید کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن وہ مکہ میں نہ ملے۔

مسلمانوں نے مدینہ روانگی کا ارادہ کیا تو ولید بن ولید نے اپنے عزیز بھائی کو خط لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد! میرے لیے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز بات کوئی نہیں کہ آپ کا دل ابھی تک اسلام کی طرف مائل نہیں ہوا، حالانکہ آپ اچھے خاصے ذی شعور

انسان ہیں اور کوئی عقل مند انسان اسلام جیسی نعمت سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے آپ کے متعلق پوچھا تھا کہ خالد کہاں ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ اللہ انھیں لے آئے گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اُن جیسا آدمی بھی اسلام سے بے بہرہ رہ سکتا ہے! اگر انھوں نے اپنی بہادری اور قابلیت سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا ہوتا تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ وہ ہمارے پاس آجائیں تو ہم ان کا اکرام کریں گے اور انھیں دوسروں پر مقدم رکھیں گے۔''

اس لیے اے میرے بھائی! اس موقع سے فائدہ اٹھایئے اور جو بھلائیاں آپ کے حصے میں آنے سے رہ گئی تھیں، انھیں حاصل کر لیجیے۔''

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں: ''جونہی مجھے ولید کا خط ملا، میں روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس خط نے اسلام کے بارے میں میرا شوق بڑھا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے متعلق دریافت کیا، اس سے بھی مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے خواب میں بھی دیکھا تھا کہ بنجر، بے آباد اور تنگ زمین سے نکل کر کھلی اور سرسبز و شاداب جگہ آ گیا ہوں۔ میں نے سوچا یہ یقیناً سچا خواب ہے۔ پھر جب میں نے نبی ﷺ کی طرف روانہ ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا تو دل میں آیا کہ میرا ہم سفر کون ہو۔ میں صفوان بن امیہ سے ملا اور کہا: ''ابو وہب! تم دیکھتے نہیں ہماری کیا حالت ہے؟'' ''ہم تو داڑھوں کی طرح ہیں جو ایک دوسری کو پیستی رہتی ہیں۔ محمد (ﷺ) عرب و عجم پر غالب آ چکے ہیں۔ اگر ہم محمد (ﷺ) کے پاس چلیں اور ان کی پیروی کا اقرار کر لیں تو کیسا رہے۔ محمد (ﷺ) کا شرف ہمارا شرف نہیں؟''

صفوان بن امیہ نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا: ''میری قوم میں میرے سوا اور کوئی باقی نہ رہے، تب بھی محمد (ﷺ) کی تابعداری کا اقرار نہیں کروں گا۔''

پھر ہم علیحدہ ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا: ''یہ آدمی زخم خوردہ ہے۔ اس کا والد اور

بھائی معرکۂ بدر میں مقتول ہوئے تھے۔"

صفوان کے بعد میں عکرمہ بن ابی جہل سے ملا۔ اُس سے بھی وہی بات کہی جو صفوان سے کہی تھی۔ اس نے بھی مجھے وہی جواب دیا جو صفوان نے دیا تھا۔ میں نے کہا: "اچھا تمھاری مرضی۔ لیکن یہ بات راز رکھنا کہ میں محمد (ﷺ) سے ملنے مدینے روانہ ہوا ہوں۔"

اس نے کہا: "ٹھیک ہے۔ میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد میں گھر گیا، سواری تیار کرنے کو کہا اور نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں عثمان بن طلحہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے سوچا: "یہ میرا دوست ہے۔ اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرتا ہوں، پھر مجھے یاد آیا کہ مسلمانوں سے جنگوں میں اس کے بھی کئی عزیز و اقارب ہلاک ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ان مقتولین کی یادیں اس کے دل میں تازہ کر دوں۔"

پھر مجھے خیال آیا کہ اگر اسے بتا بھی دوں تو میرا کیا جائے گا۔ میں تو اسی لمحے کوچ کرنے والا ہوں۔ میں نے اس سے قریش کی دگرگوں حالت کا ذکر کیا اور کہا: "ہم کھوہ میں گھس کر بیٹھے لومڑ کی طرح ہیں، جس پر پانی کا ڈول بہایا جائے تو وہ نکل بھاگے۔"

عثمان بن طلحہ سے میں نے وہ بات بھی کہی جو صفوان اور عکرمہ سے کہہ آیا تھا۔ اس نے فوراً آمادگی ظاہر کی اور میری ہمراہی میں مدینہ جانے کا عزم کر لیا۔ میں نے اس سے کہا: "میں آج ہی گھر سے نکلا تھا اور مدینے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ یہ میری سواری بھی تیار ہو کر راستے پر رواں دواں ہے۔"

ہم نے طے کر لیا کہ کل یاجج میں اکٹھے ہوں گے۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائے تو میرا انتظار کرے گا اور میں اس سے پہلے پہنچ جاؤں تو اس کا انتظار کروں گا۔

میں اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں قریش کو ہماری روانگی کا علم نہ ہو جائے، سحری کے

وقت گھر سے نکلا۔ پو پھوٹنے سے پہلے ہم یاجج میں اکٹھے بیٹھے تھے۔ ہم نے فوراً سفر کا آغاز کر دیا اور ہدّہ پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں عمرو بن العاص ملے۔ وہ اونٹ پر سوار تھے۔ انھوں نے ہمیں دیکھ کر کہا:

''قوم کو مرحبا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟''

ہم نے الٹا سوال کر دیا: ''آپ کدھر جا رہے ہیں؟''

انھوں نے ہمارا سوال نظر انداز کرتے ہوئے، پھر سوال داغ دیا:

''اور آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

''اسلام قبول کرنے جا رہے ہیں۔'' ہم نے جواب دیا۔

انھوں نے خوش ہو کر کہا: ''یہی ارادہ میرا بھی ہے۔''

اب ہم تینوں نے اکٹھے سفر شروع کیا اور مدینہ میں داخل ہو کر سواریاں حرہ کے باہر بٹھا دیں۔ رسول اللہ ﷺ کو ہماری آمد کی اطلاع دی گئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ میں نے خوشنما لباس زیب تن کیا اور رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا۔ راستے میں بھائی ولید سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا: ''جلدی کیجیے۔ نبی ﷺ کو آپ کے متعلق بتایا گیا ہے۔ وہ آپ کی آمد سے بہت خوش ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔''

ہم جلدی چلے، رسول اللہ ﷺ نے مجھے دور سے آتے دیکھا تو مسکرائے اور میرے قریب آنے تک مسکراتے رہے۔ میں نے آپ کو سلامِ نبوت پیش کیا۔ آپ نے کشادہ روئی سے سلام کا جواب دیا۔

میں نے کہا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آپ کو ہدایت دی۔ میں نے آپ میں شعور کی روشنی دیکھی تھی۔ مجھے امید تھی کہ یہ روشنی آپ کو خیر ہی کی طرف لے جائے گی۔"

میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! میں آپ کے خلاف جنگیں لڑتا رہا اور جانتے بوجھتے حق کی مخالفت کرتا رہا۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ میرے گناہ بخش دے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْإِسْلَامُ يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهُ»

"اسلام پچھلے گناہ مٹا دیتا ہے۔"

میں نے کہا: "یا رسول اللہ! اس کے باوجود، میرے لیے بخشش کی دعا کیجیے۔"

آپ ﷺ نے دعا کی:

"اے اللہ! خالد بن ولید کو معاف کر دے۔"

اس کے بعد سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام کی ممتاز شخصیات میں شمار کیے گئے۔

ان کے اسلام کی وجہ وہ بالواسطہ پیغام بنا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اُنھیں ملا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا اسلوبِ زندگی کیسا عمدہ اور حکمت بھرا تھا۔ ہمیں بھی لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے یہی مہارتیں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ آس پاس کے لوگوں سے حسنِ ظن رکھتے ہوئے ان کی اچھائیاں تلاش کیجیے جن میں ان کی برائیاں گم ہو جائیں۔ لوگوں کو آپ کی منصف مزاجی کا احساس ہو گا اور وہ آپ سے محبت کرنے لگیں گے۔

ایک نظر

”جب لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ ہم اُن کی اچھائیاں بھی اسی طرح یاد رکھتے ہیں جیسے ان کی برائیاں نوٹ کرتے ہیں تو وہ ہماری ہدایات پر عمل کریں گے۔“

1 جامع الترمذي،حديث:2653. 2 البداية والنهاية:137/3. 3 الطبقات الكبرى لابن سعد: 394/7. 4 الطبقات الكبرى لابن سعد:7/394-395. 5 مسند أحمد: 199/4. 6 الطبقات الكبرى لابن سعد:395/7.

غلطی کا تدارک آسان بنائیں

انسان سے چھوٹی بڑی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ غلطی ہلکی ہو یا بھاری اس کا تدارک ممکن ہے۔ ہاں جب غلطی شدید نقصان کی صورت میں ظاہر ہو تو اس کا سو فیصد تدارک نہیں ہو سکتا، تاہم کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پورا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد غلطیوں کے ازالے کی کوشش نہیں کرتی۔ ایسے افراد کو دراصل یہ شک ہوتا ہے کہ وہ غلطی کے تدارک کی صلاحیت ہی سے محروم ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اکثر ہم غلطیوں سے نمٹنے کے لیے ایسا طریقہ استعمال کرتے ہیں جو بجائے خود ایک غلطی ہوتا ہے۔ میرا بیٹا غلطی کر بیٹھتا ہے تو میں اسے ڈانٹتا ہوں، سخت سست کہتا ہوں اور غلطی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہوں کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا اندھے کنویں میں جا پڑا ہے۔ نتیجتاً وہ مایوس ہو کر غلطی ہی پر اڑا رہتا ہے اور ازالے کی کوشش نہیں کرتا۔

کبھی میری بیوی سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے یا میرا دوست غلطی کر بیٹھتا ہے تو اب میرا اخلاقی فرض ہے کہ اسے احساس دلاؤں کوئی بات نہیں، غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ اس پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ابھی راستہ کھلا ہے، غلطی کا تدارک آسان ہے اور حق کی طرف لوٹ جاؤ، باطل پر اڑے رہنے سے رجوع الی الحق بہر حال بہتر ہے۔ یہ سب باتیں میں اُسے ذہن نشین کرا دوں تو یہ اس کی اصلاح کا موثر ترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں ہجرت کی بیعت کرنے حاضر ہوا۔ اس نے کہا: ''میں والدین کو روتا چھوڑ کر آپ سے ہجرت کی بیعت کرنے آیا ہوں۔'' آپ نے اسے سرزنش نہیں کی، نہ اس فعل کی تحقیر کی اور نہ اسے بے وقوفی کا طعنہ دیا۔ وہ آدمی اچھی نیت لے کر آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ درست کر رہا ہے۔ آپ نے اسے یہ احساس دلاتے ہوئے کہ غلطی کا تدارک آسان ہے، نہایت خوش دلی سے فرمایا:

''واپس جاؤ اور والدین کو جیسے رُلایا تھا ویسے ہنساؤ۔'' [1]

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے بات ختم کر دی۔

رسول اللہ ﷺ کا لوگوں سے ایسا طرزِ عمل تھا جس سے ان کے اندر بھلائی کی رغبت بڑھتی تھی اور انھیں احساس ہوتا تھا کہ وہ غلطی کرنے کے باوجود خیر کے بہت قریب ہیں۔

یہاں میں ایک دلدوز واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہر چند ہمارے مطلب کی بات واقعے کے آخر میں ہے، قارئین کے فائدے کے لیے میں اسے از اوّل تا آخر نقل کر رہا ہوں۔

''رسول اللہ ﷺ کی یہ عادت تھی کہ آپ جب بھی سفر پر نکلنے کا ارادہ کرتے، اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے۔ جس بیوی کے نام قرعہ نکلتا وہ سفر میں آپ کے ہمراہ ہوتی۔ آپ نے غزوۂ بنومصطلق کے لیے روانگی کا ارادہ کیا تو دستور کے مطابق ازواج کے درمیان قرعہ ڈالا۔ قرعہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام نکلا، چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلیں۔ یہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کی بات ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا ہودج پر سوار تھیں۔ لوگ کہیں پڑاؤ ڈالتے تو وہ بھی ہودج سے نکل آتیں اور اپنی ضروریات پوری کرتیں۔ کوچ کا اعلان ہوتا تو دوبارہ ہودج میں سوار ہو جاتیں۔ جنگ اختتام کو پہنچی تو رسول اللہ ﷺ لشکر کے ہمراہ واپس مدینے روانہ ہوئے۔ مدینے کے قریب پہنچ کر ایک جگہ پڑاؤ کیا اور رات کا کچھ حصہ گزارا، پھر لوگوں میں کوچ کا اعلان کر دیا۔ لوگ اپنا مال

متاع اکٹھا کرنے لگے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے ہودج سے نکلیں۔ اُن کے گلے میں قیمتی ہار تھا جس میں شہر ظفار کے نگینے جڑے تھے۔ قضائے حاجت سے فارغ ہوئیں تو ہار گلے سے گر گیا لیکن انھیں پتا نہ چلا۔ وہ پڑاؤ میں پہنچیں اور ہودج میں داخل ہونے لگیں تو ہاتھ بے ساختہ گلے کو لگایا۔ دیکھا کہ ہار غائب ہے۔ کوچ کا آغاز ہو چکا تھا اور لوگ آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ یہ الٹے پاؤں اسی جگہ گئیں جہاں ہار غائب ہوا تھا اور دیر تک ہار تلاش کرتی رہیں۔ اُدھر لوگ آئے، اُن کی ہودج اٹھائی اور اونٹ پر سوار کر دی۔ انھوں نے سمجھا ام المومنین ہودج میں موجود ہیں، پھر اونٹ کی لگام تھامی اور چل دیے۔ لشکر چلا گیا۔ تلاش بسیار کے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہار مل گیا تو وہ پڑاؤ کی جگہ واپس آئیں۔

خود بیان کرتی ہیں کہ میں پڑاؤ کی جگہ واپس آئی تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ لوگ جا چکے تھے۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گئی جہاں میری ہودج اتری تھی۔ خیال تھا کہ لوگ مجھے ہودج میں نہ پا کر ڈھونڈتے ہوئے واپس آئیں گے۔ میں اپنا جلباب لپیٹے پڑ رہی۔ بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں صفوان بن معطل جو اپنے کسی کام کے سلسلے میں لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے، میرے پاس سے گزرے۔ انھوں نے سوتے ہوئے انسان کا ہیولا دیکھا تو قریب آئے اور مجھے پہچان لیا۔ حجاب کی فرضیت سے پہلے انھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ وہ دیکھتے ہی بولے:

”انا للہ وانا الیہ راجعون، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہودہ نشین بی بی؟“

اُن کی آواز سن کر میں جاگ اٹھی اور اپنا چہرہ جلباب میں چھپا لیا۔ واللہ! انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے ان کے منہ سے انا للہ کے سوا کچھ نہیں سنا۔ انھوں نے اپنی سواری بٹھائی۔ میں سوار ہو گئی۔ انھوں نے لگام پکڑی اور لوگوں کی تلاش میں تیزی سے چل دیے۔ صبح تک لوگ ہمیں نہیں ملے۔ انھیں میری گمشدگی کا علم نہیں ہوا تھا۔ صبح

ہوئی تو ہم لوگوں کے پاس پہنچے۔ انھوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ بہتان طرازوں نے جو کہنا تھا، کہا۔ لشکر میں ہلچل مچ گئی۔ واللہ! مجھے لوگوں کی کسی بات کا پتا نہ چلا، پھر ہم مدینہ آگئے۔

مدینہ آتے ہی میں بیمار پڑ گئی اور میری بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ لوگوں نے جو باتیں کیں، ان میں سے کوئی بات مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ بات نبی ﷺ اور میرے والدین تک پہنچ چکی تھی، لیکن میرے سامنے اُنھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں! رسول اللہ ﷺ کا مجھ سے لطافت وشفقت کا جو معاملہ پہلے تھا، اب نہیں رہا تھا۔ پہلے میں بیمار ہوا کرتی تو آپ مجھ پر بہت شفقت کرتے اور میرا بہت خیال رکھتے۔ اب کی بار ایسا نہیں تھا۔ آپ میری خبر لینے آتے تو والدہ سے صرف اتنا پوچھتے:

''وہ کیسی ہے؟''

اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے۔ میں نے یہ بات اپنے دل میں محسوس کی اور آپ ﷺ کی بے رخی دیکھ کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ اجازت دیں تو والدہ کے ہاں چلی جاؤں؟'' آپ نے فرمایا:

''کوئی حرج نہیں۔''

میں والدہ کے ہاں چلی گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا قیامت گزر چکی ہے۔ بیس سے کچھ اوپر راتیں گزریں تو میری نقاہت بہت بڑھ گئی۔ ایک رات میں قضائے حاجت کے لیے نکلی۔ میرے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خالہ کی بیٹی ام مسطح تھیں۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں کہ چادر کا پلو پاؤں کے نیچے آیا اور گرتے گرتے بچیں۔ ان کے منہ سے نکلا: ''مسطح تباہ ہو۔'' میں بولی: واللہ! آپ نے بُری بات کہی۔ آپ ایسے شخص کو گالی دیتی ہیں جو بدر میں شامل تھا؟'' انھوں نے کہا: ''اری! تو نے سنا نہیں اس نے کیا کہا ہے؟ بنت ابی بکر

تجھے وہ بات نہیں معلوم؟'' ''کون سی بات؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس پر بہتان طرازوں نے جو کچھ کہا تھا، انھوں نے مجھے کہہ سنایا۔ میں نے تعجب سے پوچھا: ''کیا یہ باتیں کی گئی ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں! واللہ! یہ باتیں کہی گئی ہیں۔'' واللہ! یہ سن کر مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ میں حاجت واجت سب بھول گئی اور الٹے پاؤں گھر واپس آ گئی۔ میری بیماری میں اضافہ ہو گیا۔ واللہ! میں روتی رہی۔ اتنا روئی، اتنا روئی کہ محسوس ہوتا تھا کلیجا پھٹ جائے گا۔ میں نے والدہ سے کہا: ''اللہ آپ کو معاف کرے، لوگوں نے اتنی باتیں کیں اور آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' انھوں نے کہا: ''بیٹی! حوصلہ کر۔ کسی مرد کے پاس کوئی خوب صورت عورت ہو اور وہ اس سے محبت کرتا ہو اور اس کی سوتنیں بھی ہوں تو وہ ضرور باتیں بناتی ہیں اور لوگ بھی باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''سبحان اللہ! لوگوں نے یہ باتیں کی ہیں؟'' میں اس رات صبح تک روتی رہی۔ نہ آنسو تھمنے کا نام لیتے تھے اور نہ میں نے نیند کا سرمہ ڈالا۔ صبح بھی روتی رہی۔

اُدھر رسول اللہ ﷺ پر بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کی گئی یہ باتیں بہت شاق گزری تھیں۔ آپ حیران تھے کہ کیا کریں۔ نہ جبریل کو بھیجا جا رہا تھا نہ قرآن نازل ہوتا تھا۔ معاملے نے طول پکڑا تو آپ منبر پر کھڑے ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا:

''اے لوگو! چند آدمیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ مجھے میرے گھر والوں کے متعلق پریشان کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے کہنے کا اُنھیں کوئی حق نہیں۔ واللہ! میں اپنے گھر والوں کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں اور وہ ایک آدمی کے بارے میں یہ بات کرتے ہیں۔ واللہ! اس کے متعلق بھی میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ وہ جب بھی میرے گھر آیا میرے ہمراہ ہی آیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کہی تو اوس کے امیر سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور بولے:

’’اے اللہ کے رسول! اگر یہ لوگ اوس سے ہیں تو آپ بے فکر ہو جائیں، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ اگر ان کا تعلق ہمارے خزرجی بھائیوں سے ہے تو آپ حکم کریں، واللہ! یہ اس بات کے اہل ہیں کہ ان کی گردنیں ماری جائیں۔‘‘

خزرج کے امیر سعد بن عبادہ نے جو ایک نیک آدمی تھے لیکن انھیں قبائلی حمیت نے آلیا، یہ بات سنی تو کھڑے ہوئے اور کہا: ’’اللہ کی قسم! آپ نے غلط کہا ہے۔ ان کی گردنیں نہیں ماری جائیں گی۔ واللہ! آپ نے یہ بات اس لیے کہی کہ آپ کو معلوم ہے کہ بہتان طرازوں کا تعلق خزرج سے ہے۔ اگر وہ آپ کی قوم سے ہوتے تو آپ یہ بات ہرگز نہ کہتے۔‘‘

اس پر اُسید بن حُضیر نے کہا: ’’آپ نے بھی غلط بات کہی ہے۔ واللہ ہم انھیں قتل کریں گے۔ آپ منافق ہیں، اسی لیے منافقین کی طرف داری کرتے ہیں۔‘‘

لوگ مشتعل ہو گئے اور قریب تھا کہ گتھم گتھا ہو جاتے۔ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے تھے۔ آپ انھیں سمجھاتے بجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس ہنگامے کے بعد کوئی بات نہ کہی اور چپ چاپ گھر چلے گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ عوام کی طرف سے اس مسئلے کا کوئی مناسب حل سامنے نہیں آیا تو آپ نے اہل بیت اور خاص خاص افراد سے مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے علی اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا اور اُن سے مشورہ طلب کیا۔ اسامہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی ستائش کرتے ہوئے کہا: ’’یا رسول اللہ! آپ کے گھر والوں کے متعلق ہم بھلائی اور اچھائی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ یہ جھوٹ اور باطل ہے۔‘‘

علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’یا رسول اللہ! عورتوں کی کمی نہیں۔ آپ اور شادی بھی کر سکتے ہیں۔ لونڈی سے پوچھ لیجیے۔ وہ آپ سے سچ بولے گی۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو آواز دی اور دریافت کیا:

’’بریرہ! عائشہ کی طرف سے تمھیں کسی بات کا شک گزرا؟‘‘

بریرہ نے جواب دیا: ’’نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا، واللہ! میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ عائشہ میں مجھے کوئی عیب نظر نہیں آیا، ہاں! وہ نوعمر لڑکی ہے۔ میں آٹا گوندھ کر رکھتی اور اس سے کہتی کہ آٹے کا خیال رکھنا تو وہ اسے چھوڑ کر سو جاتی اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی۔‘‘

یہاں بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آپ ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف متوجہ ہوئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ’’میں سارا دن روتی رہی۔ نہ آنسو تھمتے تھے اور نہ میں نے نیند کا سرمہ ڈالا، پھر رات بھی روتے روتے گزری۔ نہ آنسو رکتے تھے اور نہ میں نے نیند کا سرمہ ڈالا۔ میرے والدین تو یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ رو رو کر میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے۔ اجازت طلب کی۔ عائشہ کے پاس کمرے میں گئے۔ ان کے قریب ابو بکر رضی اللہ عنہ، عائشہ کی والدہ اور ایک انصاری عورت بیٹھی تھی۔ جب سے لوگوں نے باتیں کی تھیں، رسول اللہ ﷺ پہلی بار ابو بکر کے گھر آئے تھے۔ ایک مہینے سے آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور اب تک وحی بھی نہیں آئی تھی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بستر پر دراز تھیں۔ رو رو کر بُرا حال تھا۔ نبی ﷺ کے آنے پر پھر رونے لگیں۔ اُن کے قریب بیٹھی عورت بھی رونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ بیٹھے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا:

’’اما بعد۔ عائشہ! مجھے تمھارے بارے میں یہ اور یہ بات پہنچی ہے۔‘‘

آپ نے بہتان طرازوں کی طرف سے پھیلائی گئی باتوں کا تذکرہ کیا، پھر آپ نے انھیں بتانا چاہا کہ انسان کیسی بھی غلطی کر بیٹھے، اس کا تدارک مشکل نہیں۔ آپ نے فرمایا:

''اگر تم بے گناہ ہو تو اللہ تمھیں بے گناہ ثابت کر دے گا۔ اور اگر تم سے گناہ ہو گیا ہے تو اللہ سے توبہ کرو اور اپنے گناہ کی معافی مانگو۔ بندہ جب گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے غلطی کے ازالے کا نہایت آسان حل پیش کیا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم کی تو میرے آنسو تھم گئے۔ اب ایک قطرہ بھی آنسوؤں کا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں والدین کا انتظار کرتی رہی کہ وہ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں لیکن وہ نہیں بولے۔

میں نے والد سے کہا: ''میری طرف سے رسول اللہ (ﷺ) کو جواب دیجیے۔''

والد نے کہا: ''واللہ! میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ (ﷺ) سے کیا کہوں۔''

میں نے والدہ سے کہا: میری طرف سے رسول اللہ (ﷺ) کو جواب دو۔''

والدہ نے بھی کہا: ''واللہ! مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) سے کیا کہوں۔''

واللہ! ان دنوں کسی گھر پر ایسی مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر پر آئی تھی۔ میرے والدین خاموش ہو گئے تو میں رو پڑی، پھر میں نے کہا:

''نہیں، اللہ کی قسم! آپ نے جو کچھ بتایا میں اس کے بارے میں اللہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گی۔ واللہ! میں جانتی ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ بات سنی اور سنی یہاں تک کہ آپ کے دلوں میں بیٹھ گئی اور آپ نے اسے سچ سمجھ لیا ہے۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ میری بات سچ نہیں مانیں گے۔ اور اگر میں آپ کے رو برو کسی گناہ کا اعتراف کر لوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ سچ سمجھیں گے اور واللہ! میرے پاس آپ کی اور اپنی حالت کی کوئی مثال نہیں

سوائے ابو یوسف کے، انھوں نے کہا تھا:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝﴾

''اب صبرِ جمیل ہی ہے۔ اور جو کچھ تم لوگ بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جاتی ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''پھر میں رخ پھیر کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ واللہ میں جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ بھی مجھے بے گناہ ثابت کر دے گا۔ لیکن واللہ! میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میرے بارے میں وحی اترے گی جس کی تلاوت کی جاتی رہے گی۔ میرا معاملہ اس سے زیادہ حقیر تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں کلام کرتا جس کی تلاوت کی جاتی۔ ہاں یہ امید تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھا دیا جائے گا کہ میں بے گناہ ہوں۔ واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں بیٹھے تھے، گھر والوں میں سے بھی کوئی نہیں نکلا تھا کہ آپ پر اللہ کی طرف سے وہی کیفیت طاری ہوئی جس میں وحی نازل ہوتی ہے۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت دیکھی تو نہ ڈری، نہ گھبرائی اور مطلق پروا نہ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ مجھ پر ظلم نہیں کرے گا۔ اور میرے والدین، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی جان ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی کیفیت طاری تھی کہ مجھے گمان ہوا کہ ان لوگوں کی جان نکل جائے گی۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں اللہ کی طرف سے بھی اس بات کی تصدیق نہ کی جائے جو لوگوں نے کہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی کیفیت سے نکلے تو مسکراتے ہوئے چہرے کا

پسینہ صاف کرنے لگے۔ پہلی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہی:

''عائشہ! خوش ہو جاؤ۔ اللہ عزوجل نے تمھاری بے گناہی (براءت) اتاری ہے۔''

میں نے کہا: ''الحمد للہ۔''

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کی تھیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ○ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○﴾

''بے شک وہ لوگ جو بہتان گھڑ لائے ہیں، تمھی سے ایک ٹولہ ہیں۔ اسے اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمے داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔ وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔''[3]

اس کے بعد اللہ نے ان الفاظ میں وعید سنائی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○﴾

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش پھیلے ان کے لیے دُنیا و آخرت میں المناک عذاب ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''[4]

پھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کے پاس گئے۔ قرآن کی یہ آیات اُن کے سامنے تلاوت

کیں، پھر جھوٹا الزام لگانے والوں پر حد قذف جاری کی۔ [5]

اس لیے غلطی کرنے والے کو مریض سمجھیں جسے علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں۔ وہ آپ کی بے جا سختی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ آپ اس کی غلطی پر خوش ہیں۔ اچھا طبیب وہی ہے جسے مریضوں کی صحت کی فکر خود ان سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری اور لوگوں کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ جلائی۔ روشنی ہوئی تو پروانے آگ میں گرنے لگے، وہ آدمی اُنھیں آگ سے نکالتا رہا۔ اس کے باوجود وہ آدمی پر غالب آگئے اور آگ میں گرتے رہے۔ میں تمھارے دامن پکڑ پکڑ کر آگ میں جانے سے روک رہا ہوں اور تم دامن چھڑا چھڑا کر آگ میں جاتے ہو۔'' [6]

رائے

''کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ غلطیوں سے نمٹنے کا طریقہ بجائے خود غلطی سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔''

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 2528، وسنن النسائي، حديث: 4168. [2] يوسف 12:18. [3] النور 24:11-13. [4] النور 24:19. [5] صحيح البخاري، حديث: 2661، وصحيح مسلم، حديث: 2770، ومسند أحمد: 3/35، والبداية والنهاية: 4/161-165. [6] صحيح البخاري، حديث: 3426، وصحيح مسلم، حديث: 2284.

دوسری رائے

جس طرح لوگوں کے مزاج اور شکلیں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ان کے نقطہ ہائے نظر میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے جو ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ جب آپ کو محسوس ہو کہ فلاں شخص غلطی کر رہا ہے اور آپ خیر خواہی کی غرض سے غلطی کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ مطمئن نہیں ہوتا تو آپ اس کا نام دشمنوں کی فہرست میں درج نہ کریں۔ حتی الامکان معاملات کو وسیع الظرفی سے لیں۔

مثال کے طور پر آپ اپنے شاگرد کی غلطی پر اسے خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ آپ اس سے دوستی کو دشمنی میں نہ بدلیں اور اس سے اپنے خوشگوار تعلقات جاری رکھیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے مثبت طرزِ عمل سے وہ مزید غلطیوں کا شکار نہ ہو۔

یاد رکھیے، چھوٹے شر کے بدلے بڑا شر مول نہ لیں۔ آپ لوگوں سے تعامل میں اسی وسیع الظرفی کا مظاہرہ کریں گے اور چھوٹی موٹی باتوں پر ناراض ہونے کی عادت ترک کریں گے تو اچھی زندگی آپ کا مقدر ہوگی۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ نہ کبھی کسی عورت یا غلام کو اپنے ہاتھ سے مارا، الا یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو گزند پہنچایا گیا ہو اور آپ نے اس کا انتقام لیا ہو۔ ہاں اللہ کے

محارم میں سے کسی شے کی بے حرمتی کی جاتی تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ صرف اللہ کے لیے ناراض ہوتے تھے۔ آپ نصیحت کرتے اور نصیحت قبول نہ کی جاتی تو معاملے کو نرمی سے لیتے کیونکہ ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے شام کی حدود پر واقع تبوک کا سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو شاہِ روم ہرقل کی طرف بھیجا۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ہرقل کے دربار میں پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کا خط اس کے حوالے کیا۔ ہرقل نے خط پڑھا تو مشورے کے لیے روم کے بشپ اور پادریوں کو بلا بھیجا۔ وہ جمع ہوئے تو شاہی محل کا دروازہ بند کرا دیا اور ان سے کہا: "آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آدمی (اشارہ رسول اللہ ﷺ کی طرف تھا) کہاں تک آ پہنچا ہے۔ اس نے یہ خط ارسال کیا ہے جس میں تین باتوں کی دعوت دی گئی ہے۔

① اس کے دین میں داخل ہو کر اس کی پیروی کا اقرار کر لیں۔

② یا اسے زمین کا خراج ادا کریں اور زمین ہمارے پاس رہے گی۔

③ یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہرقل نے کہا: "واللہ! آپ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں کہ یہ شخص ہماری زمین چھین لے گا، اس لیے بہتر ہے کہ ہم اس کے دین میں داخل ہو کر اس کے پیروکار بن جائیں یا اسے خراج ادا کیا کریں۔"

پادریوں نے یہ بات سنی تو سخت اشتعال میں آ گئے۔ انھوں نے کہا: "آپ ہمیں نصرانیت چھوڑنے کی دعوت دے رہے ہیں؟ ہم حجاز سے آئے ہوئے ایک اعرابی کے غلام بن جائیں؟

پادریوں کا یہ جواب سن کر ہرقل نادم ہوا کہ یہ خط انھیں سنا کر اس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ پادریوں کو سلطنت میں بالادستی اور اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ ہرقل جانتا تھا کہ

پادری اس کے خلاف نکل کھڑے ہوئے تو سارے روم میں بغاوت پھیل جائے گی۔ اس نے پادریوں کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''میں تو یونہی آپ کو آزما رہا تھا کہ آپ دین پر کتنے پختہ ہیں۔''

ہرقل کو یقین تھا کہ محمد ﷺ ہی وہ رسول ہیں جن کی عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔ اس نے اپنا یقین پختہ کرنے کے لیے نصرانی عرب کے قبیلے ''تجیب'' کا ایک آدمی بلوایا اور اس سے کہا: ''میرے پاس کوئی ایسا آدمی لاؤ جو بات یاد رکھتا ہو اور عربی زبان بولتا ہو۔ میں اسے اس نبی کے پاس خط کا جواب دے کر بھیجنا چاہتا ہوں۔''

تجیبی گیا اور نصرانی عرب ہی کے قبیلے ''بنوتنوخ'' کا ایک آدمی ساتھ لایا۔ ہرقل نے اپنا خط تنوخی کے حوالے کیا اور کہا: ''میرا یہ خط اس شخص کے پاس لے جاؤ اور اس کی باتیں سنو تو تین چیزیں نوٹ کرو:

① یہ دیکھو کہ کیا وہ اُس خط کے بارے میں کچھ کہتا ہے جو مجھے بھیجا تھا۔

② یہ بھی خیال رکھو کہ وہ میرا خط پڑھ کر رات کا ذکر کرتا ہے۔

③ اُس کی کمر پر دیکھنا، کوئی نامانوس شے نظر آتی ہے؟

تنوخی خط لے کر تبوک پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پانی کے چشمے پر بیٹھے تھے۔ اُسے بتایا گیا تو وہ آگے بڑھا اور رسول اللہ ﷺ کے روبرو بیٹھ گیا۔ اُس نے آپ کو ہرقل کا خط دیا۔ آپ نے خط پکڑ کر گود میں رکھ لیا اور دریافت کیا:

''تم کہاں سے ہو؟''

''میں بنوتنوخ سے ہوں۔'' تنوخی نے جواب دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تمھیں اپنے والد ابراہیم کے دین ''اسلامِ حنیفی'' سے کوئی رغبت ہے؟''

تنوخی نے صاف جواب دیا: ''میں ایک قوم کا نمائندہ ہوں۔ میں اپنی قوم کے دین پر قائم رہوں گا، یہاں تک کہ اُن کے پاس لوٹ جاؤں۔''

رسول اللہ ﷺ نے کھلا تعصب دیکھا تو نہ غصے ہوئے اور نہ کوئی مشکل کھڑی کی بلکہ ہنس کر فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝﴾

''تو جسے چاہے ہدایت نہیں دے سکتا بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت حاصل کرنے والوں کو خوب اچھی طرح جانتا ہے؟''[2]

پھر آپ نے اطمینان سے کہا: ''تنوخی صاحب! میں نے کسریٰ کو خط لکھا تھا لیکن اُس نے خط چاک کر دیا۔ اللہ بھی اُسے اور اُس کی سلطنت کو چاک کرے گا۔ پھر میں نے نجاشی (یہ اصحمہ نہیں تھا) کو خط لکھا۔ اُس نے خط پھاڑ ڈالا۔ اللہ اسے اور اُس کی سلطنت کو پھاڑ ڈالے گا۔ اب میں نے تمھارے صاحب کو خط لکھا تو اُس نے خط سنبھال لیا۔ جب تک زندگی میں ذرا سی بھی خیر باقی ہے لوگ اُس کی طرف سے سختیاں جھیلیں گے۔''

تنوخی نے دل میں کہا: ''یہ اُن تین باتوں میں سے ایک ہوئی جس کے متعلق مجھے میرے صاحب نے وصیت کی تھی۔''

اُس نے یاددہانی کے لیے ترکش سے تیر نکالا اور اُس سے تلوار کی ایک جانب یہ بات لکھ لی۔ رسول اللہ ﷺ نے خط بائیں طرف کھڑے آدمی کو دیا۔ تنوخی نے پوچھا:

''آپ کے خطوط کون پڑھ کے سناتا ہے؟''

صحابۂ کرام نے بتایا: ''معاویہ۔''

معاویہ رضی اللہ عنہ نے خط پڑھنا شروع کیا۔ ہرقل نے نبی ﷺ کو مخاطب کر کے لکھا تھا:

''آپ مجھے جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر اور جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔ پھر آگ کہاں ہے؟'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب دن نکل آئے تو رات کہاں جاتی ہے؟''

تنوخی چونک اُٹھا کہ یہ دوسری بات ہوئی جسے نوٹ کرنے کے لیے ہرقل نے کہا تھا۔ اُس نے ترکش سے تیر نکالا اور تلوار کی میان پر یہ بات درج کر لی۔

معاویہ رضی اللہ عنہ خط پڑھ کے سنا چکے تو رسول اللہ ﷺ تنوخی کی طرف متوجہ ہوئے جس نے آپ کی نصیحت پر کان نہیں دھرا تھا اور دینِ اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے لطافت سے کہا:

''یقیناً تمھارا حق بنتا ہے۔ تم سفیر ہو۔ ہم تمھیں کیا تحفہ پیش کر سکتے ہیں؟ ہماری حالت تمھارے سامنے ہے کہ مسافر ہیں اور کھلے صحرا میں بیٹھے ہیں۔''

عثمان رضی اللہ عنہ بولے: ''اے اللہ کے رسول! اسے میں تحفہ دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر عثمان اٹھے، اپنا سامان کھولا اور ایک خوشنما پوشاک لا کر تنوخی کی گود میں ڈال دی۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام سے مخاطب ہوئے اور کہا:

''اس آدمی کی ضیافت کون کرے گا؟''

ایک انصاری نوجوان بولا: ''میں کروں گا۔''

انصاری نوجوان تنوخی کو لے کر چل دیا۔ تنوخی کا ذہن اُس تیسری بات کے گرد گھوم رہا تھا جس کے متعلق ہرقل نے اُسے تاکید کی تھی۔ وہ دونوں چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ نے تنوخی کو آواز دی:

''تنوخ کے بھائی! ذرا اِدھر آنا۔''

تنوخی آیا تو آپ نے کمر پر لپٹی چادر ہٹا دی اور فرمایا:

’’اب جس کا تمھیں کہا گیا تھا وہ بات بھی دیکھ لو۔‘‘

تنوخی کہتا ہے: ’’میں نے رسول اللہ ﷺ کی کمر دیکھی۔ کندھے کے گوشت پر موٹی ابھری ہوئی کھال کی شکل میں مہرِ نبوت تھی۔‘‘[3]

خیال

’’مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی غلطیوں کا تدارک کریں۔ یہ شرط نہیں کہ وہ آپ کے سامنے غلطیاں ٹھیک کریں، اس لیے غصے میں نہ آئیں۔‘‘

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:3560، وصحیح مسلم، حدیث:2327. [2] القصص28:56.

[3] مسند أحمد3/443,442. یہ حدیث ضعیف ہے۔

برائی کا بدلہ اچھائی سے دیجیے

آپ لوگوں سے میل جول رکھتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ آپ سے اپنی مرضی کا سلوک کرتے ہیں۔ عام طور پر اُن کا رویہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ آپ کسی سے مسکراتے چہرے کے ساتھ ملیں تو وہ بھی جواباً آپ کا استقبال خندہ روئی سے کرے۔ بلکہ بعض افراد بدگمانی کا شکار ہو کر طیش میں آ جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں:
''آپ کیوں ہنستے ہیں؟''

یہ بھی لازمی نہیں کہ آپ جس شخص سے لطافت بھرے لہجے میں بات کریں، اُس کی تعریف کریں یا اُس کی ہاں میں ہاں ملائیں وہ آپ سے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے۔

اللہ تعالیٰ نے رزق کی طرح اخلاق و عادات کی بھی تقسیم کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں منہج ربانی یہ ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ○﴾

''اچھائی اور برائی برابر نہیں، (برائی کو) اُس (نیکی) سے دفع کرو جو بہترین ہے۔ تو یکایک وہ شخص جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے، ایسا ہو گا جیسے دلی دوست ہے۔''[1]

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی بدمزاجی کا نہ کوئی حل ہوتا ہے اور نہ اصلاح ہی کا کوئی طریقہ اُن کے بارے میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ ایسے افراد سے نمٹنے کا طریقِ کار یہ ہے کہ یا تو اُن کی بدمزاجی صبر سے برداشت کی جائے یا اُنھیں خیرباد کہہ دیا جائے۔

حکایت ہے کہ اشعب نامی ایک آدمی کسی تاجر کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوا۔ تاجر نے ہر خدمت انجام دی۔ اپنے اور اشعب کے تمام کام وہ خود کرتا۔ سامان اتارنا، جانوروں کو پانی پلانا، لکڑیاں جمع کرنا، کھانا بنانا اور اس جیسے دیگر چھوٹے موٹے کام وہی کرتا رہا اور اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ واپسی پر وہ ایک جگہ دوپہر کا کھانا کھانے اترے۔ اشعب اطمینان سے زمین پر لیٹ گیا اور آرام کرنے لگا۔ تاجر نے سارا سامان اتارا اور اشعب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''اٹھو، لکڑیاں جمع کرو۔ میں گوشت بناتا ہوں۔'' اشعب نے جواب دیا: ''واللہ! میں تو سفر کی تھکاوٹ سے چور ہوں۔''

تاجر خود ہی اٹھا، لکڑیاں اکٹھی کیں اور اشعب سے کہا: ''اٹھ کر آگ جلاؤ۔''

اُس نے کہا: ''دھویں کے قریب جاؤں تو سینے میں تکلیف ہوتی ہے۔''

تاجر نے آگ بھی جلائی، پھر اشعب سے کہا: ''اچھا! گوشت بنانے میں میری مدد کرو۔''

اشعب ڈھٹائی سے بولا: ''ارے وہ کیوں؟ میرے ہاتھ میں چھری لگ گئی تو اُس کا ذمہ دار کون ہوگا؟''

تاجر نے اکیلے گوشت بنایا، پھر اشعب سے کہنے لگا: ''اشعب! اٹھو، گوشت ہانڈی میں ڈالو اور کھانا پکاؤ۔''

اشعب نے کہا: ''کھانا پکاتے ہوئے بار بار ہنڈیا دیکھنی پڑتی ہے۔ مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔''

تاجر بے چارے نے یہ کام بھی اپنے سر لیا۔ کھانا تیار ہوا تو وہ تھک کر لیٹ گیا۔ اشعب سے کہا: ''اشعب! ذرا اُٹھ کر دسترخوان تو بچھانا اور پلیٹ میں کھانا بھی نکال دینا۔''

اشعب بولا: ''میرا جسم بھاری ہے۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہوں گے۔''

تاجر اِس بار بھی خود ہی اٹھا اور کھانا نکال کر دستر خوان پر لگایا، پھر اشعب سے کہا: ''آؤ، کھانا کھالو۔''

اب اشعب بے شرمی سے بولا: ''واللہ! مجھے شرم آ رہی ہے، میں نے تمھاری ہر بات ٹال دی۔ لیکن اب تمھاری بات مانوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھانے میں شریک ہوگیا۔

اشعب جیسے افراد سے آپ کا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایسے موقع پر پریشان نہ ہوں اور دل بڑا کرلیں۔ مربیِ اوّل ﷺ لوگوں سے معاملہ کرنے میں سمجھداری سے کام لیتے تھے۔ آپ جذبات کے تابع نہیں تھے۔ آپ دوسروں کی غلطیاں برداشت کرتے اور نرم رویہ رکھتے تھے۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ اصحابِ کرام کی مبارک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک اعرابی آیا جو دیت کی ادائیگی میں مدد کا طالب تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اُسے کچھ مال دیا اور مزاحیہ انداز میں پوچھا:

''میں نے تم سے اچھائی کی؟''

اعرابی نے کہا: ''نہیں، تم نے کوئی اچھائی نہیں کی۔''

اس پر صحابۂ کرام کو غصہ آیا اور وہ اُس کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے روک دیا، پھر آپ گھر گئے اور اعرابی کو بھی وہیں بلا لیا۔ آپ نے اُس سے کہا:

''تم ہمارے پاس آئے۔ ہم سے مدد طلب کی۔ ہم نے تمھیں کچھ نہ کچھ دیا اور تم نے جو کہا سو کہا۔''

یہ کہہ کر آپ نے اُسے کچھ اور پیسے دیے، پھر دریافت کیا:

''میں نے تم سے اچھائی کی؟''

اعرابی بولا: ''ہاں! اللہ تمھیں اہل وعیال کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔''

آپ کو اُس کے اطمینان سے خوشی ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم ہمارے پاس آئے۔ ہم نے تمھیں کچھ نہ کچھ دیا۔ تم نے جو کہا سو کہا۔ میرے ساتھی تم سے ناراض ہیں۔ اُن کے پاس جا کر شکریے کے الفاظ کہو جو مجھ سے کہے ہیں تاکہ اُن کے دل تمھاری طرف سے صاف ہو جائیں۔''

اعرابی آیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''آپ کا ساتھی ہم سے مدد کا طالب تھا۔ ہم نے اسے پیسے دیے۔ اس نے جو کہنا تھا کہا۔ ہم نے اسے پھر بلایا اور کچھ اور پیسے دیے تو یہ راضی ہو گیا۔''

یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ اعرابی کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا:

''کیوں، ٹھیک ہے نا؟''

اعرابی نے کہا: ''ہاں، بالکل ٹھیک، اللہ تمھیں اہل وعیال اور خاندان کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔''

اعرابی رخصت ہونے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اِس اعرابی کی اور میری مثال یوں ہے کہ ایک آدمی کی اونٹنی بدک گئی۔ لوگ اُس کے پیچھے بھاگے۔ وہ اُنھیں دیکھ کر اور تیز بھاگی۔ صاحب ناقہ نے کہا: ''میرے اور میری اونٹنی کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں اس سے نرمی برتوں گا۔ مجھے اس کے مزاج سے واقفیت ہے۔'' وہ گیا، کچھ گھاس پھونس جمع کی اور اونٹنی کو بلایا۔ اونٹنی دوڑی آئی۔ اُس نے اونٹنی پر پالان باندھا اور اطمینان سے اُس پر بیٹھ کر چل دیا۔ اعرابی نے جو تلخ کلامی کی اُس پر میں آپ لوگوں کی بات مانتا تو وہ آگ میں جاتا۔'' [2]

نرمی جس شے میں ہو اُسے زینت بخش دیتی ہے اور جس چیز سے نرمی نکال لی جائے وہ بدنما ہو جاتی ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کرنے لگے۔ فضالہ بن عمیر آپ ﷺ کی طرف بڑھے جو دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ بھی آپ کے پیچھے پیچھے طواف کرنے لگے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ موقع پا کر رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیں۔

وہ آپ کے قریب آئے تو آپ نے اُنھیں دیکھ لیا۔ آپ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

''کیا فضالہ ہو؟''

اُنھوں نے جواب دیا: ''جی، یارسول اللہ! فضالہ ہوں۔''

آپ ﷺ نے دریافت کیا:

''تمھارے دل میں کیا بات آئی تھی؟''

فضالہ نے کہا: ''کچھ نہیں، میں تو اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور کہا: ''استغفر اللہ''

فضالہ کہتے ہیں: ''پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا تو میرا دل پُرسکون ہو گیا۔ ابھی رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ دنیا میں آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی عزیز نہیں۔''

اس کے بعد فضالہ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اُنھیں وہ عورت ملی جس سے اُن کی دوستی رہی تھی۔ عورت نے اُنھیں دیکھتے ہی کہا:

''فضالہ! آؤ، ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔''

فضالہ نے نفی میں جواب دیا اور یہ شعر پڑھے:

قَالَتْ هَلُمَّ إِلَى الْحَدِيثِ فَقُلْتُ لَا
يَأْبَى عَلَيْكِ اللّٰهُ وَالْإِسْلَامُ

"اُس نے کہا: "آؤ باتیں کریں۔" میں نے کہا: "نہیں۔" اللہ اور اسلام تمھاری یہ بات نہیں مانتے۔"

لَوْ مَا رَأَيْتِ مُحَمَّدًا وَ قَبِيلَهُ
بِالْفَتْحِ يَوْمَ تُكَسَّرُ الْأَصْنَامُ

"اگر تم فتح کے دن محمد اور اُن کے زمرے کے افراد کو دیکھتی، جس دن بت ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔"

لَرَأَيْتِ دِيْنَ اللّٰهِ أَضْحٰى بَيِّنًا
وَالشِّرْكَ يَغْشٰى وَجْهَهُ الْأَظْلَامُ

"تم دیکھتی کہ اللہ کا دین غالب آ چکا ہے اور شرک کا چہرہ تاریکیوں نے ڈھانپ لیا ہے۔"

بعد کے دنوں میں فضالہ رضی اللہ عنہ بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں سے درگزر کر کے اُن کے دل جیت لیتے تھے۔ لوگوں کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے آپ کو بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابو طالب قریش کے مقابلے میں نبی ﷺ کا دفاع کیا کرتے تھے۔ ابو طالب فوت ہوئے تو قریش دلیر ہو گئے اور اُن کے ظلم وستم میں اضافہ ہو گیا۔ اُنھوں نے نبی ﷺ پر مکہ کی زمین تنگ کر دی۔ ابوطالب کی زندگی میں وہ آپ ﷺ سے ایسا سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ نبی ﷺ سوچنے لگے کہ کون سی جگہ ہو جہاں پناہ لی جائے اور وہاں نصرت وتائید بھی حاصل ہو۔

آپ قبیلۂ ثقیف کی حمایت حاصل کرنے طائف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر آپ ثقیف کے تین سرداروں عبدیالیل بن عمرو اور اُس کے بھائیوں مسعود وحبیب کے ہاں گئے۔ آپ نے اُن سے بات چیت کی۔ اُنھیں اللہ کی طرف بلایا۔ اسلام کے حق میں اُن سے مدد کے طالب ہوئے۔ جواب میں اُنھوں نے بہت بدزبانی کی۔ ایک نے کہا: ''اگر تمھیں اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو تو میں کعبہ کے غلاف کا لباس بنا لوں۔''

دوسرا کہنے لگا: ''اللہ کو تمھارے علاوہ اور کوئی نہیں ملا جسے وہ رسول بنا کر بھیجتا؟''

تیسرے نے بلاغت بگھارتے ہوئے کہا: ''اگر تم اللہ کے رسول ہو، جیسے کہ تم کہہ رہے ہو تو تمھاری شان اس سے کہیں بلند ہے کہ تمھیں کوئی جواب دیا جائے۔ اور اگر تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میرے لائق نہیں کہ تم سے کلام کروں۔''

رسول اللہ ﷺ اُن کی طرف سے مایوس ہو کر اُٹھنے لگے۔ آپ کو خدشہ تھا کہ قریش کو پتا چل گیا کہ ثقیف کے سرداروں نے محمد کو کیا جواب دیا ہے تو وہ اور دلیر ہو جائیں گے۔ آپ نے اُن سے کہا:

''آپ لوگوں نے جو کیا سو کیا۔ اس ملاقات کو راز رکھنا۔''

اُنھوں نے یہ بات بھی مسترد کر دی اور شہر کے اوباشوں اور غلاموں کو شہ دی۔ وہ آپ کے پیچھے بھاگتے، آوازے کستے اور گالیاں بکتے۔ اُنھوں نے دائیں بائیں دو لائنیں بنا لیں اور آپ پر پتھر برسانے لگے۔ آپ تیز لہولہان قدموں سے چل رہے تھے۔ چلتے چلتے دور نکل گئے اور ہانپتے ہوئے کھجور کے سائے میں بیٹھ گئے۔ سخت دل برداشتہ تھے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي، وَقِلَّةَ حِيلَتِي، وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ. يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ، أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَأَنْتَ رَبِّي،

إِلٰى مَنْ تَكِلُنِي؟ إِلٰى بَعِيدٍ يَتَجَهَّمُنِي، أَمْ إِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَّمْ تَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِي، وَلٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِيَ أَوْسَعُ لِي. أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، أَنْ تُنْزِلَ بِي غَضَبَكَ، أَوْيَحُلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ. لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ»

''اے اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ تُندی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جسے تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادہ ہے۔ میں تیرے چہرے کے اُس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہو گئیں اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوئے کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے یا تیرا عتاب مجھ پر وارد ہو۔ تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ اسی عالم میں بیٹھے تھے کہ ایک بدلی میں جو آپ پر سایہ فگن تھی، جبریل علیہ السلام دکھائی دیے۔ اُنھوں نے آواز دی:

''اے محمد! اللہ نے آپ کی قوم کا جواب سُن لیا ہے۔ اُس نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے۔ آپ اُسے جو چاہیں حکم دیں۔''

اس سے پہلے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ کہتے، پہاڑوں کا فرشتہ بولا:

''یا رسول اللہ! السلام علیک! اللہ نے آپ کی قوم کا جواب سن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا

فرشتہ ہوں۔ آپ کے رب نے مجھے آپ کی جانب بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں حکم دیں۔ آپ چاہیں تو اس قوم کو ان دو پہاڑوں میں رکھ کر پیس دیا جائے۔"

پہاڑوں کا فرشتہ حکم کے انتظار میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جوشِ انتقام اور نفس کی خواہشات کچلتے ہوئے کہا:

"نہیں، میں ان کا انتظار کروں گا۔ اُمید ہے کہ اللہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کریں گے اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔"[1]

بہادر بنیے

وَإِنَّ الَّذِي بَيْنِي وَبَيْنَ بَنِي أَبِي
وَبَيْنَ بَنِي عَمِّي لَمُخْتَلِفٌ جِدًّا

"میرا مزاج بھائیوں اور عم زادوں سے بہت مختلف ہے۔"

فَإِنْ أَكَلُوا لَحْمِي وَفَرْتُ لُحُومَهُمْ
وَإِنْ هَدَمُوا مَجْدِي بَنَيْتُ لَهُمْ مَجْدَا

"وہ میرا گوشت کھاتے ہیں تو کھا جائیں لیکن میں اُن کا گوشت بچا رکھوں گا۔ اگر وہ میری خاندانی عظمت اور ناموری کی عمارت ڈھاتے ہیں تو میں اُن کی عظمت کا محل تعمیر کروں گا۔"

وَلَيْسُوا إِلَى نَصْرِي سِرَاعًا
وَإِنْ هُمْ دَعَوْنِي إِلَى نَصْرٍ أَتَيْتُهُمْ شَدًّا

’’وہ میری مدد کو جلدی نہیں آئے۔ لیکن وہ مجھے مدد کے لیے پکاریں تو میں بھاگم بھاگ جاؤں گا۔‘‘

وَلَا أَحْمِلُ الْحِقْدَ الْقَدِيمَ عَلَيْهِمْ
وَلَيْسَ رَئِيسُ الْقَوْمِ مَنْ يَحْمِلُ الْحِقْدَ

’’میں اُن کے خلاف پرانی رنجش سینے میں اٹھائے نہیں پھرتا۔ قوم کا سردار دل میں خار نہیں رکھتا۔‘‘

---

1 حٰمٓ السجدة 41:34. 2 البحر الزخار: 294/15، حدیث: 8799. یہ حدیث ضعیف ہے 3 البداية والنهاية: 306/4. 4 مجمع الزوائد: 35/6، وکنز العمال: 175/2، حدیث: 3613، و البداية والنهاية: 134/3. یہ حدیث ضعیف ہے۔ 5 السيرة النبوية لابن هشام: 421,420/2، و البداية والنهاية: 135/3۔

پہلے غلطی کا احساس دلائیں پھر نصیحت کریں

بعض لوگ دوسروں کو اس قدر نصیحتیں کرتے اور مفت مشورے عنایت فرماتے ہیں کہ سننے والے کی طبیعت اوب جاتی ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب نصیحت یا مفت مشورہ کسی شخص کے ذاتی مزاج یا رائے کا نتیجہ ہو۔

مثال کے طور پر آپ گھر میں بڑی دعوت کا اہتمام کرتے ہیں جس میں بہت سے لوگ مدعو ہوتے ہیں۔ ایک دوست جسے ہر بات میں کیڑے نکالنے اور مفت مشورے دینے کی عادت ہے، کہتا ہے:

''دعوت کا مزہ نہیں آیا۔ ساری محنت اکارت گئی۔ میں تو یہ خیال کیے بیٹھا تھا کہ بڑی معیاری دعوت ہوگی۔'' آپ حیران ہو کر پوچھتے ہیں: ''کیوں؟''

وہ جواب دیتا ہے: ''گوشت بھنا ہوا تھا جبکہ میں اُبلا ہوا گوشت پسند کرتا ہوں۔ لیموں کی وجہ سے سلاد بھی کھٹا ہو رہا تھا۔ مجھے سلاد بالکل پسند نہیں۔ میٹھے کا بھی کچھ خاص ذائقہ نہیں تھا۔ اکثر افراد نے آپ کی دل جوئی کے لیے کھانا کھایا اور کچھ نے اس لیے کھا لیا کہ اُنھیں بھوک لگی تھی۔''

آپ قطعی طور پر اُس کی باتیں نظر انداز کر دیں گے اور اس کا مشورہ قبول نہیں کریں گے کیونکہ یہ باتیں ذاتی رائے یا مزاج کا نتیجہ ہیں۔

اسی طرح وہ شخص بھی جو اپنا ذوق دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے اور اُن کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرتا ہے، نظرانداز کر دینے کے لائق ہے۔ ایسے آدمی کا مشورہ یا تنقید ہمیشہ ذاتی مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہاں! کوئی آپ سے رائے طلب کرتا ہے تو آپ شوق سے رائے دیں۔ لیکن یہ مناسب نہیں کہ آپ اُسے یوں مشورہ دیں جیسے وہ کوئی غلطی کر بیٹھا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو نصیحت کی جا رہی ہو اُسے اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے نصیحت کرتے وقت آپ کے پاس قوی دلائل موجود ہونے چاہئیں۔

ایک ٹھیٹھ بدو صلحاء کی مجلس میں آ بیٹھا۔ وہ والدین سے حسنِ سلوک کے موضوع پر مذاکرہ کر رہے تھے۔ بدو سنتا رہا۔ ایک صاحب نے اُس سے پوچھا: ''اے بھائی! اپنی والدہ سے آپ کا حسنِ سلوک کیسا ہے؟''

بدو نے جواب دیا: ''میں اُس سے بہت حسنِ سلوک کرتا ہوں۔''

اُن صاحب نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

بدو نے سادگی سے کہا: ''واللہ! میں نے کبھی اپنی ماں کو کوڑے سے نہیں پیٹا۔''

آپ کو نرمی اور لطافت اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آپ کے مخاطب کو اپنی غلطی کا احساس کرنے میں آسانی ہو۔

عہدِ نبوی میں بنو مخزوم کی ایک عورت لوگوں سے روزمرہ استعمال کی مختلف چیزیں اُدھار لیا کرتی اور استعمال کے بعد واپس نہیں کرتی تھی۔ لوگ اپنی اشیاء کا مطالبہ کرتے تو وہ سرے سے انکار کر دیتی کہ میں نے یہ شے تم سے نہیں لی۔ اُس کی تخریب کاری حد سے بڑھ گئی تو لوگوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی عدالتِ عالیہ میں پیش کیا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ اُس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزری کہ ایک بڑے قبیلے بنو مخزوم سے تعلق رکھنے والی عورت کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اُنھوں نے نبی ﷺ سے اس

سلسلے میں بات چیت کرنا چاہی تاکہ سزا میں تخفیف کر دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے بات کرنے جو آدمی بھی جاتا، گھبرا کر بات کیے بغیر واپس آ جاتا۔ اُنھوں نے کہا اس کام کی مجال صرف اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو ہو سکتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پیارے ہیں اور آپ کے چہیتے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔ اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں پرورش پائی تھی اور آپ اُنھیں بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ قریش نے اسامہ سے بات کی۔ اسامہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے۔ آپ نے اُنھیں مرحبا کہا اور اپنے قریب بٹھایا۔ اسامہ نے کہا کہ اس فیصلے میں تخفیف کر دیجیے کیونکہ اُس عورت کا تعلق اشرافِ قریش سے ہے۔ اسامہ نبی ﷺ کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور نبی ﷺ خاموشی سے سنتے رہے۔ آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آپ نے غصے میں آ کر اسامہ کو اُن کی غلطی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

''اسامہ! کیا تم اللہ کی حد کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟''

اسامہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اُنھیں اپنی غلطی کا ادراک ہو گیا۔ اُنھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرے لیے مغفرت کی دعا کر دیجیے۔''

رات ہوئی تو آپ منبر پر کھڑے ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا:

''اما بعد! تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُن کا بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور کمزور آدمی چوری کرتا تو اُس پر حد نافذ کرتے۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر فاطمہ بنتِ محمد چوری کرتی تو میں اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

پھر آپ کے حکم سے اُس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں: ''بعد کے دنوں میں اُس عورت کی توبہ میں بہت خوبی آ گئی۔ اُس

نے شادی بھی کی۔ وہ میرے پاس آیا کرتی تھی اور میں اُس کی ضرورت اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے پیش کیا کرتی تھی۔"[1]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جُہینہ کے قبائل کی طرف روانہ کیا۔ ہم نے اُنھیں شکست دی اور تعاقب کیا۔ اُن کا ایک آدمی میرے اور ایک انصاری کے ہتھے چڑھ گیا۔ ہم نے تلواریں بلند کیں تو اُس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا۔ انصاری نے اپنی تلوار نیچے کر لی لیکن میں نے یہ سوچ کر کہ اُس نے اسلحے کے ڈر سے ایسا کیا ہے، حملہ کیا اور اُسے قتل کر دیا۔ اُس کے متعلق میرے دل میں خلش تھی۔ میں نے اس واقعے کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ نے حیرت سے پوچھا:

"اُس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اُسے قتل کر دیا؟"

میں نے کہا: "اُس نے ایسا دل سے نہیں، تلوار کے خوف سے کہا تھا۔"

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سوال دہرایا:

"اُس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اُسے قتل کر دیا؟"

"تم نے اُس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا تلوار کے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہے؟"

اسامہ خاموش تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اسامہ! تم نے ایک آدمی قتل کر دیا جبکہ اُس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا۔ قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کا کیا کرو گے۔"

اسامہ کہتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ بار بار یہی کہتے رہے، حتیٰ کہ مجھے خواہش ہوئی کہ کاش میں اس دن سے پہلے مسلمان نہ ہوتا۔"[2]

پہلے غلطی کا احساس دلائیں پھر نصیحت کریں

رسول اللہ ﷺ نے بتدریج اسامہ کو اُن کی غلطی کا احساس دلایا، پھر اُنھیں نصیحت کی۔ غلطی کرنے والے سے اس کے افکار و نظریات کے مطابق بات کرنی چاہیے۔ اصلاح کرنے والے کو اُس کے زاویۂ فکر پر سوچنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی مبارک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا کسی کی تلاش میں ہے۔ اُسے رسول اللہ ﷺ دکھائی دیے تو وہ آپ کی طرف آیا۔ توقع تھی کہ وہ مجلس میں بیٹھ کر آپ کی باتیں سنے گا۔ لیکن یہ کیا! اُس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا اور جرأت سے کہا: ''یارسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے نوجوان کی طرف دیکھ کر اطمینان سے کہا:

''کیا تمھیں اپنی والدہ کے لیے زنا پسند ہے؟''

اس نے کہا: ''نہیں۔''

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسی طرح لوگ بھی اسے اپنی ماؤں کے لیے پسند نہیں کرتے۔''

پھر دریافت کیا:

''کیا تم اپنی بہن کے لیے زنا پسند کرتے ہو؟''

نوجوان نے کہا: ''نہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسی طرح لوگ بھی اسے اپنی بہنوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔''

آپ ﷺ نے پھر پوچھا:

''کیا تم اپنی پھوپھی یا خالہ کے لیے زنا پسند کرتے ہو؟''

نوجوان نے اس بار بھی نفی میں جواب دیا۔

بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا:

"تو لوگوں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور لوگوں کے لیے بھی وہ ناپسند سمجھو جو تم خود ناپسند کرتے ہو۔"

اور نوجوان کو ادراک ہو گیا کہ وہ غلطی پر تھا۔ اس نے نہایت تواضع سے کہا:

"اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ میرا دل پاک کر دے۔"

رسول اللہ ﷺ نے نوجوان کے سینے پر ہاتھ رکھا اور دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَلْبَهُ، وَاغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَحَصِّنْ فَرْجَهُ»

"اے اللہ! اس کے دل کو ہدایت دے، اس کا گناہ معاف کر اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر۔"

نوجوان یہ کہتا ہوا مسجد سے باہر آ گیا: "واللہ! میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور مجھے دنیا کا کوئی کام زنا سے زیادہ پسند نہیں تھا اور اب یہ حالت ہے کہ دنیا کا کوئی کام مجھے زنا سے بڑھ کر ناپسند نہیں۔"[1]

ملاحظہ کیجیے رسول اللہ ﷺ نے نوجوان کی اصلاح کے لیے تمام اسالیب اختیار کیے۔ اسے بلایا، سینے پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

آپ ﷺ نے اُسے قائل کر لیا کہ جو فعل وہ کرنا چاہتا ہے، انتہائی گھناؤنا ہے اور قائل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اُس کے بعد وہ نوجوان اس فعل کا خیال بھی دل میں نہ لاتا۔

اصول

"غلطی کرنے والے کو غلطی کی قباحت کا احساس ہو جائے تو نصیحت قبول کرنا اُس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔"

[1] صحيح البخاري، حديث: 3475، وصحيح مسلم، حديث: 1688. [2] صحيح البخاري، حديث: 4269، وصحيح مسلم، حديث: 97,96. [3] مسند أحمد: 257/5.

مجھے ملامت مت کرو! بات ختم ہوگئی؟

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کو اُن کی غلطیوں پر، جو شاید خوردبین کے بغیر نظر نہ آ سکتی ہوں، ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کر کے اُن کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں یا اُن کی شخصیت مضبوط ہو جاتی ہے اور دوسروں پر اُن کا رعب پڑ جاتا ہے۔ جبکہ درحقیقت ملامت کر لینا سمجھداری اور ذہانت نہیں بلکہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ حتی الامکان دوسروں کو اُن کی غلطیوں پر جھاڑنے اور لعن طعن کرنے سے پرہیز کریں اور اصلاح کا ایسا طریقہ اپنائیں جو زخموں پر بجائے نمک کے پھایا کا کام کرے۔

زندگی کے بعض معاملات میں، بالخصوص دنیاوی مال و متاع اور ذاتی حقوق کے سلسلے میں انسان کو کبھی کبھار سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انجان بن جانا چاہیے۔ شاعر کا کہنا ہے:

لَيْسَ الْغَبِيُّ بِسَيِّدٍ فِي قَوْمِهِ

لٰكِنَّ سَيِّدَ قَوْمِهِ الْمُتَغَابِي

''انجان آدمی اُس کی قوم میں سردار نہیں بلکہ اُس کی قوم کا سردار انجان بننے کی کوشش کرتا ہے۔''

یہ پہلی بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے برسرِ عام نصیحت کرنے سے پرہیز کریں۔ کسی شاعر نے اس انسانی جذبے کی عکاسی دلکش انداز میں کی ہے:

تَعَمَّدْنِي بِنُصْحِكَ فِي انْفِرَادِي
وَجَنِّبْنِي النَّصِيحَةَ فِي الْجَمَاعَهْ

''مجھے اکیلے میں نصیحت کرو اور بھری محفل میں نصیحت کرنے سے پرہیز کرو۔''

فَإِنَّ النُّصْحَ بَيْنَ النَّاسِ
نَوْعٌ مِنَ التَّوْبِيخِ لَا أَرْضَى اسْتِمَاعَهْ

''لوگوں کے درمیان نصیحت سرزنش کی ایک شکل ہے جسے سننا میں پسند نہیں کرتا۔''

بلکہ جب غلطی کا بار بار اعادہ کیا جائے اور آپ لوگوں کو اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہتے ہوں تو عام انداز اختیار کرتے ہوئے ''چند لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں'' کے نسخے پر عمل کیجیے۔

یاد رکھیے ملامت کا اثر کوڑے کی ضرب جیسا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ بعض افراد سے صرف اس لیے متنفر ہوتے ہیں کہ وہ بات بے بات پر ملامت کا کوڑا اٹھائے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اکثر آئی گئی باتوں پر دوسروں کو کوستے نظر آتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ان سب باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

خیبر سے واپسی پر سفر کی طوالت نے مسلمانوں کو تھکا مارا۔ رات ہوئی تو آرام کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فجر کا خیال کون رکھے گا؟ شاید ہم سو جائیں۔''

بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں فجر کا خیال رکھوں گا۔'' رسول اللہ ﷺ لیٹ گئے۔ لوگ بھی آرام کرنے لگے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ سفر کی طوالت نے پہلے ہی بے حال کر رکھا تھا۔ تھک ہار کر اونٹ کے ساتھ ٹیک لگائی اور

بیٹھ گئے۔ فجر کا انتظار کرتے کرتے اُن کی آنکھ لگ گئی۔ سب لوگ تھکاوٹ سے چور تھے، اس لیے خوب سوئے۔ رات گزری، سویرا ہوا۔ آخر سورج کی تپش نے اُنھیں بیدار کیا۔ رسول اللہ ﷺ جاگے اور لوگوں کو بھی جگایا۔ سورج سر پر دیکھا تو لوگ پریشان ہوئے۔ ہر کوئی بلال کو گھور رہا تھا۔ نبی ﷺ بلال سے مخاطب ہوئے اور دریافت کیا:

''بلال! تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟''

بلال رضی اللہ عنہ نے مختصر لیکن درست جواب دیا: ''یا رسول اللہ! مجھے بھی اُسی شے نے آ لیا تھا جو آپ کو آ گئی۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم نے ٹھیک کہا۔''

اور اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کا اضطراب دیکھا تو فرمایا:

''کوچ کرو۔''

لوگوں نے کوچ کیا۔ تھوڑی دور گئے۔ رسول اللہ ﷺ سواری سے اترے۔ لوگ بھی اترے۔ آپ نے وضو کیا۔ لوگوں نے بھی وضو کیا۔ آپ نے لوگوں کو فجر کی نماز پڑھائی۔ سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''تم نماز بھول جاؤ تو جب یاد آئے پڑھ لیا کرو۔''[1]

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل کیسا دانش مندانہ اور حکمت سے بھرپور تھا۔ آپ کی ذات قائدین کے لیے مشعل راہ ہے۔ آج کل کے افسروں کی طرح نہیں جن کی لعنت ملامت اور گالی گفتار کا ڈنڈا ہمیشہ ماتحتوں کے سروں پر لہراتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھتے اور اُن کے ذہنوں سے سوچتے تھے۔ آپ ﷺ کا تعامل جسموں سے پہلے دلوں سے تھا۔ آپ جانتے تھے کہ وہ انسان ہیں، مشینیں نہیں۔

ہجرت کے آٹھویں برس رومیوں نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا اور مسلمانوں سے جنگ کے لیے شام کی طرف سے پیش قدمی کی۔ یہ بھی روایت ہے کہ خود نبی ﷺ نے لشکر جمع کر کے اُن کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا تھا۔ آپ کو رومیوں کی پیش قدمی کا علم ہوا تو آپ نے اُن کے مقابلے کے لیے تین ہزار کا لشکر اکٹھا کر کے اُسے جنگی ساز و سامان سے لیس کر دیا۔ سپاہیوں سے الوداعی خطاب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آپ لوگوں کے امیر زید بن حارثہ ہوں گے۔ وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے۔''

آپ لشکر کو رخصت کرنے نکلے۔ لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ لشکر کے سپاہیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''اللہ آپ لوگوں کا ساتھی ہو۔ وہ آپ کا دفاع کرے اور صحیح سلامت واپس لائے۔''

شوقِ شہادت کے نشے میں سرشار عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

لٰكِنَّنِي أَسْأَلُ الرَّحْمٰنَ مَغْفِرَةً
وَضَرْبَةً ذَاتَ فَرْغٍ تَقْذِفُ الزَّبَدَا

''لیکن میں تو رحمٰن سے مغفرت کا سوالی ہوں اور گہری چوٹ کا جو خون کی جھاگ باہر نکال دے۔''

أَوْ طَعْنَةً بِيَدَيْ حَرَّانَ مُجْهِزَةً
بِحَرْبَةٍ تُنْفِذُ الْأَحْشَاءَ وَالْكَبِدَا

''اور مضبوط قاتل ہاتھوں سے نیزے کا وار جو انتڑیاں اور جگر چیرتا ہوا نکل جائے۔''

حَتّٰی یُقَالَ إِذَا مَرُّوا عَلٰی جَدَثِي
أَرْشَدَهُ اللّٰهُ مِنْ غَازٍ وَّقَدْ رَشَدَا

''اور جب لوگ میری لاش کے قریب سے گزریں تو کہا جائے: ''اے سپاہی! اللہ نے تجھے ہدایت دی اور تو ہدایت پا گیا۔''

اسلامی لشکر موتہ کی جانب بڑھا اور شام پہنچ کر معان میں پڑاؤ کیا۔ وہاں اُنھیں خبر ملی کہ شاہِ روم ہرقل ایک لاکھ کا لشکر لیے بلقاء سے آ پہنچا ہے۔ نصرانی عرب قبائل کے مزید ایک لاکھ جنگجو بھی اُس سے آ ملے۔ اب رومیوں کے لشکر کی تعداد دو لاکھ ہو گئی۔ مسلمانوں نے تحقیق کی تو یہ بات صحیح نکلی۔ اُنھوں نے دو راتیں مشاورت کرتے ہوئے معان ہی میں گزار دیں۔ بعض نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کو خط لکھ کر دشمن کی تعداد سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ یا تو مرکز سے کمک بھیجی جائے یا رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں اُس پر عمل کیا جائے۔ اس بات پر خاصی بحث و تکرار ہوئی۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! واللہ! جس شے سے تم گھبرا رہے ہو اُسی کی تلاش میں نکلے تھے۔ اللہ کی راہ میں شہادت۔ تم اس سے بھاگ رہے ہو! ہم لوگوں سے تعداد اور قوت و کثرت کے بل پر نہیں لڑتے۔ ہم اُن سے اسی دین کے بل بوتے پر جنگ کرتے ہیں جس سے اللہ نے ہمیں نوازا ہے۔ آگے بڑھو، انجام دونوں صورتوں میں اچھا ہو گا، یا تو فتح حاصل ہو گی یا شہادت ملے گی۔''

عبداللہ بن رواحہ کی جوشیلی تقریر نے لوگوں کی ڈھارس بندھا دی اور وہ پیش قدمی کرتے ہوئے رومیوں کے قریب ''موتہ'' کے مقام پر پہنچ گئے۔ رومیوں نے اتنا بڑا لشکرِ جرار اکٹھا کر رکھا تھا جس کے مقابلے کی تاب کسی کو نہیں تھی۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں موتہ کے لشکر میں شامل تھا۔ مشرک ہمارے قریب

آئے تو ہم جنگ کے لیے اُن کی شاندار تیاری دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ رومی لشکر کیل کانٹے سے لیس، سونا چاندی اور حریر و دیباج سے اٹا پڑا تھا۔ گھوڑ سواروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ ایسا لشکرِ جرار جس سے سامنا کرنے کی کسی کو مجال نہیں تھی۔

ثابت بن ارقم نے مجھ سے کہا: ''ابو ہریرہ! لگتا ہے تمھیں بڑے لشکر نظر آ رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''ہاں۔''

وہ بولے! ''تم بدر میں ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم کثرت کے بل پر فتح نہیں پاتے۔''

اس کے بعد دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اسلام کا پرچم تھامے مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ ان پر نیزوں کی بارش کی گئی اور وہ شہید ہو کر گر پڑے۔ اس پر جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جرأتِ رندانہ سے جھنڈا لیا، اپنی سرخ گھوڑی سے اتر کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور کھلبلی مچا دی۔ اُن کی زبان پر یہ رجزیہ اشعار تھے:

يَا حَبَّذَا الْجَنَّةُ وَاقْتِرَابُهَا

طَيِّبَةٌ وَّبَارِدٌ شَرَابُهَا

''ہائے! پاکیزہ جنت کا قرب اور اُس کا ٹھنڈا میٹھا مشروب کتنا فرحت افزا ہے۔''

وَالرُّومُ رُومٌ قَدْ دَنَا عَذَابُهَا

كَافِرَةٌ بَعِيدَةٌ أَنْسَابُهَا

''کافر رومیوں کے عذاب کا وقت قریب آ چکا ہے جن کے نسب دور کے ہیں۔''

عَلَيَّ إِنْ لَّاقَيْتُهَا ضِرَابُهَا

''میرا اُن سے سامنا ہو جائے تو اُن کا کچومر نکالنا مجھ پر لازم ہے۔''

جعفر نے دائیں ہاتھ میں پرچم اٹھا رکھا تھا۔ اُسے کاٹ دیا گیا۔ اُنھوں نے پرچم بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا تو کٹے ہوئے بازوؤں میں پرچم لے

کر سینے سے لگائے رکھا اور آخر دم تک گرنے نہ دیا۔ اُنھیں بھی شہید کر دیا گیا۔ اُن کی عمر تینتیس سال تھی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے جسم پر میں نے اُس دن تلوار اور نیزے کے پچاس زخم شمار کیے۔ ایک زخم بھی پشت پر نہیں تھا۔''

اللہ نے اُنھیں جنت میں دونوں بازوؤں کے بدلے دو پر عطا کیے جن سے وہ جہاں چاہتے ہیں اُڑتے پھرتے ہیں۔ ایک رومی نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر تلوار کا ایسا وار کیا جس نے ان کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے۔ جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ گھوڑے پر سوار آگے بڑھے اور دل کو نیچے اتر کر مقابلہ کرنے پر مائل کرنے لگے۔ دل نے انکار کیا تو بولے:

أَقْسَمْتُ يَا نَفْسُ لَتَنْزِلَنَّهْ

لَتَنْزِلَنْ أَوْ لَتُكْرَهَنَّهْ

''اے نفس! میں نے قسم کھائی ہے کہ تو اترے گا، تجھے اترنا ہوگا یا پھر تجھے مجبور کرنا پڑے گا۔''

إِنْ أَجْلَبَ النَّاسُ وَشَدُّوا الرَّنَّهْ

مَا لِي أَرَاكَ تَكْرَهِينَ الْجَنَّهْ

''لوگوں نے یکبارگی ہلا بول دیا ہے تو میں تجھے جنت سے گریزاں کیوں دیکھ رہا ہوں۔''

پھر اُنھیں دونوں صاحبوں زید و جعفر رضی اللہ عنہما کی یاد آئی تو گویا ہوئے:

يَا نَفْسُ إِلَّا تُقْتَلِي تَمُوتِي

هٰذَا حِمَامُ الْمَوْتِ قَدْ صَلِيتِ

''اے نفس! اگر تو قتل نہیں ہوا تو بھی (بالآخر) مرے گا۔ موت کے اس حمام میں تو داخل ہو چکا ہے۔''

وَمَا تَمَنَّيْتِ فَقَدْ أُعْطِيتِ

إِنْ تَفْعَلِي فِعْلَهُمَا هُدِيتِ

''جو تمنا کرے گا، تجھے ملے گا۔ اگر تو ان دونوں (زید و جعفر) جیسا کام کرے گا تو ہدایت پائے گا۔''

یہ کہہ کر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اتر آئے۔ قدموں پر جم کر کھڑے ہوئے تو ان کا عم زاد گوشت کی ہڈی لایا اور بولا: ''یہ کھاؤ اور کمر مضبوط کر لو۔ جنگ کے یہ دن تمھارے لیے بڑے پرمشقت رہے ہیں۔'' اُنھوں نے ہڈی سے گوشت نوچا، پھر لوگوں کی طرف شور سنا تو ہڈی کی طرف دیکھ کر کہا: ''اور تم ابھی تک دنیا میں ہو؟'' یہ کہہ کر ہڈی پھینک دی۔ تلوار لے کر دشمن کے قلب میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جھنڈا گرنے کی دیر تھی کہ مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا۔ کافر خوش ہو گئے۔ گھوڑے جھنڈے کو روندتے ہوئے گزر رہے تھے اور وہ غبار سے اٹا پڑا تھا۔ ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو آگے بڑھے، جھنڈا اٹھایا اور بلند آواز سے کہا: ''مسلمانو! یہ رہا جھنڈا۔ کسی آدمی پر اتفاق کر لو۔'' جن لوگوں تک اُن کی آواز پہنچی اُنھوں نے پکارا: ''آپ ہی امیر ہیں۔''

اُنھوں نے کہا: ''نہیں، میں یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔''

لوگوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے پرچم ہاتھ میں لیا اور دیوانہ وار جنگ لڑی۔ خود کہتے ہیں کہ موتہ کے دن میرے ہاتھوں نو تلواریں ٹوٹ گئیں اور ایک یمنی بانا میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس کے بعد خالد نے اپنے لشکر کے ہمراہ پسپائی اختیار کی۔ رومی بھی اپنے کیمپ میں چلے گئے۔ خالد کو خدشہ تھا کہ رات کو لشکر لے کر وہ

مدینہ روانہ ہوئے تو رومی تعاقب میں آئیں گے۔ صبح ہوئی تو اُنھوں نے لشکر کی پوزیشنیں بدل دیں۔ مقدمۃ الجیش پیچھے کر دیا اور پیچھے والوں کو اگلی صفوں میں لے آئے۔ میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ کی جگہ مقرر کر دیا۔

جنگ کا آغاز ہوا۔ رومیوں نے پیش قدمی کی تو اُنھیں نئے چہروں کے ساتھ نئے جھنڈے نظر آئے۔ وہ گھبرا کر کہنے لگے: ''رات کو ان کے پاس کمک آ گئی ہے۔'' یوں لڑائی کے دوران رومیوں کا مورال پست رہا۔ مسلمانوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور اُن کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسلمانوں کے صرف بارہ آدمی شہید ہوئے۔ دن کے آخری پہر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لشکر کو میدانِ جنگ سے نکال لائے اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ پہنچے تو بچے دوڑے ہوئے آئے۔ عورتیں بھی نکل آئیں۔ اہلِ مدینہ لشکر کے چہروں پر مٹی پھینکتے اور کہتے: ''ارے مفرورو! اللہ کے راستے سے بھاگ آئے ہو؟''

رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ اہلِ لشکر کے سامنے صرف یہی راستہ تھا اور اُنھوں نے وہی کیا جو اُن کے بس میں تھا۔ آپ نے اُن کا دفاع کرتے ہوئے کہا:

''یہ مفرور نہیں بلکہ لوٹ کر حملہ کرنے والے ہیں، ان شاء اللہ!''[2]

آپ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ واقعی اُن بہادروں نے کوتاہی نہیں کی تھی۔ لیکن بہرحال وہ انسان تھے اور معاملے کی سنگینی اُن کی ہمت سے بڑھ کر تھی۔ اُنھیں ملامت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا دائمی طرزِ عمل تھا۔

اہلِ مکہ نے جب یہ سنا کہ رسول اللہ ﷺ لشکر لے کر فتحِ مکہ کے لیے آ رہے ہیں تو اُن پر رعب طاری ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے لشکر کے آگے آگے آدمی بھیجا جس نے مکہ میں منادی کر دی:

’’جو دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہا اُسے امان ہے۔ جو مسجد میں آ گیا اُسے امان ہے۔ جو ابوسفیان کے گھر چلا گیا اُسے بھی امان ہے۔‘‘

یہ سن کر لوگ تتر بتر ہو گئے۔ قریش کے چند شہ سواروں نے اسلامی لشکر کے آڑے آنا چاہا لیکن قریش نے اُنھیں روک دیا۔ اُن کے کچھ افراد خندمہ نامی ایک مکان میں جمع ہوئے۔ صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ انھوں نے لڑائی کی تیاری کے لیے اور لوگوں کو بھی خندمہ میں اکٹھا کیا۔ اسلامی لشکر کے مکہ میں آنے سے پہلے حماس بن قیس اپنا اسلحہ مرمت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس کی بیوی نے پوچھا: ’’تم یہ تیاری کیوں کر رہے ہو؟

حماس بن قیس نے جواب دیا: ’’محمد اور اس کے ساتھیوں کے لیے۔‘‘

بیوی نے کہا: ’’واللہ! مجھے نہیں لگتا کہ محمد اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں کوئی جم سکے گا۔‘‘

حماس بن قیس نے جوش میں آ کر کہا: ’’واللہ! مجھے امید ہے کہ میں اُن میں سے بعض کو تمھارا خادم بنا دوں گا۔‘‘

پھر اُس نے سینہ پھلا کر یہ رجز پڑھا:

إِنْ يُقْبِلُوا الْيَوْمَ فَمَا لِي عِلَّهْ
هٰذَا سِلَاحٌ كَامِلٌ وَّ أَلَّهْ
وَذُو غِرَارَيْنِ سَرِيعُ السَّلَّهْ

’’اگر وہ آج بھی آ جائیں تو مجھے کیا تکلیف ہے؟ مکمل اسلحہ یہ پڑا ہے۔ چوڑے پھل کا نیزہ اور تیزی سے سونتی جانے والی دو دھاری تلوار بھی تیار ہے۔‘‘

حماس بن قیس گھر سے نکل کر خندمہ گیا جہاں اُس کے ساتھی جمع تھے۔ جلد ہی اُن کا

ٹاکرا مسلمانوں کے دستے سے ہوا جس کی قیادت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ لڑائی شروع ہوئی۔ بہادر بڑھ بڑھ کے ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ چند ثانیوں میں مشرکین کے بارہ یا تیرہ آدمی ڈھیر ہو گئے۔ حماس بن قیس نے یہ صورتِ حال دیکھی تو صفوان اور عکرمہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دونوں خود پسپائی اختیار کر کے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ حماس بن قیس بھی بھاگا اور اپنے گھر میں جا گھسا۔ اس نے چلا کر بیوی سے کہا: ''دروازہ بند کر دو۔ وہ کہہ رہے ہیں جو دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہا اُسے امان ہے۔'' بیوی بولی: ''وہ ڈینگ کیا ہوئی کہ اُنھیں شکست دے کر میرا خادم بناؤ گے؟'' حماس نے بے ساختہ کہا:

إِنَّكِ لَوْ شَهِدْتِ يَوْمَ الْخَنْدَمَهْ
إِذْ فَرَّ صَفْوَانُ وَفَرَّ عِكْرِمَهْ

''تم خندمہ کے دن موجود ہوتی، جب صفوان اور عکرمہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگ گئے۔''

وَأَبُو يَزِيدَ قَائِمٌ كَالْمُوْتِمَهْ
وَاسْتَقْبَلَتِهِمْ بِالسُّيُوفِ الْمُسْلِمَهْ

''ابو یزید (سہیل بن عمرو) یتیموں کی بے چاری ماں کی طرح کھڑا تھا اور تمھارا اُن سے ٹاکرا ہوتا، اُن کے ہاتھ میں ایسی تلواریں تھیں''

يَقْطَعْنَ كُلَّ سَاعِدٍ وَّ جُمْجُمَهْ
ضَرْبًا فَلَا يُسْمَعُ إِلَّا غَمْغَمَهْ

''جو بازو اور کھوپڑیاں کاٹ کاٹ کر پھینکتی جاتی تھیں۔ وہاں صرف بہادروں کی ہاؤ ہو سنائی دیتی تھی۔''

لَهُمْ نَهِيتٌ خَلْفَنَا وَ هَمْهَمَهْ
لَمْ تَنْطِقِي فِي اللَّوْمِ أَدْنٰى كَلِمَهْ

''وہ ہمارے تعاقب میں آئے۔ اُن کے سینوں سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے شیر جوشِ غضب میں ہانپتا ہے۔ اُس دن تم موجود ہوتی تو ملامت کا ایک لفظ نہ کہتی۔''[4]

حماس بن قیس کی یہ بات بالکل درست تھی۔ اُس کی بیوی لڑائی کی شدت و مشقت دیکھ آتی تو واقعی ملامت کا ایک لفظ نہ کہتی۔

رسول اللہ ﷺ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ آپ کو شہرِ حرام مکہ کی عظمت کا پورا احساس تھا۔ آپ نے معمولی لڑائی کی اور اس کے بعد کہا:

''اللہ نے یہ شہر اسی روز حرام قرار دیا تھا جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اُس نے میرے لیے محض دن کا ایک پہر حلال کیا تھا۔''[5]

اس پر رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا: ''یا رسول اللہ! آپ یہاں لڑائی سے منع کرتے ہیں اور اُدھر خالد بن ولید اپنے دستے کے ہمراہ سامنے آنے والے ہر مشرک کو اُڑاتے جا رہے ہیں۔''

فرمایا:

''اے فلاں، اٹھو اور جا کر خالد بن ولید سے کہو کہ قتل و غارت سے اپنا ہاتھ اٹھا لیں۔''

وہ آدمی جانتا تھا کہ مسلمان حالتِ جنگ میں ہیں اور نبی ﷺ نے قریش سے کہہ رکھا ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور قتل ہونے سے بچ جائیں، اس لیے جو آدمی گھر سے باہر ہے اُسے قتل ہونا چاہیے۔ اُس آدمی نے آپ کی اس بات سے کہ ''قتل و غارت سے

اپنا ہاتھ اُٹھالیں'' یہ سمجھا کہ سامنے آنے والے ہر شخص کو قتل کر دیں حتیٰ کہ جب کوئی مزاحمت کار باقی نہ رہے تو تلوار سمیت اپنا ہاتھ اٹھالیں۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور خالد سے کہا:

''یا خالد! رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنا بس چلتا ہے قتل کریں۔''

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ستر آدمی قتل کیے۔ ایک آدمی دوبارہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! خالد کی قتل و غارت گری جاری ہے۔''

آپ کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے خالد رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ ذرا تشریف لائیں۔

خالد رضی اللہ عنہ آئے تو آپ نے پوچھا:

''میں نے آپ کو قتل و غارت سے روکا نہیں تھا؟''

خالد رضی اللہ عنہ نے حیرت سے کہا: ''اے اللہ کے رسول! فلاں آدمی نے آ کر مجھ سے کہا تھا کہ جتنا بس چلے قتل کروں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کو بلوایا۔ وہ آیا تو آپ نے پوچھا:

''کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ خالد قتل و غارت سے ہاتھ اُٹھالیں۔''[6]

آدمی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ بولا:

''یا رسول اللہ! آپ نے ارادہ کیا۔ اللہ نے بھی ارادہ کیا۔ اللہ کا حکم آپ کے حکم سے اوپر تھا۔ میرے بس میں وہی تھا جو ہو گیا۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔

زندگی کے نشیب و فراز پر جس شخص کی نظر ہو اس کے لیے ایسے معاملات کی صورت بہت واضح ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بساط بھر کوشش سے بہترین طریقہ اختیار کرتا ہے۔ میں ایک نوجوان کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا۔ اس کی ڈرائیونگ عمدہ تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے اس کی گاڑی کا تصادم ہو چکا ہے۔ میں نے

اس سے پوچھا:

''میرے خیال میں آپ اچھی ڈرائیونگ کر لیتے ہیں، پھر ہفتہ پہلے آپ کی گاڑی کا تصادم کیوں ہوا تھا؟''

اس نے کہا: ''وہ حادثہ پیش آنا ہی تھا۔ تصادم کیے بنا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

میں نے کہا: ''تعجب ہے!''

کہنے لگا: ''ہاں! تصادم ہونا ہی تھا۔ جانتے ہیں کیوں؟''

میں نے پوچھا: کیوں؟

بولا: ''میری گاڑی پُل پر چڑھی تھی اور رفتار خاصی تھی۔ اگلی طرف اترائی میں چند گاڑیاں کھڑی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیوں کھڑی تھیں۔ کوئی حادثہ ہوا تھا یا تفتیش ہو رہی تھی۔ میں نہیں جانتا۔ بہر حال میرے سامنے چار راستے تھے جو سب کے سب گاڑیوں سے پُر تھے۔ میرے پاس تین آپشن تھے۔ ایک یہ کہ فوراً گاڑی کا رُخ پھیروں اور پُل سے نیچے جا گروں۔ دوسرا یہ کہ پوری قوت سے بریک پر پیر رکھ دوں اور گاڑی سڑک پر قلابازیاں کھانے لگے اور تیسری بات جو آسان ترین تھی......''

میں نے جلدی سے پوچھا: ''وہ کیا؟''

اس نے کہا: ''وہ یہ کہ سامنے کھڑی چار گاڑیوں میں سے کسی ایک سے ٹکرا جاؤں۔''

میں ہنسا اور بولا: واہ! پھر آپ نے کیا کیا؟''

کہنے لگا: ''جہاں تک ممکن تھا میں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی، سامنے کھڑی گاڑیوں میں سے سستی ترین کار کا انتخاب کیا اور اسے ٹکر مار دی۔''

یہ کہہ کہ وہ زور سے ہنسا اور میں بھی ہنسنے لگا۔

بعد میں، میں نے سوچا کہ یہ نوجوان زیادہ ملامت کا مستحق نہیں کیونکہ اس کے سامنے آپشن محدود تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض مشکلات کا کوئی حل نہیں ہوتا۔

ایک نظر اِدھر بھی

”اپنے آپ کو غلطی کرنے والے کی جگہ رکھ کر سوچیے، پھر فیصلہ سنائیے۔“

---

(1) التمهيد لابن عبد البر:402,401/6، والسنن الكبرى للبيهقي:404,403/1. (2) السيرة النبوية لابن هشام:25,15/4، والبداية والنهاية:242,241/4. (3) صحيح مسلم، حديث:1780. (4) السيرة النبوية لابن هشام:49/4-52. (5) صحيح مسلم، حديث:1354,1353، ومسند أحمد:32/4، و المعجم الكبير للطبراني:40/11، حديث:11003، ومجمع الزوائد:284/3. (6) المعجم الكبير للطبراني: 41/11، حديث:11003، ومجمع الزوائد:284/3.

نصیحت کرنے سے پہلے غلطی کی تحقیق کر لیں

اس نے مجھے فون کیا۔ اس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ غصے سے بھرا ہوا ہے۔ اس سے قبل فہد نے مجھ سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ وہ اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ لوگ فتنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کے آہنگ میں سختی آ گئی۔ وہ بار بار کہنے لگا:

''آپ ایک ممتاز داعی اور مبلغ ہیں۔ آپ عالم ہیں۔ آپ جو کہیں گے، جو کریں گے اس کا محاسبہ ہو گا۔''

میں نے کہا: ''ابوعبداللہ! آپ اصل بات کی طرف آئیں۔''

وہ بولا: ''آپ نے اپنے اس لیکچر میں یہ اور یہ کہا تھا۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا: ''یہ کب کی بات ہے؟''

اس نے کہا: ''تین ہفتے پہلے کی۔''

میں نے صفائی پیش کی: ''میں نے تو ایک سال سے اس علاقے میں قدم نہیں رکھا۔''

اس نے اسی لہجے میں کہا: ''جی ہاں۔ اور آپ نے یہ بات بھی کہی تھی۔''

بعد میں مجھے پتا چلا کہ میرے اس بھائی کی نظر سے کوئی خود ساختہ اشتہار گزرا ہے جسے اس نے سچ سمجھ لیا ہے۔ اس ساری تقریر کی بنیاد وہی خود ساختہ اشتہار بنا ہے۔ یہ درست

ہے کہ ابو عبداللہ فہد کی محبت آج بھی میرے دل میں موجود ہے لیکن میرے نزدیک اس کی قدر و منزلت میں کمی آ گئی ہے۔ اس کی وجہ میرا یہ جاننا ہے کہ وہ فطری طور پر جلد باز واقع ہوا ہے۔ کتنے ہی لوگ اپنے افکار و نظریات کی بنیاد انھی خود ساختہ اشتہاروں پر رکھتے ہیں۔ بہت سے افراد آپ کے خیر خواہ بن کر آتے ہیں لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ کسی افواہ کے چکر میں پڑے ہیں۔ یہی افواہیں لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہیں اور وہ آپ کے متعلق ایسا تصور باندھ لیتے ہیں جس کی بنیاد سراسر جھوٹ پر ہوتی ہے۔

آپ کو خبر ملتی ہے کہ فلاں آدمی نے کسی ناروا فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس آدمی کے نزدیک آپ کی قدر میں کمی نہ آئے تو خبر پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لیں۔ یہی منہج نبوی ہے۔

نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی آیا۔ لباس بوسیدہ اور بال پراگندہ تھے۔ آپ نے چاہا کہ اس کی توجہ ظاہری تراش خراش کی طرف مبذول کرائی جائے۔ لیکن خدشہ ہوا کہ مبادا یہ آدمی واقعی نادار ہو۔ دریافت کیا:

”کیا تمھارے پاس مال ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”جی ہاں۔“

آپ ﷺ نے پوچھا:

”کون سا مال؟“

کہنے لگا: ”میرے پاس بھیڑ بکریاں، گھوڑے، اونٹ اور غلام سب ہیں۔“

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

”جب اللہ نے تمھیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اس کا اثر تم پر نظر آنا چاہیے۔“

پھر فرمایا:

''تمھاری قوم کی اونٹنیاں بچے جنتی ہیں۔ اُن کے کان ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں، تم استرا لیتے ہو، ان کے کان قطع کر دیتے اور کہتے ہو: ''یہ بحیرہ ہے۔'' یا تم ان کے جسموں پر چیرے دیتے اور کہتے ہو: ''یہ صرم ہے۔'' تم انھیں اپنے اور اپنے گھر والوں پر حرام قرار دیتے ہو۔''

وہ آدمی بولا: ''بالکل درست۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نے تمھیں جو کچھ عطا کیا وہ تمھارے لیے حلال ہے۔'' [1]

عام الوفود میں عرب کے بہت سے لوگ مسلمان ہو کر آئے اور نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بعض دوسرے مسلمان تو نہ ہوئے لیکن مدینہ آ کر صلح کا معاہدہ کر گئے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اصحابِ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے کہ اہلِ صدف کا وفد آ پہنچا۔ وفد دس سے چند اوپر سواروں پر مشتمل تھا۔ وہ آئے اور سلام کیے بغیر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

وہ بولے: ''جی ہاں۔''

''پھر سلام کیوں نہیں کیا؟''

اس پر وہ فوراً کھڑے ہوئے اور کہا:

''اے نبی! السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

''وعلیکم السلام، تشریف رکھیں۔''

وہ بیٹھ گئے اور آپ سے اوقاتِ نماز کے متعلق پوچھنے لگے۔ [2]

امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی قلمرو کے حدود نے وسعت اختیار کی تو انھوں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا۔ اہلِ کوفہ ان دنوں حکمرانوں کے خلاف ہنگامہ آرائی میں خاصے معروف تھے۔ چند شر پسندوں نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ وہ درست طریقے سے نماز تک نہیں پڑھا سکتے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ انھوں نے خط محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور اُنھیں سعد رضی اللہ عنہ کی طرف کوفے روانہ کر دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ سعد کو لے کر کوفہ کے گلی محلوں میں جائیں اور ان کے متعلق پوچھ گچھ کریں۔ محمد بن مسلمہ کوفے پہنچے اور سعد کو لے کر کوفے کی مساجد میں نمازیں پڑھتے اور لوگوں سے سعد کے متعلق پوچھ پاچھ کرتے رہے۔ انھوں نے کوفہ کی کوئی مسجد نہیں چھوڑی۔ لوگ ہر جگہ سعد کے بارے میں اچھے ریمارک دیتے۔ اتنے میں ابن مسلمہ اور سعد رضی اللہ عنہما بنو عبس میں داخل ہوئے۔ نماز کے بعد محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر لوگوں سے ان کے امیر سعد کی بابت دریافت کیا۔ لوگوں نے سعد کی تعریف کی اور انھیں ذمہ دار حکمران قرار دیا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں آپ لوگوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا آپ کو ان میں کوئی عیب نظر آیا؟''

لوگوں نے کہا:

''ہمارے نزدیک ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں۔''

ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنا سوال دہرایا تو مسجد کے آخر سے اسامہ بن قتادہ نامی ایک شخص اُٹھا اور بولا: ''جب آپ اللہ کی قسم دے رہے ہیں تو سن لیجیے: سعد مساوات سے نہیں چلتے

اور نہ فیصلے میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔‘‘

سعد رضی اللہ عنہ حیران ہو کر بولے: ’’کیا میں ایسا ہی ہوں؟‘‘

وہ آدمی بولا: ’’ہاں۔‘‘

اس پر سعد رضی اللہ عنہ نے کہا:

’’واللہ میں تین دعائیں کرتا ہوں، اے اللہ اگر تیرا یہ بندہ (اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جھوٹا ہے اور ریاکاری اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے تو اسے لمبی عمر دے اور اس کی ناداری بڑھا دے اور اسے فتنوں میں ڈال دے۔‘‘

یہ کہہ کر سعد رضی اللہ عنہ مسجد سے نکلے اور مدینے روانہ ہو گئے۔ چند سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس آدمی کو سعد رضی اللہ عنہ کی بد دعا لگ گئی۔ وہ بہت عمر رسیدہ ہوا، ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور کمر جھک گئی یہاں تک کہ زندگی سے اکتا گیا۔ فقر وفاقہ کا یہ عالم تھا کہ راستے میں بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا۔ بڑھاپے سے ابرو آنکھوں پر گرتے تھے۔ عورتیں اس کے قریب سے گزرتیں تو انھیں چھیڑتا۔ لوگ اس پر آوازے کستے اور گالیاں دیتے تو وہ کہتا:

’’میں کیا کروں۔ بڑا بوڑھا ہوں۔ فتنے میں پڑا ہوں۔ مجھے مردِ صالح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی آہ لگ گئی ہے۔‘‘[3]

حدیث

«كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ»

’’آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کہہ ڈالے۔‘‘[4]

---

[1] المستدرك للحاكم: 25/1، ومسند أحمد: 473/3، و صحيح ابن حبان حديث: 5416.

[2] الطبقات الكبرٰى: 329/1 ملخصاً. [3] صحيح البخاري، حديث: 755. [4] صحيح مسلم، حديث: 5.

ملامت ضرور کریں مگر نرمی سے

گذشتہ صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ آدمی کبھی کسی کو ملامت نہیں کر سکتا۔ ایسی بات نہیں۔ بسا اوقات دوسروں کو ملامت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آدمی کا جی چاہتا ہے کہ کسی بات پر اپنی اولاد، بیوی یا دوست کو سرزنش کرے لیکن اس کام کو قدرے مؤخر کرنا یا خفیف تر انداز اختیار کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ غلطی کرنے والے کو اتنا موقع ضرور دیں کہ وہ چہرے کی آب باقی رکھ سکے۔ فتحِ مکہ کے بعد مسلمانوں کو قوت حاصل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اسلامی لشکر کے ہمراہ حنین پر حملہ آور ہوئے۔ حنین کے مشرکین بڑی عمدگی سے صف آرا ہوئے تھے۔ پہلی صف شہ سواروں کی، دوسری پیدل سپاہیوں کی اور تیسری صف عورتوں کی تھی۔ ان کے بعد بکریاں اور اونٹ قطار اندر قطار کھڑے کیے گئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور بارہ ہزار تک پہنچتی تھی۔ مشرکین کے چند دستے مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے ہی وادی میں اِدھر اُدھر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ گئے تھے۔

جونہی جنگ کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کے جتھے وادی میں داخل ہوئے، مشرکین ان پر ہر طرف سے پل پڑے۔ اسلامی لشکر پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی گئی۔ لوگوں میں سخت اضطراب پھیلا اور مسلمان گھڑ سوار تتر بتر ہونے لگے۔ سب سے پہلے اعرابی

بھاگے۔ میدان جنگ میں کافروں کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ لشکر کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ خون کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ گھڑسوار بدحواسی میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ آپ نے عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مہاجرین وانصار کو آواز دیں۔ انھوں نے بلند آواز سے پکارا: ''اے مہاجرین، اے انصار کے لوگو!'' عباس کی آواز نے جادوئی اثر کیا۔ لوگ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے اور اسّی یا سو افراد رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ دوسرے مرحلے میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی اور لڑائی اختتام کو پہنچی۔ نبی ﷺ کے روبرو غنائم کا ڈھیر لگایا گیا تو جو لوگ میدانِ جنگ سے فرار کر گئے تھے وہی سب سے پہلے غنیمت کا حصہ لینے آ دھمکے۔ اعرابی رسول اللہ ﷺ سے چمٹ گئے اور کہنے لگے: ''ہمارا مالِ غنیمت ہم میں تقسیم کریں، ہمارا مالِ غنیمت ہم میں تقسیم کریں۔''

تعجب ہے اُن کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر! وہ رسول اللہ ﷺ سے غنیمت کا حصہ مانگ رہے تھے جبکہ میدانِ جنگ سے فرار کرنے کے بعد انھیں پکارا گیا تو وہ واپس نہیں آئے تھے۔ دنیا اور اس کے مال ومتاع کی آپ ﷺ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اعرابی چاروں طرف سے رسول اللہ ﷺ پر پل پڑے اور دھکیلتے ہوئے ایک درخت کے پاس لے گئے۔ اس بھیڑ میں آپ کی چادر درخت کی شاخوں میں اُلجھ کر اتر گئی اور آپ کا دھڑ ننگا ہو گیا۔ اتنی کوفت کے باوجود آپ ذرہ برابر غصے میں نہیں آئے۔ آپ نے لوگوں کی طرف دیکھا اور اطمینان سے کہا:

''اے لوگو! میری چادر واپس کر دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میرے پاس تہامہ کے درختوں کی تعداد میں اونٹ ہوں گے تو وہ بھی تم میں تقسیم کر دوں گا اور تم مجھے بخیل، بزدل اور جھوٹا نہیں پاؤ گے۔''[1]

جی ہاں! اگر رسول اللہ ﷺ بخیل ہوتے تو غنیمت کا سارا مال اپنے پاس رکھ لیتے، اگر بزدل ہوتے تو لوگوں کے ساتھ میدان سے بھاگ جاتے، اگر جھوٹے ہوتے تو رب العالمین آپ کی مدد نہ کرتا۔

حدیث و سیرت کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے صبر و تحمل اور بردباری کے کئی واقعات ملتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے ہمراہ محو سفر تھے۔ ایک عورت کے قریب سے آپ کا گزر ہوا جو اپنے بچے کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ نے اس سے کہا:

''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔''

وہ غمزدہ عورت رسول اللہ ﷺ کو نہ پہچان پائی اور بولی:

''اپنی راہ لو۔ تمھیں میری مصیبت کی کیا پروا!''

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے اور عورت کو اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ آپ کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ عورت جس نفسیاتی صورتِ حال سے گزر رہی ہے اس میں اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں۔

ایک صحابی نے عورت سے مخاطب ہو کر بتایا: ''یہ رسول اللہ تھے۔''

وہ عورت اپنے کہے پر نادم ہوئی اور اُٹھ کر نبی ﷺ کے پیچھے چلی۔ آپ کے گھر پہنچی۔ دروازے پر دربان نہیں تھے۔ معذرت کرتے ہوئے بولی:

''یا رسول اللہ! میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولٰى»

''صبر تو صدمے کے آغاز میں ہوتا ہے۔''[1]

نرمی

«إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ»

''اللہ نے ہر شے پر ''اچھا برتاؤ'' فرض کر دیا ہے، اس لیے جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو۔ اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ ہر کوئی اپنی چھری تیز کرے اور ذبیحہ کو راحت پہنچائے۔''[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 2821، وسنن النسائي، حديث: 3718، ومسند أحمد: 184/2.

[2] صحيح البخاري، حديث: 1283، وصحيح مسلم، حديث: 926، وسنن أبي داود، حديث: 3124. [3] صحيح مسلم، حديث: 1955.

مشکلات سے جان چھڑائیں

ہسپتال سے چیک اپ کے بعد اس کی رپورٹ بتا رہی تھی کہ وہ ذہنی دباؤ اور ذیابیطس جیسی دسیوں بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں میں کامل مثالیت (Idealism) تلاش کرنے کا عادی تھا۔یوں اس بے چارے نے اپنے آپ کو المناک عذاب میں ڈال رکھا تھا۔

ہمیشہ بیوی سے تنگ رہتا، بات بات پر ٹوکتا۔

''تم نے نئی پلیٹ توڑ دی۔''

''مہمان خانے کی صفائی نہیں ہوئی۔''

''استری کرتے ہوئے تم نے میرا نیا سوٹ جلا دیا۔''

اولاد سے بھی اس کا یہی رویہ تھا:

''خالد کو ابھی تک پہاڑا یاد نہیں ہوا۔''

سعد نے پہلی پوزیشن کیوں نہیں لی؟''

یہ تھا اس کا گھر والوں سے طرزِ عمل۔

گھر کے باہر دوستوں اور رفقائے کار کے درمیان صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھی۔

''ابو عبداللہ نے بخیل کا واقعہ سنا کر مجھے نشانہ بنایا ہے۔''

''کل رات ابو احمد نے پرانی گاڑیوں کا ذکر چھیڑا تھا تو اس کا اشارہ میری گاڑی کی طرف تھا۔''

''ہاں! وہ مجھے ہی تاڑ رہا تھا۔''

پرانی کہاوت ہے: ''زمانہ تمھارے پیچھے چلتا ہے تو ٹھیک، ورنہ تم زمانے کے پیچھے چلتے چلو۔''

میرا ایک بدّو دوست اکثر ایک پرانی کہاوت سنایا کرتا ہے جو اس نے اپنے دادا سے سُن کر یاد کی ہے۔ جب کبھی اس موضوع پر بات چلے تو وہ آہ بھر کر کہتا ہے:

''جس ہاتھ کو ہٹانے کی قدرت نہیں رکھتے اس سے مصافحہ کر لو۔''

میں نے کہاوت پر غور کیا تو مجھے اس میں سچائی کی جھلک دکھائی دی۔ واقعی ہم اپنے آپ کو درگزر کرنے اور حالات کے رنگ پر ڈھلنے کا عادی نہ بنائیں گے تو جلد ہی شدید تھکاوٹ کا شکار ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ چھوٹی موٹی باتیں نظر انداز کرنے اور وہم و گمان میں نہ پڑنے کی روش اپنائیں، زندگی میں کامرانی آپ کا مقدر بنے گی۔

شباب کی وادی میں قدم رکھنے والے ایک نوجوان نے اپنے شیخ سے التماس کیا کہ وہ رفیقۂ حیات کے انتخاب میں اس کی مدد کریں۔ شیخ نے دریافت کیا:

''تمھارے خیال میں تمھاری بیوی کن صفات کی حامل ہونی چاہیے؟''

نوجوان بولا: ''دلکش چہرہ، سرو قد، ساون کی گھٹاؤں کو شرماتے سیاہ نرم و ملائم اور گھنے بال۔ بدن گلاب۔ کھانا ایسا مزیدار پکائے کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ بولے تو باتوں سے پھولوں کی خوشبو آئے، گویا میٹھے پانی کا چشمہ دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے۔ دیکھو تو آنکھوں کو بھائے۔ گھر سے جاؤں تو اپنی عزت اور میرے مال کی حفاظت کرے۔ میرا کہا

مانے۔ میرا بُرا نہ چاہے۔ دین کے علم نے اس کی شخصیت کو رفعت بخشی ہو۔ عقل ایسی ہو کہ رشک کرنے کو جی چاہے۔''

غرض کہ نوجوان نے عورتوں کی تمام مکمل صفات ایک عورت میں جمع کر دیں۔ شیخ نے کہا:

''بچے! تمھاری مطلوبہ شے میرے پاس ہے؟''

نوجوان نے فوراً پوچھا: ''کہاں؟''

شیخ بولے: ''اللہ کے حکم سے جنت میں، دنیا میں ایسی عورت کا وجود ناممکن ہے۔''

دنیا میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو درگزر نے کا عادی بنانے کی کوشش کریں۔ مشکلات تلاش نہ کریں۔ نبی ﷺ کا طریقۂ زندگی بھی یہی تھا کہ آپ اکثر اوقات درگزر سے کام لیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ آپ صبح کے وقت سخت بھوک کی حالت میں گھر جاتے اور پوچھتے:

''کیا کھانے کو کچھ ہے؟''

گھر والے نفی میں جواب دیتے تو فرماتے:

''تب میں روزے سے ہوں۔''[1]

آپ ﷺ اس بات کی وجہ سے مشکلات کھڑی نہ کرتے، یہ نہ کہتے: ''تم نے کھانا تیار کیوں نہیں کیا؟''

نہیں! صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی: ''تب میں روزے سے ہوں۔''

عام لوگوں سے بھی رسول اللہ ﷺ کے رحمدلانہ برتاؤ کا یہی حال تھا۔

کلثوم بن حصین رضی اللہ عنہ خیارِ صحابہ میں سے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کے ہمراہ غزوۂ تبوک میں شریک تھا۔ ایک رات ہم وادیِ اخضر میں محوِ سفر تھے۔ لوگ دیر تک چلتے رہے۔ مجھے اونگھ آنے لگتی اور میری اونٹنی نبی ﷺ کی اونٹنی کے قریب ہونے لگتی تو میں اچانک جاگ جاتا اور اس ڈر سے کہ کہیں میری اونٹنی کے پالان کی لکڑی رسول اللہ ﷺ

کی ٹانگ پر نہ جا لگے، اونٹنی کو دور ہٹا دیتا۔ راستے میں مجھے پھر اونگھ نے آلیا۔ اتنے میں میری اونٹنی رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی سے جا ٹکرائی۔ پالان کی لکڑی رسول اللہ ﷺ کے پاؤں میں لگی۔ تکلیف کی شدت سے آپ کے منہ سے بے اختیار ''حِس'' کی آواز نکلی۔ اس پر میں بیدار ہو گیا اور پریشانی کے عالم میں کہا: ''یا رسول اللہ! میرے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔''

آپ ﷺ نے پوری کشادہ دلی سے فرمایا:

''چلتے چلو۔''[2]

جی ہاں! صرف اتنا کہا کہ چلتے چلو اور بات ختم کر دی۔ انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ یہ نہیں کہا:

''مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟''

''سارا راستہ پڑا ہے۔''

''میرے ساتھ کیوں چمٹ رہے ہو؟''

نہیں! آپ ﷺ نے اپنی جان جوکھوں میں نہیں ڈالی۔

رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ یہی اسلوب تھا۔ ایک روز اصحابِ کرام کے درمیان بیٹھے تھے۔ ایک خاتون چادر لیے آئیں اور عرض گزار ہوئیں: ''آپ کے لیے یہ چادر میں نے اپنے ہاتھوں سے بُنی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے چادر لے لی۔ آپ کو اس کی واقعی ضرورت تھی۔ گھر گئے اور وہ چادر پہن کر باہر آئے۔

ایک آدمی بولا: ''یا رسول اللہ! یہ چادر مجھے پہنا دیں۔''

آپ ﷺ نے کہا:

''ضرور (پہنو)۔''

فوراً گھر گئے، اسے اتار کر لپیٹا، پرانی چادر پہنی اور نئی چادر اس آدمی کی طرف بھیج دی۔

لوگوں نے اس سے کہا: ''تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے رسول اللہ ﷺ سے وہی چادر مانگی جبکہ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ سوالی کو نہیں لوٹاتے۔''

وہ کہنے لگا: ''واللہ! میں نے یہ چادر صرف اس لیے مانگی ہے کہ جس دن مروں، یہ میرا کفن بنے۔''

وہ آدمی فوت ہوا تو گھر والوں نے اسے اسی چادر میں کفن دیا۔ [3]

ایک دن رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کو عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے۔ دو بچے مسجد میں داخل ہوئے۔ یہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فرزندانِ ارجمند حسن و حسین رضی اللہ عنہما تھے۔ وہ دونوں اپنے نانا کے پاس آئے۔ رسول اللہ ﷺ سجدہ کرتے تو دونوں صاحبزادے کمر پر سوار ہو جاتے۔ آپ سجدے سے سر اٹھاتے تو دونوں کو نرمی سے پکڑ کر اتارتے اور ایک طرف بٹھا دیتے۔ دوبارہ سجدہ کرتے تو دونوں بچے پھر کمر پر بیٹھ جاتے۔ نماز مکمل ہوئی تو آپ نے دونوں کو اٹھایا اور گود میں بٹھا لیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! ان دونوں کو چھوڑ آؤں؟''

آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور بچے کھیلتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان پر بجلی چمکی تو آپ نے دونوں سے کہا:

''چلو، اپنی والدہ کے پاس چلے جاؤ۔'' [4]

بچے اُٹھے اور والدہ کے پاس چلے گئے۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ حسن یا حسین کو اٹھائے ظہر یا عصر کی نماز کے لیے نکلے۔ مصلے پر آئے۔ بچہ نیچے بٹھایا۔ تکبیر کہی۔ خاصی دیر سجدے میں پڑے رہے۔ صحابۂ کرام کو

خدشہ ہوا کہ کوئی بات نہ ہوگئی ہو۔ آپ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ نماز کے بعد صحابۂ کرام نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اتنا لمبا سجدہ آپ نے کبھی نہیں کیا۔ کیا کوئی نیا حکم اترا ہے؟''

آپ نے فرمایا:

''ایسا نہ ہوتا لیکن میرے بیٹے نے مجھے سواری بنا لیا تھا۔ میں نے جلدی کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ خوش ہو لے۔''[5]

ایک دن رسول اللہ ﷺ ام ہانی کے ہاں آئے۔ آپ کو بھوک لگی تھی۔ پوچھا:

''ہمارے کھانے کو کچھ ہے؟''

وہ بولیں: ''روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے ہیں۔ آپ کو پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

فرمایا:

''وہی لے آئیں۔''

ام ہانی رضی اللہ عنہا روٹی کے سوکھے ٹکڑے لائیں۔ اُنھیں پانی میں بھگویا اور اوپر نمک چھڑک کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ کھانے لگے، پھر امّ ہانی رضی اللہ عنہا سے کہا:

''کوئی سالن ہے؟''

انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! تھوڑا سا سرکہ ہے۔''

فرمایا:

''لائیں۔''

وہ لائیں تو آپ نے اسے بھی کھانے پر انڈیل لیا۔ کھانا تناول کرنے کے بعد ''الحمد للہ'' پڑھا اور فرمایا:

''سرکہ اچھا سالن ہے۔''[6]

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ زندگی جیسی بھی تھی، گزارتے تھے۔ معاملات کو اسی طرح لیتے

جس طرح وہ ہوتے تھے۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پاس اُمّ قیس بنت محصن اپنا نومولود بیٹا لائیں تا کہ آپ اسے گھٹی دیں اور اس کے لیے دعا کریں۔ آپ نے بچہ اٹھایا اور گود میں لے لیا۔ بچے نے نبی ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا۔ نبی ﷺ نے صرف اتنا کیا کہ پانی منگا کر پیشاب کے نشانات پر چھڑک دیا۔ اسی پر بات ختم ہوگئی۔ نہ غصہ ہوئے، نہ ماتھے پر بل آئے۔ [7]

پھر ہم لوگوں نے اپنے آپ کو مصیبت میں کیوں ڈال رکھا ہے۔ ہم ہر بات کا بتنگڑ کیوں بنا لیتے ہیں؟

یہ ضروری تو نہیں کہ آپ کا ماحول اور اس میں رہنے والی ہر شے سو فیصد آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہو۔

وَإِنْ تَجِدْ عَيْبًا فَسُدَّ الْخَلَلَا
جَلَّ مَنْ لَا عَيْبَ فِيهِ وَعَلَا

''اگر تم کوئی عیب پاؤ تو یہ خلا پُر کر دو۔ بلند و بالا ہے وہ ذات جس میں کوئی عیب نہیں۔''

بعض لوگ خواہ مخواہ معاملات کو ان کے سائز سے زیادہ اہمیت دے کر اپنے اعصاب جلاتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی وہ خطائیں جو آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، اُنھیں کرید کر نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ دوسروں کے عذر قبول کرنے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کریں۔ بالخصوص جو لوگ آپ کو چاہتے ہیں اور اسی چاہت کی بقا کے لیے آپ سے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں اور کوئی ذاتی مفاد اُن کے سامنے نہیں ہوتا، اُن کی معذرت تو ضرور ہی قبول کریں۔ کم از کم اُن کا دِل نہ توڑیں۔

رسول اللہ ﷺ کو دیکھیے۔ ایک دن آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر اتنی بلند آواز سے

خطبہ دیا کہ عزت مآب خواتین کو اُن کے گھروں میں سنائی دیا۔ آپ نے فرمایا:

''اے لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو اور ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا، مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور نہ ان کے عیب تلاش کیا کرو۔ جو اپنے بھائی کا عیب تلاش کرتا ہے، اللہ اس کا عیب تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کے درپے اللہ ہو جائے تو وہ اسے اس کے گھر میں ذلیل ورسوا کر دیتا ہے۔''[8]

جی ہاں! غلطیوں کا شمار نہ کیجیے۔ لوگوں کے عیب تلاش نہ کریں۔ کشادہ دل بننے کی کوشش کریں۔ رسول اللہ ﷺ مشکلات کھڑی کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔

صحابہ کی ایک ہلکی پھلکی مجلس میں آپ نے فرمایا تھا:

''سُن لیں، آپ میں سے کوئی بھی مجھے میرے اصحاب کی کوئی بات نہ پہنچائے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ کی طرف آیا کروں تو میرا سینہ صاف ہو۔''[9]

اپنے آپ کو عذاب میں مت ڈالیں

''خاک اڑانے کی کوشش نہ کریں۔ وہ بیٹھی ہے تو اسے بیٹھا رہنے دیں، البتہ اگر خاک اُڑنے لگے تو آستین سے ناک ڈھک لیں اور اپنی زندگی کا لُطف اٹھائیں۔''

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1154. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 172/4. [3] صحيح البخاري، حديث: 1277. [4] مسند أحمد: 513/2. [5] سنن النسائي، حديث: 1142، والمستدرك للحاكم: 166/3. [6] المعجم الأوسط للطبراني: 165/5، حديث: 6934، و المستدرك للحاكم: 54/4. [7] صحيح البخاري، حديث: 223. [8] جامع الترمذي، حديث: 2032. [9] سنن أبي داود، حديث: 4860، وجامع الترمذي، حديث: 3896. یہ حدیث ضعیف ہے۔

اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور تکبر سے بچیں

بہت سی مشکلات ایسی ہیں جن کی وجہ سے دو بھائیوں کی عداوت ایک دو سال، کئی برس یا ساری عمر جاری رہتی ہے۔ اس مسئلے کا آسان ترین حل یہ ہے کہ ایک بھائی دوسرے سے کہہ دے: ''غلطی میری تھی۔ میں معذرت کرتا ہوں۔''

نفرت کی چنگاریاں بجھانے میں جلدی کیجیے، قبل اس سے کہ ان چنگاریوں سے آگ بھڑک اُٹھے اور سب کچھ خاکستر کر دے۔

''مجھے افسوس ہے۔''

''قصور میرا تھا۔''

''آپ کا دل صاف ہے۔''

ہم انکسار اور تواضع کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں سے ایسے الفاظ کہنا سیکھ جائیں تو زندگی کتنی آسان اور خوشگوار ہو جائے!

دو جلیل القدر صحابہ ابو ذر اور بلال رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے غصے میں بلال رضی اللہ عنہ کو ابن السوداء (کالی کلوٹی حبشی عورت کا بیٹا) کہہ دیا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے اس کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ آپ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور دریافت کیا:

''کیا آپ نے بلال کو گالی دی ہے؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جی ہاں، دی ہے۔''

فرمایا:

''تو کیا آپ نے اس کی والدہ کا ذکر کیا ہے؟''

کہا: ''یا رسول اللہ! جو شخص لوگوں سے گالم گلوچ کرتا ہے، اس کے والدین کا ذکر کیا ہی جاتا ہے۔''

آپ نے فرمایا:

''آپ میں جاہلیت ہے۔''

ابوذر رضی اللہ عنہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، بولے: ''کیا بڑھاپے کی اس عمر میں بھی؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہاں۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ماتحتوں سے برتاؤ کا طریقہ سمجھاتے ہوئے فرمایا:

''جنھیں اللہ نے تمھارے ماتحت کیا ہے وہ تمھارے بھائی ہی ہیں۔ جس کسی کا بھائی اس کا ماتحت ہو وہ اسے اپنا کھانا کھلائے اور اپنا لباس پہنائے، اس کے بس سے باہر کام نہ کہے، اگر کوئی چارہ نہ ہو تو ایسے کام میں اس کی مدد کرے۔''[1]

یہ سُن کر ابوذر رضی اللہ عنہ جا کر بلال رضی اللہ عنہ سے ملے، معذرت کی اور بلال رضی اللہ عنہ کے سامنے زمین پر بیٹھ کر اپنا گال ننگے فرش پر رکھا اور کہا: ''بلال! اپنا پاؤں میرے گال پر رکھ دو۔''

صحابۂ کرام کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے باعث، یہی مزاج تھا۔ وہ نفرت کی آگ بھڑکنے سے پہلے ہی اسے بجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر بالفرض آگ بھڑک اٹھتی تو اسے مزید پھیلنے سے روکتے۔

ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان ذرا تلخ کلامی ہوگئی۔ عمر ناراض ہو کر چل دیے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ندامت ہوئی اور اس خدشے کے پیشِ نظر کہ معاملہ بڑھ جائے گا، عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے گئے اور کہتے رہے: ''عمر! مجھے معاف کر دو۔''

عمر نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ابوبکر معذرت کرتے بے چارے پیچھے پیچھے جاتے رہے۔ عمر گھر پہنچے اور اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ابوبکر رسول اللہ ﷺ کی طرف گئے۔ آپ نے انھیں دور سے آتے دیکھا، چہرے کا رنگ بدلا ہوا پایا تو فرمایا:

''لو، آپ کا یہ صاحب تو کسی مشکل میں گرفتار ہے۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ قریب آئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے رویے پر ندامت کا احساس ہوا۔ اُن لوگوں کے دِل روشن تھے۔

عمر بھی گھر سے نکلے اور کشاں کشاں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں چلے آئے۔ سلام کیا اور آپ کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ ساری بات بتائی کہ کیسے انھوں نے ابوبکر سے بے رخی برتی اور اُن کی معذرت قبول نہ کی۔ رسول اللہ ﷺ کو غصہ آ گیا۔ ابوبکر نے آپ کے چہرے پر ناراضی کے آثار دیکھے تو کہنے لگے:

''یا رسول اللہ! واللہ! میرا ہی قصور تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔''

یوں وہ عمر کا دفاع کرنے لگے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا آپ میری خاطر میرے صاحب کا پیچھا چھوڑتے ہیں؟ کیا آپ میری خاطر میرے صاحب کا پیچھا چھوڑتے ہیں؟ میں نے کہا تھا: ''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' آپ لوگوں نے جواباً کہا تھا: ''تم جھوٹ کہتے ہو۔'' اور ابوبکر نے کہا تھا: ''آپ سچ کہتے ہیں۔''[2]

غلطی کا اعتراف کرنے سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا۔ انکسار اور تواضع کا تقاضا بھی یہی

ہے کہ انسان ہٹ دھرمی کے بجائے غلطی کا اعتراف کرنا سیکھے۔ حدیث میں آیا ہے: ''جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔''[3]

ایک نظر اِدھر بھی

''اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بڑا پن ہے۔''

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي: 7/8، وصحيح مسلم، حديث: 1661. [2] صحيح البخاري، حديث: 3661. [3] صحيح مسلم، حديث: 2588.

سفید کپڑے پر ہلکا سا داغ بھی نظر آتا ہے

لوگوں کی اصلاح کرنے سے پہلے اپنی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ تو اپنی اصلاح پر توجہ دیں اور آپ وہیں کے وہیں رہیں۔ بالخصوص جب آپ کسی ایسے منصب پر فائز ہوں جہاں آپ کا کام ہدایت کاری اور توجیہ و اصلاح پر مبنی ہو تو یہ جان لیں کہ لوگوں کی نظریں آپ کی نگرانی کرتی ہیں۔ آپ کی ایک ایک حرکت نوٹ کی جاتی ہے، اس لیے حتی الامکان قاعدے قانون کی پاسداری کا خیال رکھیں۔

امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار لوگوں میں کپڑے تقسیم کیے۔ ہر ایک کے حصے میں ایک ایک کپڑا آیا۔ جمعہ کے دن امیر المومنین خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور یہ کہہ کر خطبے کا آغاز کیا: ''اللہ نے آپ پر میری سمع و طاعت فرض کر دی ہے۔''

یکا یک ایک آدمی کھڑا ہوا اور بولا: ''آپ کے لیے کوئی سمع و طاعت نہیں؟''

عمر رضی اللہ عنہ نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں؟''

اس نے کہا: ''اس لیے کہ آپ نے ہم میں ایک ایک کپڑا تقسیم کیا ہے اور خود دو نئے کپڑے پہن رکھے ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو نمازیوں پر نگاہ دوڑائی۔ آپ کو اپنا فرزند عبداللہ بن عمر نظر آیا۔ آپ نے انھیں دیکھتے ہی کہا: ''عبداللہ بن عمر! اٹھو۔''

عبداللہ کھڑے ہوئے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ”تم نے اپنی پوشاک مجھے نہیں دی تھی کہ اُسے پہن کر خطبہ دوں؟“

عبداللہ بولے: ”جی ہاں، دی تھی۔“

وہ آدمی بیٹھ گیا اور بولا: ”اب ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔“

یوں بات ختم ہوگئی۔

جی ہاں! اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی نصیحت قبول کریں تو سب سے پہلے آپ اُن کی نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

وہ اکثر اپنی بیوی سے کہتا رہتا تھا: ”بچوں کا زیادہ خیال رکھا کرو۔ اچھا کھانا پکایا کرو۔ میں کب تک کہتا رہوں گا کہ سونے کے کمرے ترتیب دے دیا کرو۔“

بیوی ہمیشہ وسیع الظرفی سے جواب دیتی۔ ”ان شاء اللہ، کر دوں گی، آپ پریشان نہ ہوا کریں۔“

ایک دن بیوی نے اس سے کہا: ”بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں۔ آپ انھیں تھوڑا وقت دیا کریں اور جلدی گھر آجایا کریں۔“

وہ چیخ کر بولا: ”میں اُن کے لیے بے کار نہیں بیٹھا۔ دیر سے آؤں یا جلدی، تمھیں اس سے کیا؟ تم میرے معاملات میں دخل کیوں دیتی ہو؟“

آپ بتائیے کیا اس کے بعد بھی بیوی اس کی نصیحت پر کان دھرے گی؟

آخر میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ عقل منداور ہوشیار آدمی گھر کی دیوار میں رخنے نہیں چھوڑتا کہ لوگوں کی نظر گھر کے اندر پڑے۔ دوسرے لفظوں میں وہ لوگوں کو موقع نہیں دیتا کہ وہ اس کی ذات کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہوں۔

ایک دعوتی تنظیم نے البانیہ میں چند دعوتی خطابات کے لیے داعیوں کی ایک جماعت

مدعو کی۔ البانیہ میں دعوتی مراکز کے مدیر بھی مجلس میں حاضر تھے۔ اُن کے گالوں پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، اس لیے کہ دستور کے مطابق داعی حضرات رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے داڑھی، خواہ تھوڑی بہت ہی، ضرور رکھتے ہیں۔ داعیوں کے سربراہ کی یہ حالت دیکھ کر ہمیں تشویش لاحق ہونا لازمی امر تھا۔ میٹنگ کا آغاز ہوا تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا: ''بھائیو! میں امرد ہوں۔ میرے چہرے پر داڑھی نہیں اُگی، اس لیے میٹنگ کے اختتام پر آپ مجھے لیکچر مت جھاڑ دیجیے گا۔''

ہم بھی اُن کی اس وضاحت پر خوش دلی سے مسکرا دیے اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

اب میری ہمراہی میں مدینہ منورہ چلیے اور دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کی راتوں میں مسجد میں اعتکاف کر رہے ہیں۔ آپ کی زوجۂ محترمہ صفیہ بنت حُیی رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے آتی ہیں اور چند گھڑیاں ٹھہرتی ہیں۔ واپس جانے کے لیے اٹھتی ہیں تو نبی ﷺ بھی اُنھیں گھر تک چھوڑنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں کے قریب سے دو انصاری آدمیوں کا گزر ہوتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاتون کے ہمراہ ہیں تو تیزی سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:

''ٹھہریے، یہ صفیہ بنت حیی ہے۔''

انصاری کہتے ہیں: ''سبحان اللہ! یارسول اللہ!''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''شیطان انسان میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ مجھے خدشہ ہوا کہیں وہ آپ کے دلوں میں شر نہ ڈال دے۔''[1]

قیمتی بات

”اپنا دل دوسروں کے متعلق اور دوسروں کا دل اپنے بارے میں صاف رکھنے کی کوشش کریں۔“

[1] صحيح البخاري، حديث:2035، و صحيح مسلم، حديث:2175 .

غلطی کے ازالے کا مناسب طریقِ کار

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کرام کے ہمراہ بنو مصطلق پر حملہ آور ہوئے۔ واپسی پر آرام کے لیے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ مہاجرین نے اپنے غلام جہجاہ بن مسعود کو کنویں سے پانی لانے بھیجا۔ انصار نے بھی اپنے غلام سنان بن وبر جہنی کو اسی کنویں سے پانی لانے بھیجا۔ کنویں پر دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔ جہنی نے انصار کو مدد کے لیے پکارا: ''اے معشر انصار!'' جہجاہ نے بھی آواز لگائی: ''اے معشرِ مہاجرین!''

اس پر مہاجرین و انصار مشتعل ہو گئے۔ اختلاف نے شدت اختیار کر لی۔ لوگ جنگ سے واپس آرہے تھے اور کیل کانٹے سے لیس تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فوری مداخلت سے دونوں گروہوں کو ٹھنڈا کیا۔ آستین کے سانپ حرکت میں آگئے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے جس کے ساتھ انصار کی ایک ٹولی بھی تھی، غصے میں آکر کہا: ''کیا انھوں نے ایسا کیا ہے؟! یہ ہم میں نفرت پھیلانا اور ہمارے ہی علاقے میں ہم پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ واللہ! ہمارا اور ان قریش کے چوغوں [1] کا حال وہی ہے جیسا اگلوں نے کہا تھا: ''اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کرو کہ وہ تمھی کو کھانے دوڑے۔ اور اپنے کتے کو بھوکا پیاسا رکھو کہ وہ تمھارے پیچھے چلے۔''

اس خبیث نے کہا: ''واللہ! سن لو! اگر ہم مدینہ واپس گئے تو معزز آدمی، ذلیل کو شہر

سے نکال باہر کرے گا۔"

پھر اپنی قوم کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "یہ ہے تمھارے کرتوت کا نتیجہ۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے علاقے میں ٹھہرایا اور اپنے اموال دیے۔ واللہ! تم انھیں اپنا مال نہ دو تو یہ کسی اور علاقے کی راہ لیں۔"

یوں وہ خبیث دھمکیاں دیتا اور غراتا رہا۔ اس کے حامی منافقین ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ انھی لوگوں میں ایک بچہ زید بن ارقم بیٹھا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور ساری بات رسول اللہ ﷺ کو جا سنائی۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ انھیں طیش آ گیا کہ اس منافق کی جرأت کیسے ہوئی کہ نبی ﷺ کے متعلق بات کرتے ہوئے یہ بھونڈا انداز اختیار کرے۔ ان کا خیال تھا کہ سانپ کی دُم کاٹنے سے بہتر ہے کہ خود سانپ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُن کی رائے میں ابن سلول کے قتل سے اس فتنے کی جڑ اکھڑ جاتی۔ لیکن یہ بھی مناسب تھا کہ ابن سلول کو مہاجرین کے بجائے انصار کا کوئی آدمی قتل کرے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "یا رسول اللہ! عباد بن بشر انصاری کو حکم دیں، وہ اسے قتل کر آئیں۔"

رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ابنِ سلول کا قتل تقاضائے حکمت کے خلاف تھا۔

آپ نے فرمایا:

"عمر! تب کیا ہو گا جب لوگ باتیں کریں گے کہ محمد اپنے ساتھی قتل کر دیتا ہے۔"

"نہیں، عمر! بلکہ لوگوں کو کوچ کرنے کے لیے کہیں۔"

لوگوں نے فوراً کوچ کیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کو پتا چلا کہ زید بن ارقم نے اس کی باتیں رسول اللہ ﷺ کو بتا دی ہیں تو وہ آپ کے پاس آیا اور قسمیں کھائیں کہ میں نے یہ باتیں نہیں کیں۔ لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔

عبداللہ بن اُبی کا شمار قوم کے رؤسا اور بڑے آدمیوں میں ہوتا تھا۔

انصار بھی کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! ہوسکتا ہے لڑکے کو غلط فہمی ہوگئی ہو اور اُسے عبداللہ بن ابی کی باتیں یاد نہ رہی ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ چلتے رہے اور کسی بات پر توجہ نہ دی۔ اس پر انصار کے ایک سردار اسید بن حضیر آپ کی طرف آئے، سلام کہا اور بولے: ''یا رسول اللہ! واللہ! آپ نے نامانوس وقت میں کوچ کیا ہے۔ آپ پہلے کبھی اس طرح کوچ نہیں کیا کرتے۔'' رسول اللہ ﷺ نے اسید کی طرف دیکھ کر فرمایا:

''آپ کے صاحب نے جو کچھ کہا، آپ کو معلوم نہیں؟'' انھوں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کون سا صاحب؟''

''عبداللہ بن ابی۔''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔

''اس نے کیا کہا؟'' اُسید نے حیرت سے استفسار کیا۔

''اس کا خیال ہے کہ وہ مدینہ لوٹے گا تو معزز آدمی ذلیل کو شہر سے نکال باہر کرے گا۔''[2]

اس پر اُسید کو سخت غصہ آیا۔ انھوں نے کہا:

''واللہ! یا رسول اللہ! آپ ہی اگر چاہیں تو اسے نکال باہر کریں گے، واللہ وہی ذلیل ہے اور آپ ہی عزیز (عزت دار) ہیں۔''

اسید نے رسول اللہ ﷺ کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے کہا: ''یا رسول اللہ! اس سے نرمی برتیں۔ اللہ جب آپ کو ہمارے پاس لایا تو لوگ اس کی تاج پوشی کے لیے ہیرے جواہرات پرو رہے تھے۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس کی بادشاہت چھین لی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ خاموشی سے چلتے رہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ اس

وقت ہم نے کوچ کیوں کیا ہے۔

ابن سلول نے کیا کہا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس سے کیا سلوک کیا۔

ابن سلول نے سچ کہا، نہیں بلکہ غلط کہا، وغیرہ وغیرہ۔

تمام لشکر میں ایک طرح کی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو خدشہ ہوا کہ یوں صورتِ حال مزید گمبھیر ہو جائے گی۔ آپ اس غرض سے کہ لوگوں کا ذہن اس مسئلے سے ہٹ جائے، سارا دن چلتے رہے۔ غروب آفتاب کے بعد لوگوں نے سوچا کہ اب ہم نماز کے لیے اتریں گے اور آرام کریں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے چند گھڑیاں پڑاؤ کیا۔ لوگ نماز پڑھ چکے تو آپ نے کوچ کا حکم دے دیا۔ رات گئے فجر تک سفر جاری رہا۔ رسول اللہ ﷺ اترے، فجر کی نماز پڑھائی اور سوار ہو کر چل دیے۔ لوگوں کو بھی چلنے کا حکم دیا۔ لوگ دوپہر تک چلتے رہے اور تھکاوٹ سے چور ہو گئے۔ سورج کی تمازت نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ لوگوں پر تکان کا غلبہ ہے اور اُس معاملے پر تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تو آپ نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ زمین پر پڑتے ہی لوگ گہری نیند کے مزے لوٹنے لگے۔ آپ نے ایسا صرف اس لیے کیا کہ لوگوں کی توجہ اس واقعے سے ہٹ جائے۔ خوب آرام کر چکے تو لوگوں کو بیدار کیا اور کوچ کرنے کو کہا۔ چلتے چلتے بالآخر مدینہ میں داخل ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقین نازل کی اور اس میں منافقین کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو یہ عظیم سورت پڑھ کر سنائی۔ زید بن ارقم کو آپ نے از راہِ شفقت کان سے پکڑا اور فرمایا:

''یہ ہے وہ انسان جس کے کانوں کی سنی بات اللہ نے سچ قرار دی۔''

اب لوگ ابن سلول کو گالیاں دینے اور لعنت ملامت کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''عمر! کیا خیال ہے، اگر میں نے اسے اسی دن قتل کر دیا ہوتا جس دن یہ بات ہوئی تھی تو کئی ناکیں سُرخ ہو جاتیں جنھیں میں آج اسے قتل کرنے کا حکم دوں تو وہ قتل کیے بنا نہ چھوڑیں۔''

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار کر لی اور ابن سلول سے کوئی باز پُرس نہیں کی۔

بعض دفعہ غلطی کرنے والے کو برسرِ عام ٹوک دینا مناسب ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ یہ قحط سالی کے دن تھے۔ بارش نہیں ہوئی تھی اور فصل کی پیداوار کم تھی۔ ایک بدّو آیا اور بولا: ''یا رسول اللہ! جانیں مشکل میں پڑ گئیں۔ گھر بار ختم ہو گیا۔ ڈھور ڈنگر کمزور پڑ گئے۔ اللہ سے پانی مانگیں۔ ہم آپ کے ذریعے اللہ سے اور اللہ کے ذریعے آپ سے سفارش کرتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے بدّو کی یہ بات کہ ہم اللہ کے ذریعے آپ سے سفارش کرتے ہیں، سنی تو آپ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سفارش اور وسیلہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف تلاش کیا جاتا ہے، چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ مخلوق سے سفارش کرتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو حکم دیتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ و ارفع ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''تمھارا ناس ہو۔ جانتے بھی ہو کیا کہہ رہے ہو؟''

پھر آپ سبحان اللہ، سبحان اللہ کہنے لگے۔ اتنی بار کہا کہ صحابۂ کرام کے چہرے متفکر ہو گئے۔

آپ نے بدو سے فرمایا:

''تمھارا بُرا ہو۔ اللہ کے ذریعے اس کی کسی مخلوق سے سفارش نہیں کی جاتی۔ اللہ کی شان اس سے کہیں بلند ہے۔ جانتے ہو اللہ کون ہے؟ اس کا عرش آسمانوں پر یوں ہے۔''

یہ کہہ کر آپ نے انگلیوں کا گنبد سا بنایا۔

''اور وہ اللہ کے ساتھ یوں چر چراتا ہے جیسے سوار کے ساتھ پالان چر چراتا ہے۔''[4]

لیکن جب کسی شخص سے اکیلے میں غلطی ہو تو اس سے کیا رویہ رکھا جائے گا؟

رسول اللہ ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری پر شب بسری کے لیے اُن کے گھر آئے۔ بدن پر لپٹی چادر رکھی، جوتا اتار کر پاؤں کے قریب رکھا اور تہمد کی ایک طرف بستر پر پھیلا کر لیٹ گئے۔ جب یقین ہو گیا کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) سو چکی ہیں تو دھیرے سے چادر اُٹھائی، آہستہ سے جوتا پہنا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے، پھر آہستگی سے دروازہ ٹیک دیا۔

عائشہ کہتی ہیں: ''میں نے اپنے کپڑے درست کیے اور آپ ﷺ کے پیچھے چل پڑی۔ آپ بقیع میں آئے اور دیر تک کھڑے رہے، پھر وقفے وقفے سے تین بار ہاتھ اٹھا کر اہلِ بقیع کے لیے مغفرت کی دعا کی اور پلٹ گئے۔ میں بھی پلٹ گئی۔ آپ تیز قدموں سے چلے۔ میں بھی تیز قدموں سے چلی۔ آپ دوڑنے لگے۔ میں بھی دوڑنے لگی۔ آپ سرپٹ بھاگنے لگے۔ میں بھی سرپٹ بھاگی اور آپ سے پہلے گھر میں آ گئی اور آتے ہی لیٹ گئی۔ آپ ﷺ اندر آئے اور دریافت کیا:

''عائشہ! کیا ہوا؟ تمھاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے؟''

میں نے کہا: ''کچھ نہیں۔'' آپ ﷺ نے کہا:

''تم مجھے بتاؤ گی یا پھر نہایت باریک بین خبر رکھنے والا بتا دے گا۔''

میں نے کہا: ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان!'' پھر ساری بات بتائی کہ مجھے غیرت آگئی تھی کہ کہیں آپ کسی اور بی بی کے ہاں نہ چلے جائیں۔

آپ نے پوچھا:

''تمھی وہ ہیولا ہو جو میں نے اپنے آگے آگے دیکھا؟''

میں نے جواب دیا: ''ہاں۔''

اس پر آپ نے میرے سینے پر ضرب لگائی جس سے مجھے درد ہوا اور فرمایا:

''کیا تم نے سمجھا تھا کہ اللہ اور اس کا رسول تمھارا حق ماریں گے؟''

میں نے کہا: ''لوگ جتنا بھی چھپالیں اللہ جان لیتا ہے۔''

''جی ہاں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم نے دیکھا تب جبریل میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے تم سے چھپا کر مجھے آواز دی۔ میں نے بھی تم سے چھپا کر اُنھیں جواب دیا۔ جب تم کپڑے اتار دیتی ہو تو وہ تمھارے گھر نہیں آتے۔ میں نے سوچا تم سو گئی ہو۔ میں نے تمھیں بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے خدشہ ہوا تھا کہ تمھیں وحشت ہو گی۔ جبریل نے کہا تھا کہ آپ کا رب حکم دیتا ہے کہ آپ اہلِ بقیع کے پاس جائیں اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔''[1]

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ رحمدل اور نرم خُو تھے۔ آپ بات کا بتنگڑ نہیں بناتے تھے۔ بلکہ مسلم کی روایت کے مطابق آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا، رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ»

''کوئی مومن (شوہر) کسی مومنہ (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔ اگر اسے بیوی کی

ایک بات ناپسند ہوگی تو دوسری ضرور پسند آئے گی۔''[6]

روشنی کی کرن

''اس آدمی کا کوئی قصور نہیں جو نصیحت قبول نہیں کرتا۔ غلطی اسی کی ہے جو غیر مناسب طریقے سے نصیحت کرتا ہے۔''

[1] مہاجرین غربت کی وجہ سے موٹے اور کھردرے کپڑے کے تہبند استعمال کیا کرتے تھے۔ عرب میں اس کپڑے سے چوغے بنائے جاتے تھے، اِس لیے منافقین نے مہاجرین کو ''چوغہ'' کہنا شروع کر دیا۔
[2] تفسير الطبري: سورة المنافقون، آیت: 8. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 305/2. [4] سنن أبي داود، حدیث: 4726. یہ حدیث ضعیف ہے۔ [5] سنن النسائي، حدیث: 2039. [6] صحيح مسلم، حدیث: 1467.

لکڑیاں آسانی سے توڑنے کے لیے گٹھا کھول دیں

غلطی کا ارتکاب کرنے والے ایک سے زائد ہوں تو انھیں غلطی کے نقصانات سے آگاہ کرنے اور سمجھانے بجھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک کو علیحدگی میں سمجھایا جائے۔

رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کی تو قریش کے قبائل اکٹھے ہوئے اور طے کیا کہ نبی ﷺ اور بنو ہاشم سے تعلق رکھنے والے اُن کے تمام عزیز واقارب سے بائیکاٹ کر لیا جائے۔ انھوں نے تحریر لکھی کہ بنو ہاشم سے خرید و فروخت اور شادی بیاہ کے معاملات نہیں کیے جائیں گے۔ نبی ﷺ، صحابۂ کرام اور بنو ہاشم کو بے آب و گیاہ وادی میں محبوس کر دیا گیا۔ صحابۂ کرام کی حالت یہ ہوگئی کہ انھیں بھوک کی شدت سے درختوں کے پتے کھانے پڑتے۔ ایک صاحب پیشاب کرنے لگے تو انھیں اپنے نیچے کوئی چیز محسوس ہوئی۔ اُٹھا کر دیکھا تو وہ اونٹ کی کھال کا ٹکڑا تھا۔ انھوں نے اسے دھویا، آگ میں پکا کر چورا چورا کیا، پانی میں ملایا اور تین دن پیٹ کی آگ بجھاتے رہے۔ اس کس مپرسی کی حالت میں کافی عرصہ بیت گیا۔ ایک دن رسول اکرم ﷺ نے چچا ابو طالب کو بتایا کہ اللہ نے بائیکاٹ کی تحریر پر دیمک مسلط کر دی ہے جس نے اللہ کے نام کے سوا ساری تحریر ہڑپ کر لی ہے۔

ابو طالب نے حیرت سے پوچھا: ''کیا تمھیں اس کی خبر تمھارے رب نے دی ہے؟''

فرمایا: ''ہاں۔''

ابو طالب کہنے لگے: ''واللہ! میں ابھی جا کر قریش کو یہ بات بتاتا ہوں۔''

وہ قریش کے پاس گئے اور بولے: ''اے جماعتِ قریش! میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے کہ بائیکاٹ کی تحریر دیمک چاٹ گئی ہے۔ تحریر لاؤ۔ یہ بات سچ نکلی تو تم لوگوں کو ہمارا بائیکاٹ ختم کرنا ہوگا۔ اور اگر جھوٹ ہوا تو میں بھتیجے کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔ تم اس سے جو چاہے سلوک کرنا۔''

قوم نے کہا ''ٹھیک ہے، ہم راضی ہیں۔'' یہ بات طے ہوگئی۔ انھوں نے تحریر نکال کر دیکھی تو اس کی ہو بہو وہی حالت تھی جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کی۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ بائیکاٹ ختم کرتے، ان کی سرکشی میں اضافہ ہوگیا۔ بنو ہاشم وادی ہی میں پناہ گزیں رہے اور بھوکوں مرنے لگے۔ مشرکینِ مکہ میں ہشام بن عمرو جیسے چند رحم دل اور خدا ترس لوگ بھی تھے۔ قوم میں ہشام بن عمرو کا ایک خاص مقام تھا۔ وہ رات کے وقت غلے سے لدا اونٹ لاتا اور شعب بنی مطلب کے دہانے پر آ کر اس کی لگام چھوڑ دیتا۔ اونٹ وادی میں داخل ہو جاتا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ ہشام نے سوچا کہ وہ اتنی بڑی تعداد کو آخر کب تک کھلائے گا۔ بائیکاٹ کا ظالمانہ معاہدہ ختم کرنے کی سبیل کرنی چاہیے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہوتا جبکہ قریش نے بالاتفاق معاہدے کی تحریر پر دستخط کیے ہیں۔ اس نے گٹھا کھول کر ہر لکڑی علیحدہ علیحدہ توڑنے کا طریقہ اپنایا۔ سب سے پہلے وہ زُہیر بن ابی امیہ کے ہاں گیا۔ عاتکہ بنت عبدالمطلب زہیر بن ابی امیہ کی والدہ تھیں۔ ہشام نے کہا: ''زُہیر! تمھیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تم کھاؤ پیو، پہنو، عورتوں سے جماع کرو اور تمھارے ننھیال کے لوگ وہاں بھوکے پیاسے پڑے رہیں۔ اُن سے خرید و فروخت اور شادی بیاہ کے

معاملات بھی نہ کیے جائیں۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کے ننھیالی ہوتے تو وہ کبھی انھیں اس حال میں نہ چھوڑتا۔"

زُہیر نے کہا: "ہشام! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ میں اکیلا آدمی ہوں۔ واللہ! میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں یہ معاہدہ ختم کرا دیتا۔"

ہشام نے کہا: "ایک آدمی تو مل گیا۔"

"کون؟"

"مَیں۔" ہشام نے جواب دیا۔

زہیر نے کہا: "اچھا، اب تیسرا تلاش کرو۔"

ہشام نے کہا: "ٹھیک ہے مگر خیال رکھنا یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان رہے۔"

اب ہشام بن عمرو مطعم بن عدی کی طرف گیا۔ مطعم بن عدی دانا اور راست فکر انسان تھا۔

ہشام نے اُس سے کہا: "مطعم! کیا تم چاہتے ہو کہ بنوعبدمناف کے دو قبائل فنا ہو جائیں اور وہ بھی تمھارے سامنے، جانتے بوجھتے؟"

مطعم کہنے لگا: "اکیلا آدمی ہوں، کیا کر سکتا ہوں؟"

ہشام: "ایک آدمی تو مل گیا۔"

مطعم: "کون؟"

ہشام: "مَیں۔"

مطعم: خوب! تیسرا تلاش کرو۔"

ہشام: "یہ کام بھی ہو چکا۔"

مطعم: "کون ہے وہ؟"

ہشام: "زُہیر بن ابی امیہ۔"

مطعم: ''واہ! چلو چوتھا ساتھی تلاش کرتے ہیں۔''

ہشام بن عمرو اِدھر سے اُٹھا اور ابوالبختری بن ہشام کے پاس چلا گیا۔ ہشام نے اُسے بھی معاہدے کے خاتمے پر راضی کرلیا، ابوالبختری نے پُرجوش انداز میں پوچھا: ''کوئی ساتھ بھی ملا؟

ہشام نے کہا: ''ہاں، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی اور مَیں، ہم تینوں تمھارے ساتھ ہیں۔''

ابوالبختری کہنے لگا: ''ٹھیک ہے۔ اب پانچواں ساتھی ڈھونڈو۔''

ہشام بن عمرو، زمعہ بن اسود کی طرف گیا، اُس سے بات چیت کی اور بنوعبدمناف کی قرابت داری اور اُن کا حق یاد دلایا۔

زمعہ بن اسود نے دریافت کیا: ''جس بات کی تم دعوت دے رہے ہو اُس پر کوئی اور بھی راضی ہے؟''

ہشام نے کہا: ''ہاں، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، ابوالبختری اور مَیں، ہم سب راضی ہیں۔''

یہ سب سردار اِس امر پر متفق ہو گئے اور اوّلین اجلاس کے لیے بالائی مکہ میں حطم الجحون کا مقام اور رات کا وقت منتخب ہوا۔ حطم الجحون میں جمع ہو کر پانچوں نے طے کیا کہ جب تک بائیکاٹ کی ظالمانہ تحریر کالعدم قرار نہیں دی جاتی، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

زہیر نے کہا: ''بات کا آغاز میں کروں گا، پھر تم سب میری حمایت میں بولنا۔''

صبح ہوئی۔ کعبہ کے گرد معمول کی مجلسیں جمیں جہاں لوگ خرید و فروخت کرتے اور لین دین کے دیگر معاملات طے کرتے تھے۔ زُہیر بن ابی امیہ خوشنما لباس زیب تن کیے

نکلا۔ کعبہ کا طواف کیا۔ لوگوں کی طرف آیا اور بلند آواز سے کہا:

''اے اہلِ مکہ! کیا ہم کھائیں پییں، نت نئے کپڑے پہنیں اور بنو ہاشم گھاٹی میں پڑے سڑتے رہیں؟ اُن سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے؟ واللہ! میں اُس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک بائیکاٹ کی یہ ظالمانہ تحریر چاک نہیں کر دی جاتی۔''

ابوجہل جو اپنے ساتھیوں کی مجلس میں بیٹھا تھا، چیخا:

''تم نے غلط کہا ہے۔ واللہ! تحریر کو چاک نہیں کیا جائے گا۔''

اِس پر یکا یک زمعہ بن اسود اُٹھا اور چلایا:

''بلکہ اللہ کی قسم! تم غلط کہتے ہو۔ جب یہ تحریر لکھی گئی تھی، ہم اس پر مطمئن نہیں تھے۔''

ابوجہل اس بات کا جواب دینے کے لیے زمعہ بن اسود کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ ابوالبختری اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

''زمعہ نے درست کہا ہے۔ تحریر میں جو کچھ مرقوم ہے ہم اُس پر مطمئن نہیں ہیں اور نہ اسے برقرار رہنے دیں گے۔''

ابوجہل، ابوالبختری کی طرف ہوا تو مطعم بن عدی کھڑا ہو گیا اور بلند آہنگ سے بولا:

''زمعہ اور ابوالبختری، تم دونوں سچ کہتے ہو اور اِس کے برعکس جو بات ہوگی، غلط ہوگی۔ ہم اللہ کے حضور اِس تحریر سے بریُ الذمہ ہوتے ہیں۔''

ہشام بن عمرو نے بھی اُٹھ کر یہی بات کہی۔ ابوجہل ہکا بکا خاموش کھڑا رہا، پھر بولا:

''یہ باتیں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہی گئی ہیں۔ اِن پر رات کی تاریکی میں کہیں مشاورت کی گئی ہے۔''

اِس کے بعد مطعم بن عدی کعبہ میں گیا اور تحریر کی طرف بڑھا کہ اُسے چاک کر

دے۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ اللہ کا نام چھوڑ کر باقی ساری تحریر دیمک نے صاف کر دی ہے۔[1]

غرض

''لکڑیاں آسانی سے توڑنے کے لیے گٹھا کھول دیں۔''

---

[1] البداية والنهاية:3/94.

تعذیبِ نفس

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم پکنک منانے گئے۔ ہمارا دوست ابو خالد جس کی نظر بے حد کمزور ہے، ہمراہ تھا۔ ہم اُس کی خدمت کرتے، کھانا پیش کرتے، پانی لا کر دیتے، قہوہ بنا کر پلاتے اور وہ کہتا رہتا: ''میں آپ لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی کوئی کام بتایئے۔''

ہم اُسے روک دیتے۔ ہم ایک بکری بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اُسے ذبح کر کے اور گوشت بنا کر ہانڈی میں رکھا۔ ابھی آگ نہیں جلائی تھی۔ ہم اُسے وہیں چھوڑ کر خیمہ نصب کرنے اور سامان ترتیب سے رکھنے لگے۔ ابو خالد کی خودی حرکت میں آئی جو حرکت میں نہ ہی آتی تو اچھا تھا۔ وہ اُٹھ کر ہانڈی کی طرف آیا اور دیکھا کہ اُس میں گوشت پڑا ہے۔ اُس نے سوچا کہ سب سے پہلا قدم تو یہی ہونا چاہیے کہ گوشت میں پانی ڈالا جائے۔ وہ گاڑی میں پڑے سامان کی طرف بڑھا۔ گاڑی کی ڈگی میں پانی اور پٹرول کی بوتلیں رکھی تھیں۔ قریب ترین پٹرول کی بوتل اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ خوشی خوشی ہانڈی کے پاس آیا اور آدھی بوتل اُس میں انڈیل دی۔ اتنے میں ایک ساتھی کی نظر پڑ گئی تو وہ چلایا: ''نہیں ابو خالد، نہیں، نہیں، رک جاؤ۔'' اُدھر ابو خالد نے یہ کہتے ہوئے بقیہ آدھی بوتل بھی ہانڈی میں انڈیل دی کہ میں آپ لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ ہم نے فوری طور پر بوتل

اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ جب معلوم ہوا کہ یہ پٹرول کی بوتل تھی تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے روٹی اور چائے سے کھایا۔ پکنک خراب نہیں ہوئی بلکہ بڑا اچھا وقت گزرا اور خوب مزے کیے۔

آخر ہم اُس بات پر کیوں کڑھتے ہیں جو ہو چکی اور جس کے ہوئے بنا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مَیں اُن دنوں سکینڈری اسکول کا طالب علم تھا۔ چند ہم جماعت سفر پر نکلے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں ایک گاڑی کی بیٹری خراب ہوگئی۔ ہم دوسری گاڑی لائے، اُسے خراب گاڑی کے سامنے کھڑا کیا۔ طارق آگے بڑھا اور دونوں گاڑیوں کے درمیان کھڑے ہوکر تاروں سے اُن کی بیٹریاں ملائیں، پھر ایک نوجوان سے کہا کہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ وہ نوجوان گاڑی میں سوار ہوا۔ گاڑی جونہی اسٹارٹ ہوئی، ایک جھٹکے سے اُچھلی اور طارق کی ٹانگوں سے جاٹکرائی۔ طارق زخمی ہوکر زمین پر آ رہا۔ ہم نے گاڑی پرے کی۔ طارق کو اُٹھایا۔ اُس کے گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ مجھے اُس کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اُس نے چیخ پکار کر کے آسمان سر پر نہیں اُٹھایا اور یوں تکلیف کی شدت میں اضافہ نہیں کیا۔ وہ مسکراتا رہا اور ماتھے پر بل نہیں آنے دیا۔ چیخ پکار کا فائدہ بھی کیا ہوتا؟ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ زندگی خوش وخرم گزرے تو اس اصول پر کاربند رہنے کی کوشش کیجیے:

"چھوٹی موٹی باتوں کو اہمیت نہ دیجیے۔"

فرض کیجیے کہ آپ کی ملازمت کا پہلا دن ہے۔ آپ نئے کپڑے پہنے اٹن شن ہوکر دفتر روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں آنے والے مختلف دروازوں میں سے کسی ایک پر تازہ تازہ روغن کیا گیا ہے۔ آگاہی کے لیے دروازے کی ایک جانب اطلاعی تختی بھی نصب کی

گئی ہے۔ آپ بے خیالی میں وہاں سے گزرتے ہیں اور آپ کے کپڑے پر روغن لگ جاتا ہے۔ روغن کرنے والا غصے میں آ کر آپ پر آوازے کستا ہے۔ آپ کا ردّ عمل کیا ہو گا؟ ایسی صورتِ حال میں ہم اکثر جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اُس سے معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔ ہم طیش میں آ کر جوابی حملہ کر دیتے ہیں۔

''تم نے یہ تختی صحیح جگہ کیوں نہیں لگائی۔''

آگے سے وہ بھی مشتعل ہو کر آپ پر ہلا بول دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کا لباس روغن سے آلودہ ہونے کے بعد مٹی سے بھی لتھڑ جاتا ہے۔

یا مثال کے طور پر آپ گھر سے نکلتے ہیں۔ ایک تیز رفتار گاڑی سڑک پر کھڑا پانی آپ پر اچھالتی ہوئی زن سے گزر جاتی ہے۔ کیا آپ اپنی جان عذاب میں ڈال کر چیخیں گے، چلائیں گے، گاڑی اور اُس میں سوار لوگوں کو باآواز بلند کھری کھری سنائیں گے جو گزر کر کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے؟

اسی طرح یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہم زندگی کی تکلیفیں، اذیتیں اور دُکھ یاد کر کر کے دل جلانے کی مشق کرتے رہیں۔ محمد ﷺ کی زندگی تکلیفوں اور صبر آزما دشواریوں سے پُر تھی۔ آپ اپنی پیاری بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے پوچھ لیا:

''کیا احد کے دن سے زیادہ سخت دن بھی آپ پر گزرا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ کے لیے احد کا دن واقعی سخت دن تھا۔ آپ کے عزیز ترین چچا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو انتہائی بے دردی سے شہید کر کے اُن کی لاش پامال کر دی گئی۔ ناک کان کاٹ لیے گئے۔ پیٹ چیر دیا گیا۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک ٹوٹ گئے۔ چہرہ زخمی ہو گیا۔ خون بہنے لگا۔ اُس دن آپ کے ستر صحابہ شہید ہو گئے۔ مدینے پہنچے تو ستر افراد کم تھے۔ اُن کی بیواؤں اور یتیم بچوں کا کس مپرسی

کے عالم میں بے سہارا رہ جانا بھی ایک دلدوز سانحہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

«مَا لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ كَانَ أَشَدَّ مِنْهُ يَوْمَ الْعَقَبَةِ، إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي»

''گھاٹی کے دن تمھاری قوم نے مجھ سے جو سلوک کیا وہ احد کے دن سے زیادہ سخت تھا۔ اُس دن میں نے اپنے آپ کو اہل طائف کے سامنے پیش کیا تھا۔''[1]

یہ کہہ کر آپ نے اُس دل فگار واقعے کا تفصیل سے ذکر کیا۔

مصائب و آلام کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے شب و روز ایک مطمئن زندگی کا نادر نمونہ تھے۔

اس لیے اپنے آپ کو غم و اندوہ کے اندھیروں میں گم نہ کیجیے۔ اللہ نے زندگی زندہ رہنے کے لیے دی ہے۔ زندہ رہنے اور خوش رہنے کی کوشش کیجیے۔

قناعت

''مسئلے کا ایسا حل نکالنا جو دراصل اُس کا حل نہ ہو، آپ کو اذیت دیتا ہے اور مسئلہ بھی جوں کا توں رہتا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3231، و صحيح مسلم، حديث:1795.

چند مشکلات جن کا کوئی حل نہیں

گرمی کے موسم میں آپ نے اکثر لوگوں کو گرمی کی شدت کی شکایت کرتے سنا ہوگا۔ گرمی واقعی شدید ہوتی ہے، اس سے انکار نہیں لیکن کیا گرمی کی مذمّت یا شکایت کرنے سے اُس کی شدت میں کمی آجائے گی؟ بالکل نہیں مگر اپنا دل ضرور جلے گا۔

دوسرے لفظوں میں ہم سب کو یہ بات تسلیم کرلینی چاہیے کہ زندگی میں ہمیں بعض ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا کوئی حل نہیں ہوتا، اس لیے لازم ہے کہ ان مسائل سے نمٹتے ہوئے وسیع الظرفی کا مظاہرہ کیا جائے۔

ایلیا ابو ماضی نے کہا تھا:

قَالَ: السَّمَاءُ كَئِيبَةٌ وَّتَجَهَّمَا
قُلْتُ ابْتَسِمْ، يَكْفِي التَّجَهُّمَ فِي السَّمَا!

''اُس نے کہا: ''آسمان افسردہ اور ترش رُو ہے۔'' میں نے کہا: مسکراؤ، آسمان کی ترش رُوئی کے لیے بس اتنا کافی ہے۔''

قَالَ: الصِّبَا وَلَّى! فَقُلْتُ لَهُ: ابْتَسِمْ
لَنْ يَّرْجِعَ الْأَسَفُ الصِّبَا الْمُتَصَرِّمَا

''اُس نے کہا: ''مشرق کی تیز ہوا ''صبا'' پھر آدھمکی۔'' میں نے اُس سے کہا:

''مسکراؤ، افسوس کرنے سے کاٹ دار ہوا لوٹ نہیں جائے گی۔''

قَالَ: الَّتِي كَانَتْ سَمَائِي فِي الْهَوٰى
صَارَتْ لِنَفْسِي فِي الْغَرَامِ جَهَنَّمَا

''اس نے کہا: ''وہ جو میرا آسمانِ محبت تھی، عشق کا دوزخ بن چکی ہے۔''

خَانَتْ عُهُودِي بَعْدَ مَا مَلَّكْتُهَا
قَلْبِي فَكَيْفَ أُطِيقُ أَنْ أَبْتَسِمَا

''میں نے اُسے اپنے دل کا مالک بنایا لیکن اُس نے مجھ سے باندھے عہد توڑ دیے۔ سو میں کیونکر مسکراؤں؟''

قُلْتُ: ابْتَسِمْ وَاطْرَبْ فَلَوْ قَارَنْتَهَا
قَضَّيْتَ عُمْرَكَ كُلَّهُ مُتَأَلِّمَا

''میں نے کہا: ''(پھر بھی) مسکراؤ اور خوش رہو، اس لیے کہ اگر تم اُس (کے وعدوں) کا حساب کتاب کرنے بیٹھ گئے تو ساری عمر اذیت میں رہو گے۔''

قَالَ: العِدٰى حَوْلِي عَلَتْ صَيْحَاتُهُمْ
أَأُسَرُّ وَالأَعْدَاءُ حَوْلِي فِي الحِمٰى؟

''اس نے کہا: ''میرے اردگرد دشمنوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ دشمنوں کے گھیرے میں کیا خوشی محسوس کروں؟''

قُلْتُ: ابْتَسِمْ، لَمْ يَطْلُبُوكَ بِذَمِّهِمْ
لَوْلَمْ تَكُنْ مِنْهُمْ أَجَلَّ وَأَعْظَمَا!

''میں نے کہا: ''(تو بھی) مسکراؤ، اگر تم دشمنوں سے بلند مرتبہ اور عظیم نہ ہوتے تو

وہ کبھی تمھیں مذمت کا نشانہ نہ بناتے۔"

قَالَ: اللَّيَالِي جَرَّعَتْنِي عَلْقَمَا

قُلْتُ: ابْتَسِمْ وَلَئِنْ جُرِّعْتَ الْعَلْقَمَا

اُس نے کہا: "راتوں نے مجھے کڑوے گھونٹ پلائے ہیں۔" میں نے کہا: "مسکراؤ، اگرچہ تمھیں کڑوے گھونٹ پلائے گئے ہیں۔"

فَلَعَلَّ غَيْرَكَ إِنْ رَآكَ مُرَنِّمَا

طَرَحَ الْكَآبَةَ خَلْفَهُ وَتَرَنَّمَا

"ہوسکتا ہے تمھیں گاتا دیکھ کر کوئی دکھی دل انسان افسردگی پس پشت ڈال دے اور گانے لگے۔"

أَتَرَاكَ تَغْنَمُ بِالتَّبَرُّمِ دِرْهَمَا

أَمْ أَنْتَ تَخْسِرُ بِالْبَشَاشَةِ مَغْنَمَا

"کیا تم سمجھتے ہو کہ گنگنا کر کوئی درہم کما لو گے یا خوش روئی اور بشاشت سے خسارہ پاؤ گے؟"

فَاضْحَكْ فَإِنَّ الشُّهْبَ تَضْحَكُ وَالدُّجٰی

مُتَلَاطِمٌ وَلِذَا نُحِبُّ الْأَنْجُمَا

"اس لیے ہنسو۔ دیکھو، تارے تاریکیوں کی دبیز تہوں میں بھی ہنستے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ستاروں سے محبت کرتے ہیں۔"

جی ہاں! زندگی کا لطف اُٹھایئے۔ یاد رکھیے آپ کی نفسیاتی حالت کا بد اثر آپ کے کردار، ملازمت، بچوں اور دوست احباب پر نہیں پڑنا چاہیے، آخر وہ ناکردہ گناہوں کی

سزا کیوں بھگتیں؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ جب بھی آپ کو دیکھیں، آپ کو یاد کریں، حزن وملال کی ایک تصویر اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے میت پر نوحہ کرنے، گریبان چاک کرنے سے منع کیا تو اس میں یہی حکمت کارفرما تھی کہ آدمی کی موت کے بعد اصل کام اُسے نہلانا دھلانا، کفن پہنانا اور نماز جنازہ پڑھ کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنا ہے۔ چیخ پکار اور واویلا کا اس کے سوا اور کیا فائدہ ہے کہ زندگی اپنی تمام تر دلچسپیوں کے باوجود غم واندوہ کا سامان بن جائے۔

معافی بن سلیمان اپنے دوست کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ دوست نے ماتھے پر بل لا کر کہا: ''اُف، آج کتنی سردی ہے؟''

معافی نے کہا: ''اب تمھیں گرماہٹ مل گئی ہے؟''

وہ بولا: ''نہیں۔''

اس پر معافی نے کہا: ''پھر مذمت کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر سبحان اللہ کہہ دیتے تو بات بھی تھی۔''

اپنی زندگی جئیں

''مشکلات سے نظریں مت چرائیں۔ چھوٹی موٹی باتوں کو اہمیت نہ دیں۔ زندگی سے لطف اٹھائیں۔''

اپنے آپ کو غم کے مارے ہلاک نہ کریں

سعد یونیورسٹی میں میرا طالب علم ہے۔ وہ پورا ہفتہ غیر حاضر رہا۔ وہ آیا، مجھ سے ملا تو میں نے پوچھا: ''سعد! خیریت؟''

''کچھ نہیں۔ بس کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔''

اُس کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے پھر کہا: ''سعد! کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ!''

''میرا بیٹا بیمار ہے۔ اُسے تلیُّفِ جگر (Cirrhosis) کی بیماری ہے۔ اب چند دنوں سے سُمّیتِ خون (Toxemia) نے بھی آ گھیرا ہے۔ کل میں یہ جان کر سکتے میں آ گیا کہ زہر کا اثر دماغ تک پہنچ گیا ہے۔''

سعد واقعی پریشان تھا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔

میں نے کہا: ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ صبر کرو۔ اللہ تمھارے بیٹے کو شفا دے۔ اور اگر اللہ نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے تو روزِ قیامت اُسے تمھارا سفارشی بنائے۔''

وہ بولا: ''سفارشی؟ یا شیخ، وہ بچہ نہیں۔''

''اُس کی عمر سترہ سال ہے۔''

میں نے کہا: ''چلو، اللہ اُسے شفا دے۔ اُس کے بھائیوں کو تمھارے لیے مبارک کرے۔''

اُس نے سر جھکا کر کہا: ''یا شیخ! اُس کا کوئی بھائی نہیں۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ اسے بھی بیماری کھائے جا رہی ہے۔''

سعد کی حالت قابل رحم تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے کہا: ''سعد! اپنے آپ کو غم کے مارے ہلاک نہ کرو۔ ہم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اللہ نے لکھ رکھی ہوتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

جی ہاں! اپنے آپ کو غم کے مارے ہلاک نہ کریں۔ غم کرنے سے مصائب کا بوجھ ہلکا نہیں ہو جاتا۔

کچھ عرصہ پیشتر میں مدینہ منورہ گیا۔ وہاں میں اپنے دیرینہ دوست خالد سے ملا۔ اُس نے مجھ سے کہا: ''چلیں، دکتور عبداللہ کو مل کر آتے ہیں۔''

میں نے پوچھا: ''کس خوشی میں؟''

کہنے لگا: ''خوشی میں نہیں، تعزیت کرنے۔''

''تعزیت کرنے؟''

''ہاں۔ اُن کا بڑا بیٹا پورے کنبے کو لے کر ساتھ والے شہر شادی پر گیا تھا۔ دکتور عبداللہ یونیورسٹی سے منسلک ہیں، اس لیے وہ شادی پر نہ جا سکے۔ واپسی پر اُن کے گھرانے کو خوفناک حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں گھر کے تمام گیارہ افراد جاں بحق ہو گئے۔''

دکتور عبداللہ پچاس کے پیٹے میں تھے اور نیک آدمی تھے۔ لیکن بہر حال انسان تھے۔ اُن کے جذبات و احساسات تھے۔ سینے میں دردمند دِل تھا۔ رونے والی آنکھیں تھیں۔ اُنھیں یہ اندوہ ناک خبر پہنچی تو نہایت صبر مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے سارے خاندان کی تجہیز و تکفین کی، نمازِ جنازہ پڑھی اور اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دبا آئے۔ گیارہ افراد، پورا کنبہ۔

دکتور عبداللہ خالی خولی گھر میں سرگرداں رہتے۔ بچوں کے کمرے میں کھلونے بکھرے تھے۔ کئی دن ہوئے ان کھلونوں سے کھیلا نہیں گیا تھا، اس لیے کہ ان سے کھیلنے والے بچے خلود اور سارہ وفات پا چکے تھے۔

بستر پر جاتے ہیں تو اُسے بے ترتیب پاتے ہیں کیونکہ ام صالح جاں بحق ہو چکی ہیں۔

یاسر کی سائیکل کے قریب سے گزرتے ہیں۔ وہ بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ اُسے چلانے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ بڑی بیٹی کے کمرے میں اُس کی شادی کے جو عنقریب ہونے والی تھی، رنگ برنگے جوڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں تھی۔

سبحان اللہ! اللہ پاک ہے جس نے اُنھیں صبر دیا اور اُن کا دل ثابت رکھا۔ لوگ تعزیت کرنے آتے۔ ایسا لگتا کہ دکتور عبداللہ پر کوئی مصیبت ہی نہیں آئی اور وہ خود تعزیت کرنے آئے ہیں۔

وہ بار بار یہی کہتے: ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ اُس نے دیا اور جو لے لیا۔ اُس کے ہاں ہر شے کا ایک مقررہ وقت ہے۔''

یہ نہایت سمجھداری کی بات تھی۔ اگر وہ ایسا نہ سوچتے تو یقیناً غم کے مارے مر جاتے۔

میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو ہمیشہ خوش نظر آتے ہیں۔ لیکن آپ اُن کے حالات کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ معمولی ملازمت ہے، کرائے کا تنگ سا گھر ہے، معمولی سواری ہے اور اہل وعیال بکثرت ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں۔ زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

حالت کی ناسازگاری کا کیا شکوہ کرنا! زندگی میں موجود بہت سی شکایتیں انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ واویلا کرنے سے تکلیف بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی ہے۔

أَفْنَيْتَ يَا مِسْكِينُ! عُمْرَكَ بِالتَّأَوُّهِ وَالْحَزَنْ
وَظَلَلْتَ مَكْتُوفَ الْيَدَيْنِ تَقُولُ حَارَبَنِي الزَّمَنْ

''اے بے چارے انسان! تم نے اپنی عمر آہ و بکا کرتے رہنے اور غم کھانے میں ضائع کر دی۔ تم ہاتھ باندھے بیٹھے کہتے رہے کہ زمانے کو مجھ سے بیر ہے۔''

إِنْ لَّمْ تَقُمْ بِالْعِبْءِ أَنْتَ فَمَنْ يَقُومُ بِهِ إِذَنْ

''اگر تم خود یہ بوجھ نہیں اٹھاؤ گے تو کون اٹھائے گا؟''

روشنی کی کرن

''جو سہولیات میسر ہیں اُنھیں کام میں لایئے اور خوشگوار زندگی گزاریے۔''

اللہ نے قسمت میں جو لکھ دیا اُس پر راضی ہو جایئے

میں ایک مشہور شہر کے سفر پر تھا۔ وہاں مجھے چند لیکچر دینا تھے۔ اُس شہر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہاں نفسیاتی امراض کا ہسپتال تھا جسے عرف عام میں لوگ ''پاگل خانہ'' کہتے ہیں۔ میں صبح سویرے دو لیکچر دے کر نکلا تو ظہر کی اذان میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ میرے ہمراہ ملک کا معروف مبلغ اور داعی عبدالعزیز بھی تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تھے۔ میں نے اُس سے کہا: ''عبدالعزیز! ہمارے پاس وقت ہے۔ میں یہاں ایک جگہ جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟'' اُس نے پوچھا۔

''شیخ عبداللہ تو ابھی سفر میں ہیں اور دکتور احمد سے میں نے رابطہ کیا تھا لیکن اُنھوں نے فون نہیں اٹھایا۔''

''آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ یہاں ایک قدیم کتب خانہ ہے۔''

میں نے کہا: ''نہیں، میں ذہنی امراض کے ہسپتال جانا چاہتا ہوں۔''

وہ بولا: ''پاگل خانے؟''

میں نے کہا: ''ہاں، پاگل خانے۔''

وہ ہنسا اور مزاحیہ انداز میں کہنے لگا: ''کیوں؟ دماغ کا چیک اپ کرانا ہے؟''

میں نے کہا: ''نہیں، ہم عبرت حاصل کریں گے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکرادا کریں گے۔''

عبدالعزیز خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر غم کا سایہ لہرایا۔ وہ معمول سے زیادہ جذباتی مزاج کا مالک تھا۔ اُس نے گاڑی ذہنی امراض کے ہسپتال والی سڑک پر ڈال دی۔ ہم وہاں پہنچے تو سامنے ایک افسردہ عمارت کھڑی تھی جسے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ اُنھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہسپتال کا دورہ کرانے لے گئے۔ وہ ہمیں ایک برآمدے میں لے گئے جس کے دونوں اطراف میں کمرے تھے۔ وہاں ہمیں عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دائیں طرف کے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تو نو بیڈ خالی تھے اور ایک پر ایک آدمی اوندھے منہ پڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہ پاگل ہے۔ ہر پانچ چھ گھنٹے بعد اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ میں نے لاحول ولا قوہ پڑھا اور پوچھا: ''یہ شخص کب سے اِس حال میں ہے؟''

اُنھوں نے کہا: ''دس سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔''

چند قدم آگے ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے میں سوراخ تھا جس سے ایک آدمی باہر جھانک رہا تھا۔ وہ عجیب وغریب سمجھ میں نہ آنے والے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے کمرے کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے کا فرش اور دیواریں گہرے نسواری رنگ کی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ بھی پاگل ہے۔

میں نے کہا: ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ پاگل ہے۔ عقل مند ہوتا تو ہم اُسے یہاں نہ دیکھتے لیکن اِس کا ماجرا کیا ہے؟''

اس پر ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: ''اِس آدمی کو دیوار نظر آتی ہے تو مشتعل ہو جاتا ہے۔ ہاتھوں سے، پاؤں سے اور کبھی سر سے دیوار کو مارتا رہتا ہے۔ کبھی انگلیاں تڑوائے بیٹھا ہوتا ہے، کبھی ٹانگیں اور کبھی سر زخمی ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے افسردگی سے کہا: ''ہم اِس کا علاج نہیں کر سکے۔ اِس کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ دیواروں اور فرش پر فوم لگا دی گئی ہے تاکہ وہ جیسے چاہے بھڑاس نکالتا رہے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب آگے چل دیے۔

میں اور عبدالعزیز وہاں کھڑے دُعا پڑھنے لگے جو اللہ کے رسول ﷺ نے اِس موقع کے لیے سکھائی ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي عَافَانَا مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ وَفَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا»

''اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اِس بیماری سے عافیت میں رکھا جس میں تمھیں مبتلا کیا اور یوں اُس نے ہمیں اپنی بیشتر مخلوق پر ایک فضیلت عطا کی۔''[1]

پھر ہم بھی اگلے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ ایک کمرے میں کوئی بیڈ نہیں تھا۔ یہاں تین آدمی تھے۔ اُن میں سے ہر ایک اپنے حال میں مست تھا۔ کوئی ناچ رہا تھا، کوئی گا رہا تھا اور کوئی اذان دینے میں مصروف تھا۔ تین آدمیوں کو کرسیوں پر بٹھا کر ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے بے تحاشا زور لگا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بتانے لگے کہ یہ تینوں افراد سامنے کی ہر شے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ کھڑکیاں توڑ دیتے ہیں، دروازے اکھاڑ دیتے ہیں، برقی آلات خراب کر دیتے ہیں، اس لیے ہم صبح سے شام تک انھیں اسی طرح باندھے رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا: ''یہ لوگ کب سے اسی حال میں ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب بولے: ''یہ آدمی دس سال سے، یہ سات سال سے اور یہ نیا ہے، اسے پانچ سال ہوئے ہیں۔''

میں اُن کی حالت پر افسوس کرتا اور اللہ کی نعمت پر اُس کا شکر ادا کرتا کمرے سے باہر آ گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: ''اب ہمیں باہر کا رستہ دکھائیے۔''

وہ کہنے لگے: ''ایک کمرہ رہ گیا ہے۔ آیئے۔''

وہ مجھے ایک بڑے کمرے کی جانب لے گئے۔ دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ مجھے توقع تھی کہ پہلے جیسے کسی ناچتے گاتے یا اودھم مچاتے مریض سے سابقہ پڑے گا۔ لیکن یہاں تو منظر ہی اور تھا۔ ایک آدمی جس کی عمر پچاس سے اوپر اور سر کے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی، زمین پر سمٹ کر بیٹھا تھا اور ہماری طرف ٹیڑھی میڑھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ معمولی تھا لیکن اہم بات یہ تھی کہ وہ الف ننگا تھا۔ اُس کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی بھی نہیں تھی۔ میں نے حیرت سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگے: ''اس شخص کو ہم نے جب بھی کپڑے پہنائے، اس نے کپڑے دانتوں سے پھاڑ کر نگلنے کی کوشش کی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے اسے ایک دن میں دس بار کپڑے پہنائے اور اُس نے ہر بار کپڑوں کا یہی حشر کیا۔ یہ آدمی اپنے جسم پر ایک چیتھڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم نے تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اب سردی ہو یا گرمی، یہ بے لباس ہی رہتا ہے۔''

میں کمرے سے نکل آیا۔ اب میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: ''اب ہمیں اجازت دیجیے۔''

وہ بولے: ''ابھی چند شعبے باقی ہیں۔''

میں نے کہا: ''جتنا دیکھ لیا، کافی ہے۔''

ہم خاموشی سے ہسپتال کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں

ڈاکٹر صاحب کو جیسے کچھ یاد آیا تو وہ بولے:

''یا شیخ! یہاں ہمارے پاس ایک بڑا تاجر بھی ہے جو کھربوں کا مالک ہے۔ دو سال ہوئے ہیں، اُس کی عقل میں ذرا خلل آ گیا تو اُس کے لڑکے اُسے یہاں چھوڑ گئے۔

''ایک اور ہے جو انجینئر تھا۔''

''ایک اور جو......''

ڈاکٹر صاحب ایک ایک کر کے اُن افراد کا تذکرہ کرنے لگے جو عزوشرف کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد ذلت کے گہرے گڑھوں میں جا گرے، کچھ دوسرے جو دولت مندی کے بعد فقر کی زندگی گزار رہے ہیں۔

میں سوچنے لگا: ''پاک ہے وہ ذات جس نے بندوں میں رزق تقسیم کیا تو جس کو چاہا دیا اور جسے چاہا محروم رکھا۔''

اللہ آدمی کو مال و دولت، حسب ونسب اور منصب رفیع سے نوازتا ہے لیکن عقل چھین کر اُسے پاگل خانے پہنچا دیتا ہے۔ دوسرے کو مال و دولت اور حسب ونسب کے ساتھ عقل مندی عطا کرتا ہے لیکن صحت سے محروم کر دیتا ہے اور مال و دولت کی فراوانی کے باوجود وہ بیس، تیس سال اور کبھی تمام عمر بستر پر گزارتا ہے۔ کسی کو صحت، قوت اور عقل دیتا ہے تو مال سے محروم کر دیتا ہے، اس لیے ہر اُس آدمی کے لیے جسے اللہ نے کسی نہ کسی آزمائش میں ڈالا ہے، ضروری ہے کہ وہ مصائب شمار کرنے سے پہلے اللہ کی نعمتوں کو حساب میں لائے۔

اگر اللہ نے مال سے محروم رکھا ہے تو صحت دی ہوگی۔

صحت نہیں دی تو عقل سے نوازا ہوگا۔

عقل بھی کم دی ہے تو مسلمان تو بنایا ہی ہے۔ اسلام کی نعمت بھی کوئی چھوٹی نعمت

نہیں۔ اُس شخص کی زندگی مبارک ہے جو اسلام پر جیے اور اسلام ہی پر مرے، اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ الحمدللہ۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی یہی جذبات تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو غزوۂ ذات السلاسل کے لیے شام کی طرف روانہ کیا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو دشمن کی بڑی تعداد دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا اور کمک طلب کی۔ آپ نے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو اُن کی مدد کو بھیجا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کمک کے لیے روانہ ہونے والے اِس لشکر کے امیر تھے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کِبار مہاجرین بھی شامل تھے۔

روانگی کے وقت آپ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''آپ دونوں آپس میں اختلاف مت کرنا۔''

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے۔ شام کے علاقے میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے ابوعبیدہ سے کہا: ''آپ صرف کمک کے طور پر آئے ہیں۔ لشکر کا سپہ سالار میں ہوں۔''

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بولے: ''نہیں، میں اپنے دستے کا سپہ سالار ہوں اور آپ اپنے دستے کے سپہ سالار ہیں۔'' ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نرم خو اور صلح جو آدمی تھے۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا: ''بلکہ آپ میری کمک ہیں۔''

اس پر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمرو بھائی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ دونوں اختلاف نہ کرنا، اس لیے آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں آپ کی بات مانوں گا۔''

عمرو رضی اللہ عنہ بولے: ''پھر میں آپ کا سپہ سالار ہوں۔ آپ صرف میری کمک ہیں۔''

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات تسلیم کر لی اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر لوگوں کو

نماز پڑھائی۔ جنگ اختتام پذیر ہوئی تو سب سے پہلے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ آپ نے اُن سے جنگ کا احوال دریافت کیا۔ اُنھوں نے آپ کو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کے متعلق بتایا۔ اس پر آپ نے فرمایا:

''اللہ ابوعبیدہ بن جراح پر رحم کرے۔''[2]

رائے

''زندگی کے تاریک پہلوؤں سے پہلے اُس کے روشن پہلوؤں پر نظر ڈالیں، آپ اچھی زندگی گزاریں گے۔''

[1] جامع الترمذي، حديث:3431، و سنن ابن ماجة، حديث:3892. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 402/4.

کوہِ گراں بنیے

ابوسفیان بن حرب شام سے تجارتی قافلہ لیے آ رہا تھا۔ مسلمان قافلے پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ ابوسفیان نے راستہ بدلا اور قافلے کو لے کر بھاگ گیا۔ اُس نے قریش کو پیغام بھیجا کہ مسلمانوں نے حملہ کر دیا ہے۔ قریش ایک لشکر جرار لے کر مسلمانوں کے مقابلے میں اترے۔ بدر کے میدان میں معرکہ بپا ہوا۔ مسلمانوں کو اس معرکے میں فتح حاصل ہوئی۔ قریش کے ستر کافر واصلِ جہنم ہوئے اور ستر ہی گرفتار کر لیے گئے۔ قریش کا بچا کھچا لشکر بھوک پیاس کی حالت میں اپنے زخم چاٹتا مکہ واپس ہوا۔ اُدھر ابوسفیان بھی قافلے کے ہمراہ آ پہنچا۔ قریش کے شکست خوردہ سپاہی اُس کے سامنے تھے۔ اہلِ مکہ پر بڑی مصیبت نازل ہوئی تھی۔

عبداللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ چند نوجوانوں کے ہمراہ جن کے باپ، بھائی اور بیٹے بدر میں مارے گئے تھے، ابوسفیان کی طرف آئے اور کہا: ”قریش کے لوگو! محمد نے آپ کو اچھا خاصا گزند پہنچایا اور آپ کے سرکردہ افراد قتل کر دیے ہیں، اس لیے آپ مال کے ذریعے سے اُس کے خلاف جنگ میں ہماری مدد کریں، شاید کہ ہم اُس سے انتقام لیں۔“

ابوسفیان اور دیگر تاجروں نے اُن کی مدد کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے۔

انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا، بلاشبہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کے راستے سے روکیں۔ تو وہ اموال خرچ کرتے رہیں گے، پھر وہ اموال اُن کے لیے حسرت وندامت کا باعث ہوں گے، پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا اُنھیں اکٹھا کر کے جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔''

چنانچہ قریش کیل کانٹے سے لیس ہو کر جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ کے جو لوگ قریش کے تابع تھے، وہ بھی نکلے۔ عورتیں بھی ہمراہ تھیں تاکہ مرد میدان سے راہِ فرار اختیار نہ کریں۔ ابوسفیان اپنی بیوی ہند بنت عتبہ کو، عکرمہ بن ابی جہل اپنی بیوی ام حکیم بنت حارث کو اور حارث بن ہشام فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ کو لیے نکلا۔ اہلِ مکہ نے پیش قدمی کرتے ہوئے مدینہ کے مقابل وادی کے کنارے پر آ پڑاؤ ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کو اُن کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ طلب کیا کہ مدینے میں رہ کر دفاع کریں یا باہر نکلیں۔ وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، بولے: ''یارسول اللہ! ہم مدینہ سے باہر نکل کر احد کے میدان میں اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔'' اُن کا خیال تھا کہ یوں وہ اصحابِ بدر کی فضیلت حاصل کر لیں گے۔ اُن کا اصرار بڑھا تو رسول اللہ ﷺ گھر گئے اور اسلحہ پہن کر باہر نکل آئے۔ لوگوں نے آپ کو جنگ کے لیے تیار دیکھا تو نادم ہوئے۔ اُنھیں احساس ہوا کہ اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ کہنے لگے: ''یارسول اللہ! آپ چاہیں تو مدینہ ہی

میں رہیں۔ آپ کی رائے ہی بہتر ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ وہ اسلحہ پہن کر اتار دے یہاں تک کہ اللہ اُس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ کر دے۔''[2]

ابوسفیان اور اُس کا لشکر جبلِ احد کے دامن میں اترے تو مسلمان خوش ہوئے کہ اُن کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے فرمایا:

''کون آدمی ہے جو ہمیں عام راستے سے ذرا ہٹ کر ان لوگوں کے قریب لے جائے۔''

بنو حارثہ بن حارث کے ابوخثیمہ نامی ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! میں لے جاؤں گا۔'' ابوخثیمہ اسلامی لشکر کو لیے بنو حارثہ کے کھیتوں سے گزرنے لگا۔ مربع بن قیظی جو اندھا اور منافق تھا، اُس کے کھیت سے گزرے۔ مربع بن قیظی نے رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ کرام کی آواز سنی تو اٹھا اور اُن کے چہروں پر مٹی پھینکتے ہوئے کہنے لگا: ''اگر تم اللہ کے رسول ہو تو میں تمھیں اجازت نہیں دیتا کہ میرے کھیت سے گزرو۔''

پھر اُس خبیث نے ہاتھ میں مٹی بھری اور کہا: ''واللہ! اے محمد! مجھے معلوم ہوتا کہ یہ مٹی تمھارے سوا کسی اور پر نہیں پڑے گی تو میں اسے تمھارے چہرے پر دے مارتا۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اُسے سبق سکھانے آگے بڑھے لیکن نبی ﷺ نے فرمایا:

''اسے قتل نہ کریں۔ یہ آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے۔''[3]

یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ چل دیے اور اس منافق کے معاملے کو اہمیت نہ دی۔ آپ باوقار اور عقل مند انسان تھے۔ معمولی باتوں پر غصے میں نہیں آتے تھے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور قافلہ چلتا رہتا ہے۔

قناعت

”ہوائیں پہاڑوں کو نہیں ہلا سکتیں، مگر ریتوں کو اِدھر سے اُدھر پھینکتی رہتی ہیں۔“

[1] الأنفال 36:8. [2] المستدرك للحاكم: 129/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 205/3، والبداية والنهاية: 4/13-15. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 29/3.

اس پر لعنت نہ بھیجو

معاشرے کے برے افراد، خواہ کیسے ہی برے ہوں، اُن میں کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور ہوتی ہے۔ اگر ہم برے آدمی کے دل کے کسی کونے کھدرے میں چھپی بھلائی کی کلید حاصل کرسکیں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ ایک ڈاکو کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ڈاکوں کی کمائی کا کچھ حصہ نادار اور یتیم افراد میں تقسیم کرتا ہے اور کچھ حصے سے مساجد تعمیر کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ کا اخلاق یہ تھا کہ آپ خطا کاروں اور گناہ گاروں سے اچھا گمان رکھتے ہوئے اُن کی بھلائیاں تلاش کرتے تھے۔

ایک آدمی کو شراب نوشی کے جرم میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ کے حکم سے اُسے کوڑے لگائے گئے۔ چند دن گزرے۔ اُس نے پھر شراب پی۔ اُسے گرفتار کر کے لایا گیا اور کوڑے لگائے گئے۔ چند دن بعد اُسے شراب نوشی کے جرم میں پھر لایا گیا اور سزا دی گئی۔ وہ جانے کے لیے مڑا تو ایک صحابی کہنے لگے: ''اللہ اس پر لعنت کرے۔ متعدد بار یہ اسی جرم کی پاداش میں لایا گیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے اُن صحابی کی طرف دیکھا۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمایا:

''اس پر لعنت مت بھیجیے۔ واللہ! جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اللہ اور اُس کے

رسول سے محبت کرتا ہے۔‘‘[1]

اِس لیے لوگوں سے تعامل میں عدل وانصاف سے کام لیجیے۔ اُن میں موجود بھلائی یاد رکھیے۔ اُنھیں احساس دلایئے کہ اُن کی برائی کے باوجود آپ نے اُن کی شخصیت کا اچھا پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ یوں وہ آپ کے قریب آئیں گے۔

’’قبل اس سے کہ آپ لوگوں میں موجود برائی کا درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، ان میں شجرۂ خیر تلاش کر کے اُس کی آبیاری کیجیے۔‘‘

1 صحيح البخاري، حديث: 6780.

جو آپ نے چاہا وہ نہیں ہوا تو وہ چاہیے جو ہو رہا ہے

''جب کوئی چارۂ کار نہیں تو گزارہ کرو۔''

یہ بات میں نے ایک نوجوان سے کہی جو ذیابیطس کا مریض تھا۔ وہ پھیکی چائے پی رہا تھا اور اپنے حال پر افسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا:

''چائے نوشی کے دوران تمھارے افسوس کرنے یا غمزدہ ہونے سے اس بیماری کو کوئی فائدہ ہوگا؟

وہ بولا: ''نہیں۔''

اس پر میں نے کہا: ''جب کوئی چارۂ کار نہیں تو گزارہ کرو۔''

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ دنیا کے سارے معاملات ہماری مرضی کے مطابق ہوں۔ ایسی صورتِ حال کا سامنا ہمیں اکثر کرنا پڑتا ہے۔

آپ اپنی من پسند ملازمت کے لیے انٹرویو دینے گئے۔ وہاں آپ کو قبول نہیں کیا گیا۔ آپ نے دوسری جگہ رجوع کیا، وہاں آپ کو رکھ لیا گیا، اس پرابلم کا حل کیا ہے؟ یہی کہ ''جب کوئی چارۂ کار نہیں تو گزارہ کرو۔''

آپ نے کسی لڑکی کو شادی کا پیغام بھیجا۔ لڑکی نے انکار کر دیا اور کسی اور کا پیغام قبول کر لیا۔

اب کیا ہوسکتا ہے؟ یہی نا کہ ”جب کوئی چارۂ کار نہیں تو گزارہ کرو۔“ بہتر ہے کہ اس کا خیال دل سے نکال کر کسی اور لڑکی سے شادی کرلیں۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟

بہت سے لوگوں کو ان مسائل کا یہ دوٹوک حل پسند نہیں آتا۔ وہ ان مسائل کا حل دائمی افسردگی، ہمیشہ کے افسوس اور ہر ایرے غیرے سے شکوہ شکایت کی صورت میں نکالتے ہیں۔ لیکن یہ انداز نہ تو اُنھیں کھوئی ہوئی اشیاء دلاتا ہے اور نہ قسمت کے لکھے کو تبدیل کرتا ہے۔

میرے نزدیک زندگی کے ان مسائل کا سوائے اس کے اور کوئی حل نہیں کہ آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا تو وہ چاہنے لگ جائیں جو ہوسکتا ہے۔ عقل مند انسان وہی ہے جو اپنا مزاج حالات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے، یہاں تک کہ وہ صورتِ حال کی تبدیلی پر قادر ہو جائے۔

میرا دوست جو ایک مسجد کی تعمیراتی سرگرمیوں کا نگران تھا، اُس نے مجھے بتایا کہ دورانِ تعمیر رقم کی کمی کے باعث اُنھوں نے شہر کے ایک نامی گرامی تاجر سے مدد طلب کی۔ وہ اُس کے ہاں گئے۔ تاجر نے اُنھیں بٹھایا۔ خاطر تواضع کی۔ اُنھوں نے مدعا کہا تو تاجر نے حسبِ توفیق مدد کی، پھر وہ جیب سے ایک دوا نکال کر لینے لگا۔ ہم نے کہا: ”خیریت گزری؟ کیا بات ہے؟“

تاجر کہنے لگا: ”کچھ نہیں۔ یہ نیند کی گولیاں ہیں۔ دس سال ہو گئے، ان کے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔“

ہم نے اُس کے لیے دعا کی اور سلام کر کے نکل آئے۔ راستے میں سڑک کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ وہاں اُنھوں نے بڑے بڑے جنریٹروں کے ذریعے سے سرچ لائٹیں جلا رکھی تھیں۔ جنریٹروں کا شور دور دور تک سنائی دیتا تھا۔ یہ سب معمول کی بات تھی۔ عجیب

بات یہ تھی کہ جنریٹروں کا غریب چوکیدار اخبار کے چند کاغذ زمین پر بچھائے مزے سے سو رہا تھا۔

جی ہاں! زندگی گزاریے۔ پریشان ہونے کا وقت نہیں۔ ضروریاتِ زندگی میں سے جو کچھ مل گیا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُسے استعمال میں لائیے اور جو نہیں ملا، اُس پر کڑھنا چھوڑیے۔

ایک نظر اِدھر بھی

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ
تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

''ہر وہ چیز جس کی انسان تمنا کرے، ضروری نہیں کہ اُسے مل جائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہوائیں کشتیوں کی مخالف سمت چلتی ہیں۔'' (متنبّی)

ہم اختلاف کرتے ہیں، اس کے باوجود دوست ہیں

روایت ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا کسی پیچیدہ فقہی مسئلے کے متعلق ایک عالم سے مناظرہ ہوا۔ طویل گفتگو ہوئی۔ دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی مدمقابل کی بات کا قائل نہ ہوا۔ ان عالم کا مارے غصے کے رنگ بدل گیا۔ مجلس تمام ہوئی اور دونوں حضرات جانے کے لیے اٹھنے لگے تو امام شافعی رحمہ اللہ نے اُن عالم کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اختلافِ رائے کے باوجود دوست رہیں؟''

حدیث کے ایک عالم خلیفہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک آدمی نے حدیث بیان کی۔ وہ عالم حیرت سے بولے: ''یہ کون سی حدیث ہے؟ یہ آپ کہاں سے لائے ہیں؟ آپ اللہ کے رسول پر جھوٹ باندھتے ہیں؟''

وہ آدمی بولا: ''جناب! یہ حدیث پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔''

عالم نے اُسی انداز میں جواب دیا: ''نہیں، ہم نے آج تک یہ حدیث نہیں سنی۔''

مجلس میں ایک دانا وزیر بھی موجود تھا۔ اُس نے عالم کی طرف دیکھا اور اطمینان سے پوچھا: ''یا شیخ! کیا نبی ﷺ کی تمام احادیث آپ کی نظر میں ہیں؟''

عالم نے جواب دیا: ''نہیں۔''

وزیر نے پوچھا: ''پھر نبی ﷺ کی تمام احادیث کا نصف حصہ تو آپ کے حافظے میں

محفوظ ہوگا؟"

عالم نے کہا: "غالباً۔"

اس پروزیر نے کہا: "تو سمجھ لیجیے کہ یہ حدیث اُس نصف میں سے ہے جو آپ کو یاد نہیں۔"

یوں یہ بحث اختتام کو پہنچی۔

امام فضیل بن عیاض اور امام عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ گہرے دوست تھے۔ دونوں پائے کے عالم اور نیک دل انسان تھے۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جہاد کے لیے سرحدوں کی طرف نکل گئے۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ بیت اللہ ہی میں عبادت کرتے رہے۔ عبادت کے دوران ایک دن فضیل کو ابنِ مبارک بہت یاد آئے۔ اُن کی یاد کے ساتھ ہی بیتے دنوں کی یادیں بھی آ موجود ہوئیں جب وہ دونوں بیت اللہ میں اکٹھے عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ فضیل نے ابنِ مبارک کو خط لکھا کہ واپس آ جاؤ اور بیت اللہ میں عبادت اور درسِ قرآن و حدیث کی رونقیں دوبالا کرو۔

عبداللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض کا مکتوب پڑھا تو جواب لکھنے بیٹھ گئے:

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوْ أَبْصَرْتَنَا
لَعَلِمْتَ أَنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

"اے حرمین کے عابد! ہمیں دیکھو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ تمھاری عبادت (جہاد کے مقابلے میں) کھیل ہے۔"

مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهُ بِدُمُوعِهِ
فَنُحُورُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

"وہ آدمی جو اپنا چہرہ آنسوؤں سے آراستہ کرتا ہے۔ ہمارے سینے بھی خون سے

مزین ہیں۔"

أَوْ كَانَ يُتْعِبُ خَيْلَهُ فِي بَاطِلٍ
فَخُيُولُنَا يَوْمَ الصَّبِيحَةِ تَتْعَبُ

"یا وہ شخص جو فضول کام میں اپنا گھوڑا کھپاتا ہے۔ ہمارے گھوڑے حملے کی صبح تھکاوٹ سے چور ہوتے ہیں۔"

رِيحُ الْعَبِيرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيرُنَا
رَهْجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْأَطْيَبُ

"عبیر (ایک خوشبو) کی مہک تمھیں مبارک ہو۔ ہماری عبیر گھوڑوں کے سموں کی اڑائی دھول اور پاکیزہ غبار ہے۔"

وَلَقَدْ أَتَانَا مِنْ مَّقَالِ نَبِيِّنَا
قَوْلٌ صَحِيحٌ صَادِقٌ لَا يَكْذِبُ

"ہمیں ہمارے نبی ﷺ کی ایک صحیح اور سچی بات معلوم ہوئی ہے۔"

لَا يَسْتَوِي وَغُبَارُ خَيْلِ اللّٰهِ فِي
أَنْفِ امْرِیءٍ وَّدُخَانُ نَارٍ تَلْهَبُ

"کہ مجاہد کی ناک میں جہادِ فی سبیل اللہ کا غبار اور دہکتی آگ کا دھواں برابر نہیں۔"

هٰذَا كِتَابُ اللّٰهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا
لَيْسَ الشَّهِيدُ بِمَيِّتٍ لَا يَكْذِبُ

"یہ دیکھو، اللہ کی کتاب ہمارے درمیان کہہ رہی ہے کہ شہید مردہ نہیں ہوتا۔ اللہ کی کتاب جھوٹ نہیں بولتی۔"

پھر اُنھوں نے لکھا: ''اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کے لیے اُس نے صیام کا دروازہ کھول دیا ہے۔ وہ جتنے روزے رکھتے ہیں اُتنے کوئی نہیں رکھ سکتا۔''

''بعض بندوں کو اللہ نے تلاوتِ قرآن کی توفیق دی ہے۔''

''چند ایک کے دلوں میں اللہ نے تحصیلِ علم کا شوق ڈال دیا ہے۔''

''کئی بندے جہاد کے میدان میں اترے ہیں۔''

''کچھ بندوں کو اللہ نے قیام اللیل (نمازِ تہجد) کی طرف راغب کر رکھا ہے۔''

''تم جو کام کر رہے ہو وہ اُس سے بہتر نہیں جو میں کر رہا ہوں اور میں جو کر رہا ہوں وہ اُس سے افضل نہیں جو تم کر رہے ہو۔''

''ہم دونوں بھلائی کا کام کر رہے ہیں۔''[1]

یوں ان دونوں دوستوں کا اختلاف آسانی سے اختتام پذیر ہو گیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طریق کار بھی یہی تھا۔

مشرکینِ مکہ نے مدینہ میں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے لشکر مہیا کرنا شروع کیا۔ وہ اتنا بڑا لشکر لے کر آئے کہ آج تک عرب نے کثرتِ تعداد و اسلحہ کے لحاظ سے ایسا لشکر نہیں دیکھا تھا۔ مسلمانوں نے خندق کھودی جسے پار کر کے مشرکین مدینہ میں داخل نہ ہو سکے، چنانچہ وہ خندق کی پرلی طرف خیمہ زن ہو گئے۔ مدینہ میں یہود کا قبیلہ قریظہ تھا جو مسلمانوں پر حملے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ یہ اُن کے لیے سنہری موقع تھا۔ وہ مشرکین کی مدد کو آئے اور مدینہ میں لوٹ مار مچائی۔ مسلمان خندق پر پہرا دے رہے تھے۔ مدینہ میں آ کر قریظہ سے نمٹنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ دن بڑے کٹھن تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا بھیجی جس نے دشمن کی صفیں الٹ دیں۔ وہ رات کے اندھیرے میں شکست خوردہ ہو کر بھاگے۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ خندق

چھوڑ کر مدینہ واپس آئے۔ مسلمان بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور اسلحہ اتار دیا۔ رسول اللہ ﷺ بھی گھر گئے، اسلحہ اتارا اور غسل کیا۔ ظہر کے وقت جبریل آئے اور گھر سے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کو آواز دی۔ آپ گھبرائے ہوئے اٹھے اور جلدی سے باہر آئے۔ جبریل نے کہا: ''یارسول اللہ! کیا آپ نے اسلحہ اتار دیا؟'' فرمایا: ''جی ہاں۔''

جبریل نے کہا: ''فرشتوں نے تو ابھی ہتھیار نہیں رکھے۔ میں بھی اُن لوگوں کے تعاقب سے لوٹا ہوں۔ ہم اُن کے تعاقب میں ''حمراء الاسد'' تک گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بنوقریظہ کی طرف چلنے کا حکم دے رہا ہے۔ میں بھی اُنھی کی طرف جا رہا ہوں اور اُنھیں ہلا کر رکھ دوں گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے منادی کو حکم دیا، اُس نے لوگوں میں اعلان کیا:

''جو سن رہا ہے اور مطیع ہے وہ عصر کی نماز بنوقریظہ ہی میں پڑھے۔''[1]

یہ سن کر لوگ اسلحہ کی طرف لپکے اور دیارِ بنوقریظہ کی جانب چل پڑے۔ راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا: ''ہم عصر کی نماز بنوقریظہ ہی میں پڑھیں گے۔'' بعض نے کہا: ''ہم ابھی نماز پڑھیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں چاہا تھا۔''

(رسول اللہ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ ہم فوراً چل پڑیں اور جلدی کریں۔)

چنانچہ کچھ لوگوں نے وہیں راستے میں نماز پڑھی اور بعض نے مؤخر کر کے بنوقریظہ میں عصر کی نماز ادا کی۔ نبی ﷺ کو بتایا گیا تو آپ نے کسی سے کوئی تعرض نہ کیا، پھر آپ نے بنوقریظہ کا محاصرہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطا فرمائی۔

اس واقعے کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ صحابۂ کرام اختلاف کے باوجود دوست رہتے تھے۔ اختلاف کے نتیجے میں وہ باہمی رنجش اور تلخی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔

آپ لوگوں سے وسیع الظرفی کا یہی معاملہ کر کے دیکھیں، وہ آپ سے محبت کریں گے بلکہ اُن سے پہلے اللہ تعالیٰ آپ سے محبت کرے گا۔

نقطۂ نظر

''یہ ضروری نہیں کہ ہم متفق ہو جائیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ہم اختلاف نہ کریں۔''

[1] یہ اشعار عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے سنداً ثابت نہیں۔

[2] دیکھیے البداية والنهاية: 4/118، و صحيح البخاري، حديث: 4119.

نرمی کا برتاؤ

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَا كَانَ الرِّفْقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَمَا نُزِعَ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ»

''جس شے میں نرمی ہو وہ آراستہ ہو جاتی ہے اور جس شے سے نرمی نکال دی جائے وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔''[1]

اسی طرح فرمایا:

«إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِأَهْلِ بَيْتٍ خَيْرًا أَدْخَلَ عَلَيْهِمُ الرِّفْقَ وَ إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِأَهْلِ بَيْتٍ شَرًّا، نَزَعَ مِنْهُمُ الرِّفْقَ»

''جب اللہ تعالیٰ کسی گھرانے سے بھلائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُن میں نرمی ڈال دیتا ہے اور جب کسی گھرانے سے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُن سے نرمی سلب کر لیتا ہے۔''[2]

اسی حدیث کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ، وَمَا لَا يُعْطِي عَلٰى مَا سِوَاهُ»

”اللہ تعالیٰ نرم ہے اور نرمی پسند کرتا ہے اور جو کچھ نرمی پر عطا کرتا ہے وہ درشتی پر یا کسی اور شے پر عطا نہیں کرتا۔“ [3]

نرم مزاج و نرم پہلو اور سہل خو آدمی لوگوں کو پسند ہوتا ہے۔ دل اُسے مل کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ لوگ اُس پر اعتماد کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب نرم مزاج آدمی کے کلام میں وزن ہو اور اُس میں معاملات سے عمدہ طور پر نمٹنے کی صلاحیت بھی موجود ہو۔

علمائے احناف کی ایک شہرۂ آفاق شخصیت امام قاضی ابو یوسف ؒ ہیں جو امام ابو حنیفہ ؒ کے مشہور ترین شاگرد تھے۔ ابو یوسف نے غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد اُنھیں امام ابو حنیفہ کے درس میں جانے سے روکتے اور کہتے کہ بازار جا کر کچھ کما کر لاؤ۔ امام ابو حنیفہ کو اس ہونہار شاگرد سے خاص لگاؤ تھا۔ ابو یوسف غیر حاضر ہوتے تو استاد اُنھیں ڈانٹ پلاتے۔

ایک روز ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ ؒ سے والد کے رویے کی شکایت کی۔ امام صاحب نے اُن کے والد کو بلوایا اور پوچھا: ”یہ بچہ دن میں کتنا کما لیتا ہوگا؟“

اُن کے والد نے جواب دیا: ”دو درہم۔“

اس پر امام صاحب نے کہا: ”آپ دو درہم مجھ سے لے لیا کیجیے اور اسے علم حاصل کرنے دیجیے۔“

یوں ابو یوسف برسوں امام ابو حنیفہ ؒ سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ ابو یوسف نے جوانی کی وادی میں قدم رکھا اور اپنے ہم جماعتوں سے برتری لے گئے۔ اس دوران اُنھیں ایک بیماری لاحق ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ بستر کے ہو کر رہ گئے۔ امام ابو حنیفہ اُن کی عیادت کو گئے۔ دیکھا کہ بیماری جڑ پکڑ چکی ہے۔ نہایت رنجیدہ ہوئے اور یہ کہتے ہوئے واپس آ گئے کہ ”ابو یوسف! میں تو سوچ رہا تھا کہ تم میرے بعد مسند

تدریس سنبھالو گے۔‘‘

دو دن گزرے تو ابو یوسف اچھے ہو گئے اور بیماری جاتی رہی۔ اُنھوں نے غسل کیا، نیا لباس پہنا اور درس میں حاضری کے لیے جانے لگے۔ گھر والوں نے پوچھا: ’’کہاں جاتے ہو؟‘‘

کہا: ’’شیخ کا درس لینے۔‘‘

اُنھوں نے کہا: ’’علم ہی حاصل کرتے رہو گے؟ اب بس بھی کرو۔ پتا ہے شیخ تمھارے متعلق کیا کہہ کر گئے ہیں؟‘‘

پوچھا: ’’کیا کہہ کر گئے ہیں؟‘‘

’’وہ کہہ رہے تھے کہ ابو یوسف! میں تو اُمید کرتا تھا کہ تم میرے بعد مسند تدریس سنبھالو گے۔‘‘

اس بات پر ابو یوسف پھولے نہ سمائے۔ سیدھے مسجد گئے۔ مسجد کے ایک گوشے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا حلقۂ درس قائم تھا۔ دوسرے کونے میں یہ بیٹھ گئے اور درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نیا حلقۂ درس دیکھا تو دریافت کیا: ’’یہ کس کا حلقہ ہے؟‘‘

شاگردوں نے بتایا: ’’ابو یوسف کا۔‘‘

بولے: ’’وہ تو بیمار تھا، اچھا ہو گیا؟‘‘

جواب ملا: ’’جی ہاں۔‘‘

پوچھا: ’’پھر درس میں کیوں نہیں آیا؟‘‘

’’گھر والوں نے اُسے آپ کی بات بتا دی ہے۔ اب وہ لوگوں کو پڑھانے بیٹھ گیا ہے۔ اُسے آپ کی ضرورت نہیں رہی۔‘‘

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے سوچا کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے نرمی اور تدبر کی ضرورت ہے۔

اُنھوں نے کہا: ''ابو یوسف چاہتا ہے کہ ہم کھل کر اُس کے سامنے آئیں۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اپنے ایک شاگرد سے مخاطب ہوئے: ''وہ سامنے جو شیخ بیٹھے ہیں اُن کے پاس جاؤ اور کہو: ''یا شیخ! ایک سوال ہے۔''

وہ خوش ہوں گے اور تم سے سوال کے متعلق پوچھیں گے۔ وہ سوالوں کے جواب دینے ہی بیٹھے ہیں۔ اُن سے پوچھنا:

''ایک صاحب نے درزی کو قمیص دی کہ اُسے چھوٹا کر دے۔ چند دنوں بعد وہ صاحب قمیص لینے آئے تو درزی نے انکار کر دیا کہ اُس نے قمیص نہیں لی۔ وہ صاحب پولیس بلا لائے۔ پولیس نے درزی کی دکان سے قمیص برآمد کر لی۔ سوال یہ ہے کہ درزی اجرت کا مستحق ہے کہ نہیں؟''

اگر وہ تمھیں جواب دیں کہ درزی اجرت کا مستحق ہے تو تم کہنا کہ آپ نے غلط کہا۔ اگر وہ کہیں کہ درزی اجرت کا مستحق نہیں تو بھی کہنا کہ آپ نے درست نہیں کہا۔''

طالبِ علم یہ مشکل سوال لے کر ابو یوسف کے پاس گیا اور بولا: ''یا شیخ! ایک مسئلہ ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟''

''ایک صاحب نے درزی کو قمیص دی کہ......

ابو یوسف نے فوراً جواب دیا: ''ہاں! درزی اجرت کا مستحق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس نے اپنا کام پورا کیا ہے۔''

سائل نے کہا: ''آپ غلط کہتے ہیں۔''

ابو یوسف کو تعجب ہوا۔ اُنھوں نے مزید غور کیا اور کہا: ''نہیں، درزی اجرت کا

مستحق نہیں۔"

سائل نے اس بار بھی کہا: "آپ کی بات غلط ہے۔"

ابو یوسف نے طالبِ علم سے پوچھا: "قسم کھا کر بتاؤ! تمھیں کس نے بھیجا ہے؟"

اُس نے امام ابو حنیفہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "شیخ نے بھیجا ہے۔"

ابو یوسف اپنی جگہ سے اُٹھے، امام صاحب کے پاس گئے اور پوچھا: "یا شیخ! ایک مسئلہ ہے۔"

امام صاحب نے التفات نہ کیا۔ ابو یوسف آگے آئے اور دو زانو ہو کر شیخ کے رو برو بیٹھے اور مودبانہ گویا ہوئے: "یا شیخ! ایک مسئلہ ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" امام صاحب نے دریافت کیا۔

"آپ جانتے ہیں۔"

"وہی قمیص اور درزی والا مسئلہ؟"

"جی ہاں۔"

"جاؤ، جواب دو۔ تم شیخ نہیں ہو؟"

"نہیں، شیخ آپ ہیں۔"

اس پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: "ہم قمیص سے کاٹے ہوئے کپڑے کی مقدار جانچیں گے۔ اگر اُس نے قمیص آدمی کے سائز کے مطابق کاٹی ہے تو معلوم ہوا کہ اُس نے یہ کام آدمی کے لیے کیا تھا لیکن بعد میں اُس کی نیت خراب ہوگئی۔ اس صورت میں وہ اجرت کا حق دار ہے۔ اگر اُس نے قمیص آدمی کے سائز کے مطابق نہیں کاٹی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس نے یہ کام اپنے لیے کیا تھا، اس لیے وہ اجرت کا مستحق نہیں ہوگا۔"

ابو یوسف نے استاذ امام کے سر کو بوسہ دیا اور اُن کی وفات تک کسبِ فیض کرتے

رہے۔ امام صاحب کی وفات کے بعد ابو یوسف اُن کی مسند پر فائز ہوئے۔

نرمی کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن کبھی کبھی انسان کو بعض معاملات میں سختی بھی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ دوسروں کی خیر خواہی میں حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر معاملے کو اُس کی اصل جگہ رکھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کبھی اپنی ذات کی خاطر غصے میں نہیں آتے تھے۔ ہاں! اللہ کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ملاقات ایک یہودی سے ہوئی۔ اس نے انھیں تورات کا کچھ کلام سنایا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو وہ باتیں اچھی لگیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں لکھ دو۔ یہودی نے وہ کلام لکھ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ تورات کی وہ تحریر نبی ﷺ کی خدمت میں لائے اور آپ کو پڑھ کر سنائی۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو غصے میں آ گئے، آپ نے فرمایا:

''عمر بن خطاب! آپ اس شریعت پر شک کرتے ہیں؟ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں آپ کے پاس روشن اور صاف ستھری شریعت لایا ہوں۔ آپ اُن (یہود و نصاریٰ) سے کچھ نہ پوچھیے۔ وہ آپ کو حق بتائیں گے تو آپ اُسے جھٹلائیں گے اور باطل بتائیں گے تو آپ اُس کی تصدیق کریں گے۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو اُنھیں بھی میری پیروی کیے بنا کوئی چارہ نہ ہوتا۔''[4]

جی ہاں! ہم رفق (نرمی) کی بات کر رہے ہیں لیکن کبھی کبھار سختی اختیار کرنا اور غصے کا اظہار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

نبوت کے ابتدائی دنوں میں رسول اللہ ﷺ کعبہ میں آتے۔ قریش اپنی مجالس میں ہوتے۔ آپ اُن کی طرف توجہ کیے بغیر نماز شروع کر دیتے۔

ایک روز اشرافِ قریش حطیم میں اکٹھے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور کہنے لگے: ''جتنا صبر ہم نے اس آدمی کے متعلق کیا اتنا صبر کبھی نہیں کیا۔ اُس نے ہمارے عقل مندوں کو بے وقوف گردانا۔ ہمارے آباء واجداد کو برا بھلا کہا۔ ہمارے دین میں کیڑے نکالے۔ ہماری وحدت پارہ پارہ کر دی۔ ہمارے خداؤں کو گالیاں دیں۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔''

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نمودار ہوئے۔ آپ آئے، حجر اسود کو بوسہ دیا اور کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ پہلے پھیرے پر قریش کے لوگوں نے کوئی بیہودہ بات کہی، غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن آپ نے اغماض برتا۔ دوسرے چکر پر اُنھوں نے پھر کوئی قبیح بات کہی، مارے غضب کے آپ کا رنگ بدلا، تاہم آپ نے خاموشی سے طواف جاری رکھا۔ تیسری بار اُنھوں نے پھر وہی بات کی تو آپ ٹھہر گئے اور فرمایا:

''قریش کے لوگو! کیا تم سن رہے ہو؟ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمھارے پاس ذبح (کا حکم) لے کر آیا ہوں۔''[1]

یہ کہہ کر بہادر و بے خوف رسول ﷺ اُن کے سامنے کھڑے رہے۔

قوم نے صادق و امین کی زبان سے یہ دھمکی سنی تو اُنھیں سانپ سونگھ گیا۔ وہ کانپ اٹھے۔ اُن پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ ہر آدمی اچھی بات کہہ کر آپ کی خوشنودی حاصل کرنے لگا۔ اُنھوں نے کہا: ''ابوالقاسم! آپ ہدایت یافتہ ہیں، جائیے۔ آپ جاہل نہیں ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ چلے آئے۔

جی ہاں!

إِذَا قِيلَ: حِلْمٌ، قُلْ: فَلِلْحِلْمِ مَوْضِعٌ
وَحِلْمُ الْفَتٰى فِي غَيْرِ مَوْضِعِهِ جَهْلُ

”جب کہا جائے: ”تحمل۔“ تو کہو: ”تحمل کا بھی ایک مقام ہے۔نوجوان کا بے جا تحمل کرنا جہالت ہے۔“

سیرت نبوی کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مزاج پر ہمیشہ نرمی اور رفق غالب رہتا تھا۔ یادرہے کہ رفق سے مراد ناتوانی اور بزدلی نہیں۔ رفق کا مطلب رفق ہی ہے۔

رفق کی صفت اپنانے سے معاملات کیونکر سلجھتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے ہوگا:

جنگ بدر کے ایک ماہ بعد ابو العاص بن ربیع نے جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی زینب کے شوہر تھے، زینب رضی اللہ عنہا کو والد کے پاس مدینے بھیجنا چاہا۔ اُدھر نبی ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کو مکہ روانہ کیا اور فرمایا:

”یاجج کی وادی میں ٹھہرے رہنا۔ زینب وہاں سے گزرے گی۔تم اُسے ساتھ لے کر مدینہ آجانا۔“

ابو العاص نے زینب رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا کہ وہ تیاری کرے۔ زینب اپنا سامان اکٹھا کرنے لگیں۔ اس دوران ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ اُن کے پاس آئی اور بولی:

”بنتِ محمد! کیا مجھے یہ پتا نہیں چلا کہ تم اپنے والد کے پاس جارہی ہو؟“

زینب کو خدشہ ہوا کہ کہیں ہند اُنھیں دھوکا نہ دے۔

زینب نے کہا:

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

ہند بولی: ”عم زادی! اگر ایسا کوئی ارادہ رکھتی ہو اور تمھیں سامانِ سفر یا پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا اور شرمانا مت۔ میں کوشش کروں گی کہ تمھارے کام

آؤں۔ عورتوں کا آپس میں وہ تکلف نہیں ہوتا جو مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔“

زینب کہتی ہیں: ”واللہ! میں سوچ رہی تھی کہ اُس کی نیت ٹھیک ہے، پھر بھی مجھے ڈر ہوا اور میں نے اُس پر اپنا ارادہ ظاہر نہ کیا۔“

زینب رضی اللہ عنہا کی تیاری مکمل ہوئی تو اُن کے شوہر کو اندیشہ ہوا کہ وہ خود اُنھیں لے کر نکلا تو قریش کو پتا چل جائے گا کہ زینب جا رہی ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کنانہ بن ربیع کو کہہ دیا۔ کنانہ بن ربیع سواری لے کر آیا، زینب رضی اللہ عنہا سوار ہوئیں، کنانہ نے کمان اور ترکش کندھے سے لٹکائے اور مہار پکڑ کر چل دیا۔ دن کا وقت تھا۔ قریش نے اُنھیں جاتے دیکھا تو آپس میں کہنے لگے: ”محمد نے بدر میں ہماری بڑی تعداد کو تہِ تیغ کیا اور اب اُس کی بیٹی یوں اطمینان سے چلی جائے؟ واللہ! ایسا نہیں ہوگا۔“

چند افراد اُن کے تعاقب میں نکلے اور ذوطویٰ کے مقام پر اُنھیں جا لیا۔ سب سے پہلے ہبار بن اسود پہنچا۔ اُس نے زینب رضی اللہ عنہا کو نیزہ دکھایا۔ وہ ہودج میں سوار تھیں اور حاملہ تھیں۔ خوف سے ان کا حمل ضائع ہو گیا۔ قریش کے لوگ آتے جا رہے تھے۔ اُن کے پاس اسلحہ تھا۔ ادھر زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ دیور کنانہ بن ربیع کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کنانہ نے یہ منظر دیکھا تو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا، ترکش الٹ دیا اور تیروں کی ایک قطار بنا دی، پھر بولا: ”واللہ! جو شخص بھی میرے قریب آیا میں اُسے تیروں سے چھلنی کر دوں گا۔“

کنانہ بڑا ماہر تیر انداز تھا۔ لوگ اُس کا مقابلہ کرنے سے جھجکے اور دور کھڑے اُسے دیکھنے لگے۔ کنانہ پیٹھ پھیر کر جا سکتا تھا اور نہ وہ اُس کے قریب آنے کی جرأت کرتے تھے۔ اُدھر ابوسفیان کو پتا چلا کہ زینب والد کے ہاں جا رہی ہے تو وہ قریش کے چند سرکردہ افراد کے جلو میں نکلا۔ اُس نے کنانہ کو تیروں کے ساتھ تیار دیکھا تو بلند آواز سے کہا: ”او بھائی! اپنے تیر پرے ہٹاؤ۔ ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ کنانہ نے

ہتھیار رکھ دیے تو ابوسفیان گیا اور بولا:

''تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ اس عورت کو لے کر سرِ عام نکل کھڑے ہوئے جبکہ تم جانتے ہو کہ بدر میں محمد نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ لوگ تمھیں برسرِ عام محمد کی بیٹی کو اُن کے درمیان سے لے کر جاتا دیکھیں گے تو یقیناً اسے اپنی کمزوری اور بزدلی تصور کریں گے۔ بات صرف اتنی ہے ورنہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اُسے اُس کے والد کے پاس جانے سے روکیں۔ اُس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟ ابھی تم اُسے واپس لے آؤ۔ جب آوازیں مدھم پڑ جائیں گی اور لوگ کہنے لگیں گے کہ ہم محمد کی بیٹی کو واپس لے آئے ہیں تو تم خاموشی سے اُسے لے کر نکلنا اور والد کے پاس چھوڑ آنا۔''

ابوسفیان کی باتیں کنانہ کے دل کو لگیں۔ وہ زینب رضی اللہ عنہا کو واپس لے آیا۔ کچھ روز زینب رضی اللہ عنہا مکہ میں رہیں۔ جب آوازیں مدھم پڑ گئیں تو کنانہ ایک رات اُنھیں لے کر نکلا اور یاجج میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر آیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ زینب رضی اللہ عنہا کو لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔[6]

اس واقعے کا قابلِ لحاظ پہلو ابوسفیان رضی اللہ عنہ (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) کا رفیقانہ اور صلح جوئی کا طرزِ عمل ہے۔

وحی

«مَا كَانَ الرِّفْقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَمَا نُزِعَ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ»

''رِفق جس شے میں ہو اُسے آراستہ کر دیتا ہے اور جس شے سے نکال دیا جائے اُسے عیب دار کر دیتا ہے۔''[7]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2594، وسنن أبي داود، حدیث: 2478. [2] مسند أحمد: 71/6. ''اور جب کسی گھرانے سے برائی......'' سے آخر تک ہمیں نہیں ملی۔ [3] صحیح مسلم، حدیث: 2593. [4] مسند أحمد: 387/3. یہ سنداً ضعیف ہے۔ تاہم ایک مرسل سند جو حسن بصری تک پہنچتی ہے، صحیح ہے۔ [5] مسند أحمد: 218/2، ومجمع الزوائد: 15/6، و دلائل النبوة للبیهقي: 276/2. [6] السیرة النبویة لابن هشام: 264/2. [7] صحیح مسلم، حدیث: 2594.

زندہ اور مردہ کے درمیان

وہ اپنے ہم چشموں، پاس پڑوس کے لوگوں، اپنے بھائیوں اور اولاد کے لیے سخت گراں بار تھا۔ اُس نے لوگوں کو اپنے بارے میں کئی بار کہتے سنا تھا: ''بھائی! تم بے حس ہو۔''

وہ کبھی لوگوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اُس کا چھوٹا بیٹا خوشی خوشی آیا۔ وہ اُسے ہوم ورک کی کاپی دکھانے آیا تھا جس پر ماسٹر صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ لکھا تھا: ''بہت عمدہ۔''

لیکن اُس نے توجہ نہیں کی۔ بس اتنا کہا: ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ واللہ! تم ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے آئے تو کیا کرو گے؟''

بچے کے جذبات یقیناً اس سے زائد کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اس کی کلاس میں ایک طالب علم بڑا ہنسوڑ تھا۔ وہ سبق سے (اور استاد سے بھی!) اکتا جاتا تو کوئی نہ کوئی چٹکلا چھوڑ دیتا۔ اس پر بھی اُس کے (استاد کے) چہرے کے تاثرات نہ بدلتے۔ وہ صرف اتنا کہتا: ''ہنسی کرتے ہو؟'' میرا خیال ہے کہ طالبِ علم سے اُس کا رویہ مختلف ہونا چاہیے تھا۔

وہ شاپنگ سنٹر میں خریداری کرنے گیا۔ سادہ لوح سیلز مین نے اُس سے کہا: ''میرے گھر سے خط آیا ہے۔'' اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کاش اُس نے سوچا ہوتا کہ

وہ بے چارہ اُسے یہ کیوں بتا رہا ہے کہ میرے گھر سے خط آیا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ بھی اُس کی خوشی میں شریک ہو اور مبارکباد دے۔

وہ اپنے ایک رفیقِ کار سے ملنے اُس کے گھر گیا۔ میزبان نے چائے سے اُس کی تواضع کی، پھر اندر گیا اور اپنا پہلوٹھی کا نومولود اٹھا لایا۔ اُسے مہمان کے آگے کرتے ہوئے پوچھنے لگا:

''یہ شیر آپ کو کیسا لگا؟''

اس نے سرد مہری سے دیکھا اور کہا: ''اچھا ہے۔ اللہ آپ کے لیے مبارک کرے۔''

یہ کہہ کر اُس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینے لگا۔ میزبان اس سے زائد کا منتظر تھا۔ وہ بچے کو اٹھاتا۔ اُسے بوسہ دیتا۔ اُس کی خوبصورتی اور قابلِ رشک صحت کی تعریف کرتا لیکن کیا کیجیے کہ ہمارے صاحب تو نرے بدھو ہیں۔

لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے آپ معاملات کو لوگوں کی نظر سے دیکھیے۔ اپنے اندر کسی معاملے کی اہمیت کا وہی احساس اجاگر کیجیے جو لوگوں میں موجود ہے۔ آپ کے بچے کے نزدیک ''بہت عمدہ'' کے لفظ کی اہمیت ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ کے رفیقِ کار کو اُس کا نومولود دنیا و مافیہا سے پیارا ہے۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتا ہے یہی چاہتا ہے کہ اپنا دل چیر کر اُسے اُس میں بٹھا لے۔ کیا رفیقِ کار سے آپ کی محبت کا تقاضا نہیں کہ آپ اُس کے جذبات میں شریک ہوں؟

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی خاص شے کے لیے پرجوش ہوتے ہیں۔ آپ بھی اُن کے ساتھ گرم جوشی کا اظہار کریں۔ بے حس اور جذبات سے عاری نہ ہوں۔ حالات کے مطابق خوشی، غمی یا حیرت کا اظہار کریں۔ جو لوگ دوسروں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش نہیں کرتے آپ اُنھیں ہمیشہ یہ شکایت کرتے پائیں گے:

''میرے بچے میرے پاس بیٹھنا کیوں پسند نہیں کرتے؟''

ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ کوئی لطیفہ سناتے ہیں تو آپ اُن کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ اسکول کی باتیں کرتے ہیں تو آپ توجہ نہیں دیتے، اس لیے وہ آپ کے پاس بیٹھنا اور آپ سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتے۔

کوئی آدمی آپ کو واقعہ سناتا ہے جو آپ نے پہلے سے سن رکھا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آپ یہ واقعہ دوبارہ سن لیجیے۔

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا کہنا ہے: ''واللہ! ایک آدمی مجھے حدیث سناتا ہے جسے میں نے اُس کے جنم لینے سے بھی پہلے سن رکھا ہوتا ہے لیکن میں اُس سے حدیث یوں سن لیتا ہوں جیسے پہلی بار سن رہا ہوں۔''

یہ یقیناً بہت عمدہ طرزِ عمل ہے۔

مسلمان غزوۂ خندق سے پہلے خندق کی کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ ایک صحابی جن کا نام جُعیل (چھوٹا بجّو) تھا، رسول اللہ ﷺ نے یہ نام بدل کر ''عمرو'' رکھ دیا۔ اب صحابۂ کرام کام کرتے اور ساتھ ساتھ یہ شعر پڑھتے:

سَمَّاهُ مِنْ بَعْدِ جُعَيْلٍ عَمْرًا
وَكَانَ لِلْبَائِسِ يَوْمًا ظَهْرًا

''اللہ کے نبی نے اُس کا نام جُعیل سے بدل کر ''عمرو'' رکھ دیا۔ اُس غریب کے لیے آپ بڑے مددگار ثابت ہوئے۔''

صحابۂ کرام جب عمرًا کہتے تو رسول اللہ ﷺ بھی عمرًا کہتے۔ صحابۂ کرام ظَهْرًا کہتے تو آپ بھی اُن کی آواز میں آواز ملا کر ظَهْرًا کہتے۔ اس پر صحابۂ کرام اور گرم جوشی سے شعر پڑھتے اور کام میں جتے رہتے۔ اُنھیں یہ خوش گوار احساس ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ

بھی اُن کے ساتھ ہیں۔[1]

رات کو سردی سخت ہوگئی۔ اس کے باوجود صحابۂ کرام کھدائی کا کام کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ اُن کی طرف آئے اور اُنھیں ہاتھوں سے خوشی خوشی کھدائی کرتے دیکھا۔ صحابۂ کرام نے یہ شعر پڑھا۔

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدَا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدَا

''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے، جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، محمد سے جہاد کی بیعت کی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اُن کا جواب دیتے۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَه
فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَه

''اے اللہ! واقعتاً اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ تو مہاجرین و انصار کو بخش دے۔''

ان سارے دنوں میں رسول اللہ ﷺ اُن کی آواز سے آواز ملاتے رہے، اُن سے ہم آہنگی کا اظہار کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی کے دوران ایک دن صحابۂ کرام دُھول سے اٹے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا
وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

''واللہ! اگر اللہ نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے، نہ صدقہ کرتے، نہ نمازیں پڑھتے۔''

فَأَنْزِلَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا
وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا

''اے اللہ! تو ہم پر سکینت نازل فرما۔ اگر (دشمن سے) ہمارا سامنا ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔''

إِنَّ الْأُلَى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا
إِذَا أَرَادُوا فِتْنَةً أَبَيْنَا

''اُن لوگوں نے ہم پر ظلم ڈھائے ہیں۔ جب بھی اُنھوں نے کوئی فتنہ برپا کرنا چاہا ہم نے انکار کیا۔''

رسول اللہ ﷺ بھی اُن کے ساتھ مل کر بلند آواز سے کہتے: «أَبَيْنَا، أَبَيْنَا.»[1]

رسول اللہ ﷺ سے کوئی مزاح کے انداز میں بات کرتا تو آپ بھی ہنستے اور تبسم فرماتے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دن آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ اُن دنوں اپنی بیگمات سے ناراض تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے دل میں کہا: ''میں رسول اللہ ﷺ کو ہنسا کے رہوں گا۔''

وہ کہنے لگے: ''یارسول اللہ! کبھی ہم قریش کے لوگوں کی خستہ حالی بھی ملاحظہ کیجیے۔ ایک زمانہ تھا، عورتوں پر ہمارا غلبہ تھا اور وہ ہمارے قابو میں تھیں۔ ہمارے کسی آدمی سے اُس کی عورت نفقہ کا مطالبہ کرتی تو وہ اُٹھ کر اُس کی گردن پر اُلٹے ہاتھ کی ایک دھول ٹکا دیتا۔ یہاں مدینے میں آئے تو ہمارا واسطہ ایسی قوم سے پڑا جن کی عورتیں اُن پر غالب ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہماری عورتیں بھی ہم پر غالب آنے لگی ہیں۔''

ان کی اس بات پر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے۔

احادیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اتنا مسکراتے کہ آپ کی ابتدائی داڑھیں نظر آنے لگتیں۔[1]

ایک دن رسول اللہ ﷺ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف فرما تھے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنایا۔ آپ شدید مصروفیت کے باوجود اُن کی باتیں نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا:

''جاہلیت کے دور کی بات ہے۔ گیارہ خواتین اکٹھی بیٹھیں اور یہ طے کیا کہ اپنے شوہروں کا کھلا تذکرہ کریں گی اور اُن کی عادات و اطوار سے متعلق کوئی بات نہیں چھپائیں گی۔

پہلی خاتون نے کہا: ''میرا شوہر لاغر اونٹ کا گوشت ہے جو دشوار گزار پہاڑ کی چوٹی پر پڑا ہو۔ نہ پہاڑ پر چڑھنا آسان ہے اور نہ گوشت ہی ایسا اچھا کہ اُس کے لیے اتنی تگ و دو کی جائے۔'' (بداخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ متکبر بھی ہے)

دوسری بولی: ''میں اپنے شوہر کا حال بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اُسے چھوڑ نہیں سکوں گی۔ اگر اُس کا ذکر کروں گی تو سارا کچا چٹھا کہہ ڈالوں گی۔'' (شوہر میں عیب بہت ہیں۔ کچھ کہوں گی، اُسے پتا چلے گا تو طلاق دے ڈالے گا، اس لیے خاموش رہتی ہوں۔)

تیسری نے کہا: ''میرا شوہر لمبا تڑنگا ہے۔ عقل اُس کی ٹخنوں میں ہے۔ بولتی ہوں تو طلاق دی جاتی ہے۔ خاموش رہتی ہوں تو بھی لٹکی رہتی ہوں کہ نہ وہ چھوڑتا ہے اور نہ شوہروں کا سا سلوک کرتا ہے۔ وہ مجھے تلوار کی دھار پر چلاتا ہے۔''

چوتھی کہنے لگی: ''میرا شوہر تہامہ کی رات کے مانند صاف شفاف اور معتدل ہے۔ نہ ٹھنڈا، نہ گرم، نہ کوئی خوف ہے اور نہ اکتاہٹ۔''

پانچویں نے کہا: ''میرا شوہر گھر آئے تو تیندوے کی طرح لمبی تان کر سو رہتا ہے۔ (عیب جوئی نہیں کرتا، غلطیوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔) گھر سے باہر ہو تو شیر کی طرح

بہادر۔ کھلے دل کا ایسا کہ اخراجات کے متعلق کبھی نہیں پوچھتا۔''

چھٹی خاتون بولی: ''میرا شوہر کھانے بیٹھ جائے تو سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ پینے لگے تو ایک بوند نہیں چھوڑتا۔ بستر پر آئے تو سارا لحاف خود لپیٹ کر منہ پرے کیے سو جاتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر میرا حال دریافت نہیں کرتا۔''

ساتویں گویا ہوئی: ''میرا شوہر بدھو اور احمق ہے۔ دنیا کی ہر بیماری (عیب) اُس میں موجود ہے۔ تم اُس سے بات کرو گی تو تمھیں گالی دے گا۔ کوئی مذاق (بھولے سے) کر بیٹھو تو اینٹ اُٹھا کر سر پر دے مارے گا۔ ورنہ کوئی ہڈی پسلی توڑ دے گا یا سر بھی پھوڑے گا اور ہڈی بھی توڑے گا۔''

آٹھویں نے کہا: ''میرے شوہر کو چھوؤ تو خرگوش کی طرح نرم و ملائم۔ سونگھو تو زرنب (خوشبودار بوٹی) کی طرح خوشبودار۔ میں اُس پر غالب ہوں (اُس کی نرم مزاجی کی وجہ سے) اور وہ لوگوں پر غالب (اپنی بہادری اور قوت کے بل پر۔)

نویں خاتون کہنے لگی: ''میرے شوہر کی تلوار کا پرتلا لمبا ہے، (وہ دراز قد ہے)۔ اُس کے صحن میں راکھ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، (کثیر تعداد میں مہمان آتے ہیں۔ اُن کا کھانا پکنے میں بہت لکڑیاں جلتی ہیں، یوں بہت راکھ ہوتی ہے)۔ اُس کا گھر دوستوں کی مجلس سے قریب ہے، (وہ گھر والوں کا خیال رکھتا ہے، دوستوں میں جائے تو وقتاً فوقتاً گھر آتا رہتا ہے) جس رات مہمان ہو سیر نہیں ہوتا، (شرمیلا ہے، کہیں مہمان بن کر جائے تو دوسروں کے سامنے کم کھاتا ہے۔) جس رات خوف ہو، سوتا نہیں، (رات کو دشمن کے حملے کا خدشہ ہو تو جاگ کر پہرہ دیتا ہے۔)''

دسویں نے کہا: ''میرے شوہر کا نام مالک ہے۔ تم کیا جانو کہ مالک کون ہے۔ (اس کی بے شمار خوبیوں کا احاطہ ناممکن ہے)۔ مالک سب سے اچھا ہے۔ اُس کے پاس بہت

اونٹ ہیں جو ہمیشہ اپنے باڑوں میں بندھے رہتے ہیں۔ باہر چرنے کا اُنھیں کم ہی موقع ملتا ہے، (بکثرت مہمانوں کی آمد کی وجہ سے ذبح ہوتے رہتے ہیں۔) اونٹ جب آگ جلانے والے کی آواز سنتے ہیں تو اُنھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب اُن کی خیر نہیں۔''

گیارہویں عورت امّ زرع بولی: ''میرا شوہر ابوزرع ہے۔ تم کیا جانو کہ ابوزرع کون ہے۔ اُس نے میرے کان زیورات سے لاد دیے۔ میرے بازو چربی سے بھر دیے، (اُس کے پاس رہتے ہوئے میں خوب کھا پی کر موٹی ہوگئی۔) اُس نے میری اتنی تعریف کی کہ مجھے اپنا آپ بھانے لگا۔ اُس نے مجھے جس گھرانے میں پایا وہ چند چھوٹی چھوٹی بکریوں کا مالک تنگدست کنبہ تھا۔ وہ مجھے (وہاں سے اُٹھا کر) ایسے گھر میں لے آیا جہاں بے شمار جانور ہیں اور (گھوڑوں کے) ہنہنانے اور (اونٹوں کے) بلبلانے کی آوازیں آتی ہیں، (کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ یہ لوگ گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کرتے ہیں۔)

یہاں میں بات کرتی ہوں تو لعن طعن نہیں کی جاتی۔ سوتی ہوں تو دن چڑھے اٹھتی ہوں۔ پینے لگتی ہوں تو اتنا پیتی ہوں کہ پھر پینے کی خواہش نہیں رہتی۔

اور ابوزرع کی والدہ! تم کیا جانو کہ ابوزرع کی والدہ کون ہے اور کیا ہے۔ اُس کے بورے (سُرین) بھاری (فربہ) ہیں، (موٹی تازی اور خوبصورت ہے۔) اس کا گھر کھلا ہے۔

اور ابوزرع کا بیٹا! تم کیا جانو کہ ابوزرع کا بیٹا کون ہے اور کیا ہے۔

تلوار جتنی چوڑی جگہ میں سو جاتا ہے، (چھریرے بدن کا ہے۔)

بکری کے بچے کی دستی سے سیر ہو جاتا ہے، (کم خوراک ہے۔)

اور بنتِ ابوزرع! تم کیا جانو کہ ابوزرع کی بیٹی کون اور کیسی ہے۔

ماں باپ کی فرماں بردار۔ اُس کا موٹا بدن کپڑوں کو بھر دیتا ہے۔ وہ سوتن کا جلاپا ہے، (سوتن اُس کی خوبصورتی اور آسودہ حالی سے جلتی ہے۔)

اور ابوزرع کی خادمہ! تم کیا جانو کہ ابوزرع کی خادمہ کیسی ہے۔
وہ ہماری بات باہر جا کر نہیں بتاتی، نہ ہمارے غلّے سے بے پروائی کرتی ہے اور نہ گھر کوڑے کرکٹ سے بھرتی ہے۔
ایک دن ابوزرع (گھر سے) نکلا۔ مشکوں سے مکھن نکل رہا تھا، (بہار کا خوش گوار موسم تھا۔)
اُس کی ملاقات ایک عورت سے ہوئی جس کے تیندوے جیسے چست و چالاک اور مضبوط دو بچے تھے۔ وہ دونوں اُس کے پہلوؤں میں پڑے دو اناروں (پستانوں) سے کھیل رہے تھے۔ ابوزرع نے مجھے طلاق دے دی اور اُس عورت سے شادی کر لی۔
ابوزرع کے بعد میں نے ایک امیر آدمی سے شادی کی جو ہاتھ میں تلوار تھامے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ اُس نے میرے پاس نعمتوں کے انبار لگا دیے۔ اُس نے مجھے ہر خوشبو کے جوڑے لا کر دیے (کہ خود بھی استعمال کروں اور تحفہ بھی دوں۔) اُس نے کہا: ''ام زرع! کھاؤ پیو اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلاؤ۔'' لیکن میں اُس کی دی ہوئی ہر شے جمع کروں تو وہ ابوزرع کے سب سے چھوٹے برتن کے برابر بھی نہ ہو۔''
(سبحان اللہ! پہلی محبت ناقابل فراموش ہوتی ہے جس کا نقش دل سے مٹائے نہیں مٹتا!)
یہاں یہ قصہ تمام ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے دلچسپی اور غور سے سنا، پھر عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:
''میں تمھارے لیے ویسا ہوں جیسا ابوزرع ام زرع کے لیے تھا۔'' [4]
تو جناب! اس امر پر ہمارا اتفاق ہو گیا کہ لوگوں کو اہمیت دینے اور اُن سے لطافت و الفت کا اظہار کرنے کی بڑی افادیت ہے۔

التفات

”دوسروں کو اہمیت دینا دراصل اپنی اہمیت بڑھانا ہے۔“

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 240/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 4099، و 4104و4106، وصحيح مسلم، حديث: 1802-1805. [3] صحيح البخاري، حديث: 2468. [4] صحيح البخاري، حديث: 5189، وصحيح مسلم، حديث: 2448.

میٹھے بول میں جادو ہے

زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب ہمیں دوسروں کو سمجھانے بجھانے اور نصیحت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جب ہم دوسروں کو سمجھاتے یا نصیحت کرتے ہیں تو دراصل اُن کے دلوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ نصیحت کرتے وقت آپ اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ آپ کا لہجہ تحکمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا اسلوب مشاورانہ ہونا چاہیے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو نمازِ تہجد کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا:

"عبداللہ! تم فلاں کی طرح نہ ہونا۔ وہ رات کو قیام کرتا تھا، پھر اُس نے رات کا قیام ترک کر دیا۔"[1]

آپ دوسروں کو اُن کی غلطی کا احساس یوں دلائیں کہ اُنھیں محسوس بھی نہ ہو۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی کو چھینک آئی تو اُس نے الحمد للہ نہیں کہا۔ ابنِ مبارک رحمہ اللہ نے اُس سے پوچھا:

"جب کوئی آدمی چھینکے تو کیا کہے؟"

اس نے کہا: "الحمد للہ۔"

اس پر عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا: "یرحمک اللہ۔"

رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

آپ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد یکے بعد دیگرے تمام بیگمات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ حال احوال دریافت کرتے، کوئی ضرورت ہوتی تو اُس کا بندوبست کرتے۔

ایک دن عصر کے بعد زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ہاں گئے۔ وہاں شہد پڑا پایا۔ آپ کو میٹھی شے اور شہد بہت پسند تھا۔ آپ شہد کھانے لگے۔ زینب سے باتیں بھی کرتے رہے۔ اس وجہ سے اُن کے ہاں ذرا دیر ہو گئی۔ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو اس پر غیرت آئی۔ اُن دونوں نے طے کیا کہ رسول اللہ ﷺ آئیں تو اُن سے کہنا ہے کہ آپ کے منہ سے مغافیر (کھانے کا گوند جس سے میٹھا شربت بنتا ہے لیکن ہلکی بو آتی ہے) کی بو آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ منہ یا بدن سے بو نہ آئے۔ آپ حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا کھایا ہے۔ آپ نے بتایا کہ زینب کے ہاں سے شہد پیا ہے۔ حفصہ رضی اللہ عنہا بولیں:

"مجھے آپ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔"

آپ نے کہا:

"نہیں، میں نے شہد پیا ہے لیکن آیندہ کبھی نہیں پیوں گا۔"[2]

اُن سے رخصت ہو کر آپ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گئے تو اُنھوں نے بھی وہی طے شدہ باتیں کہیں۔ چند دن گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے سارا معاملہ کھول کر آپ کو بتا دیا۔ ایک دن آپ نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی بات رازدارانہ کہی لیکن اُنھوں نے اُسے افشا کر دیا۔ آپ اُن کے ہاں گئے۔ وہاں شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں جنھوں نے طب سیکھ رکھی تھی اور لوگوں کا علاج کرتی تھیں۔ آپ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو اُن کی غلطی باور کرانے کی خاطر شفا رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''جس طرح تم نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا اُسی طرح اسے چیونٹی کا منتر (رقیہ النملہ) کیوں نہیں سکھاتیں؟''[3]

چیونٹی کا منتر چند بول تھے جو عرب خواتین کہا کرتی تھیں۔ یہ کلام نہ نفع دے سکتا تھا نہ نقصان۔ اس کے بول یہ تھے:

''دلہن تیار ہو رہی ہے۔

مہندی لگا رہی ہے۔

آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی ہے۔

تم ہر کام کرنا لیکن شوہر کی نافرمانی نہ کرنا۔''

ایک اور واقعہ سنیے۔ اسلاف کے کسی بزرگ سے ایک آدمی نے کتاب پڑھنے کے لیے لی۔ چند دن بعد اُس نے کتاب لوٹائی تو اُس پر سالن اور پھلوں وغیرہ کے نشان تھے۔ کتاب کا مالک خاموش رہا۔ کچھ عرصے بعد وہی آدمی پھر ایک کتاب لینے آ گیا۔ اُن بزرگ نے اُسے کتاب ایک پلیٹ میں رکھ کر پیش کی۔

''مجھے صرف کتاب چاہیے۔'' اُس نے کہا۔ ''اس پلیٹ کی کیا ضرورت ہے؟''

اُنھوں نے جواب دیا:

''کتاب اس لیے کہ آپ اسے پڑھیں اور پلیٹ اس لیے کہ آپ اس میں کھانا اور سالن وغیرہ رکھ لیا کریں۔''

اُس آدمی نے کتاب لی اور چلا گیا۔

بات اُس تک پہنچ چکی تھی۔

نصیحت کا یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔

مختصر بات

«اَلْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ»

''اچھی بات صدقہ ہے۔''[4]

[1] صحيح البخاري، حديث: 1152، وصحيح مسلم، حديث: 1159. [2] صحيح البخاري، الطلاق، حديث: 5267. [3] سنن أبي داود، حديث: 3887، ومسند أحمد: 372/6. [4] صحيح البخاري، قبل الحديث: 6023.

اختصار سے کام لیں اور جھگڑا نہ کریں

نصیحت کرنے والے کو چاہیے کہ اختصار سے کام لے اور لیکچر جھاڑنے نہ بیٹھ جائے۔

نبوی نصائح پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں کوئی نصیحت ایک یا دو سطروں سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

سماعت کیجیے:

''علی! دوسری نظر نہ ڈالو۔ پہلی نظر معاف ہے، دوسری نہیں۔''[1]

''عبداللہ بن عمر! دنیا میں یوں رہو جیسے کوئی اجنبی یا مسافر رہتا ہے۔''[2]

''معاذ! واللہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم ہر نماز کے بعد یہ کلمات ضرور کہا کرو: ''اے اللہ! اپنے ذکر و شکر اور حسنِ عبادت پر میری مدد فرما۔''[3]

''عمر! آپ قوی آدمی ہیں۔ حجر اسود کے پاس دھکم پیل نہ کیا کریں۔''[4]

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے دانش مند صحابہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات مشہور شاعر فرزدق سے ہوئی تو آپ نے اُس سے کہا: ''بھتیجے! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے پاؤں چھوٹے ہیں۔ جنت میں ان کے لیے تو جگہ ہو گی۔ اپنے اشعار میں پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا چھوڑ دو۔''

امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بسترِ مرگ پر تھے۔ لوگ اُن کے آخری دیدار کے لیے

آنے لگے۔ ایک نوجوان آیا اور بولا: ''یا امیر المومنین! خوش ہو جایئے۔ آپ کو اللہ کے رسول کی صحبت میسر رہی۔ اللہ کی بشارت آپ کے ساتھ ہے۔ قدیم سے آپ نے اسلام قبول کر لیا، پھر آپ امت کے ذمہ دار بنے تو عدل و انصاف سے کام لیا۔ اب شہادت مل رہی ہے۔''

اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''امید ہے کہ حساب برابر رہے گا۔ نہ میرے خلاف کوئی بات نکلے گی اور نہ میرے حق میں۔''[1]

نوجوان واپس ہوا۔ اُس کا پاجامہ زمین کو چھو رہا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ گئی۔ آپ نے اُسے بلوایا اور اختصار سے کہا:

''بھتیجے! اپنا کپڑا اٹھا کر رکھو۔ تمھارا کپڑا صاف رہے گا اور رب کا تقویٰ بھی حاصل ہو گا۔''[1]

جہاں تک ممکن ہو جھگڑا مول نہ لیجیے۔ بات پہنچانا مقصد ہے، مناظرہ جیتنا نہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول نے جھگڑا فساد، بحث و تکرار اور مجادلے کی مذمت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا﴾

''اُن لوگوں نے تیرے سامنے یہ مثال صرف اس لیے بیان کی ہے کہ بحث و تکرار کریں۔''[2]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ، إِلَّا أُوتُوا الْجَدَلَ»

''ہدایت آ پہنچنے کے بعد جو قوم بھی گمراہی کی طرف مائل ہوئی اُسے بحث و تکرار

اور جھگڑا فساد کرنے کی صلاحیت دی گئی۔“[8]

نیز فرمایا:

«أَنَا زَعِيمٌ لِّبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْجِدَالَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا»

”میں اس شخص کے لیے جنت کے سائے میں ایک گھر کا ذمہ دار ہوں جو حق پر ہوتے ہوئے بھی بحث وتکرار ترک کر دیتا ہے۔“[9]

نقطۂ نظر

”غلطی سے آگاہ کرتے ہوئے اختصار سے کام لیجیے۔ لیکچر نہ جھاڑیے۔“

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 2149، ومسند أحمد: 357/5. [2] صحيح البخاري، حديث: 6416، وسنن ابن ماجة، حديث: 4114. [3] سنن أبي داود، حديث: 1522، ومسند أحمد: 245/5. [4] مسند أحمد: 28/1، والسنن الكبرى للبيهقي: 80/5. [5] صحيح البخاري، حديث: 3700. [6] صحيح البخاري، حديث: 3700. [7] الزخرف 58:43. [8] جامع الترمذي، حديث: 3253، وسنن ابن ماجة، حديث: 48. [9] سنن أبي داود، حديث: 4800.

لوگوں کی باتوں کی پروانہ کیجیے

اعتراض اور مذمت کرنے کے اعتبار سے بھی لوگوں کے مختلف مزاج ہیں۔ کچھ لوگ واقعی خیر خواہ ہوتے ہیں اور صدقِ دل سے خیر خواہی کرنا چاہتے ہیں لیکن نصیحت کے فن سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نتیجتاً اُن کا انداز آپ کو افسردہ کر دیتا ہے۔ بعض حاسد ہوتے ہیں جن کا مقصد ہی آپ کو دکھ پہنچانا ہوتا ہے۔ بعض ناصحین یونہی جاہل ہوتے ہیں، بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آئے کہتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ خاموش ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔ تنقید بعض لوگوں کی طبیعت کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو ہمیشہ سیاہ عینک سے دیکھتے ہیں۔

روایت ہے کہ جُحا (عربی ادب کا ایک مزاحیہ کردار) گدھے پر سوار تھا اور اُس کا لڑکا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُن کا گزر چند لوگوں کے پاس سے ہوا تو لوگوں نے کہا:

''اس سنگدل باپ کو تو دیکھو۔ خود مزے سے سوار ہے اور بچہ بے چارہ دھوپ میں پیدل چلتا ہے۔''

جُحا نے اُن کی یہ بات سنی تو گدھے سے اترا اور لڑکے کو سوار کر لیا۔ اب وہ دونوں چند لوگوں کے قریب سے گزرے تو ایک نے کہا: ''اس بدطینت لڑکے کو تو دیکھو۔ خود سوار ہے اور باپ دھوپ میں پیدل چل رہا ہے۔''

اب جُحا خود بھی لڑکے کے ساتھ گدھے پر سوار ہو گیا۔

لوگوں نے کہا:

''ان بے رحم انسانوں کو دیکھو۔ انھیں بے چارے جانور پر ترس نہیں آتا۔''

جُحا نے لڑکے سے کہا: ''بچے! اتر جاؤ۔'' اور خود بھی اتر گیا۔

اس پر لوگوں نے کہا: ''ان بے وقوفوں کو دیکھو۔ پیدل چل رہے ہیں جبکہ سواری ساتھ ہے۔ گدھا آخر کس لیے ہے؟''

جُحا چیخا۔ لڑکے کو ساتھ لیا اور دونوں نے مل کر گدھے کو سر پر اٹھا لیا۔

میں جُحا کے پاس ہوتا تو کہتا:

''پیارے! لوگوں کی باتوں کی پروا نہ کر۔ جو جی میں آئے کر۔ لوگوں کو خوش کرنا ناممکن ہے۔''

تجربہ

''ایک دانا کا قول ہے: ''جس شخص نے دوسروں کی باتوں میں ٹانگ اڑانا اور خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں پڑنا اپنی عادت بنا لی وہ کبھی ایک جگہ ٹِک کر نہیں رہ سکتا۔''

مسکراؤ......، پھر مسکراؤ......، مسکرائے جاؤ

میں اسے سالہا سال سے جانتا ہوں۔

وہ میرا رفیقِ کار ہے۔

یقین کیجیے میں ابھی تک یہ نہیں جانتا کہ اس کے منہ میں دانت بھی موجود ہیں کہ نہیں! ہمیشہ سے تُرش رُو، چیں بہ جبیں، گویا مُسکرا دیا تو عمر کم ہو جائے گی یا پیسے تھوڑے رہ جائیں گے۔

جریر بن عبداللہ بَجلی رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جب بھی دیکھا مسکرا کر ہی دیکھا۔[1]

مسکراہٹ کی کئی قسمیں اور درجے ہیں۔

ایک ہے دائمی بشاشت اور تازگی، یوں کہ آپ کا چہرہ ہمیشہ ہنستا مسکراتا اور خوشی سے دمکتا رہے۔

مثال کے طور پر آپ اسکول کے استاد ہیں اور اپنی کلاس کے کمرے میں جاتے ہیں تو تازہ اور خوش باش چہرے سے طلبہ کے سامنے آئیں۔ آپ ہوائی سفر کے لیے ہوائی اڈے جاتے ہیں اور ہوائی جہاز تک پہنچنے کے لیے گزرگاہ پر چلتے ہیں، لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس حالت میں مسرور نظر آنے کی کوشش کریں۔ شاپنگ سنٹر یا

گیس اسٹیشن پر جاتے ہیں تو روپوں کی ادائیگی کرتے وقت مسکرائیں۔

یا آپ کسی محفل میں بیٹھے ہیں۔کوئی آدمی آکر شامل ہوتا ہے۔ بلند آواز سے سلام کہتا ہے اور حاضرینِ محفل پر طائرانہ نظر ڈالتا ہے تو مسکرائیں۔

آپ کسی محفل میں شرکت کرتے ہیں اور سب سے ہاتھ ملاتے ہیں تو اپنے چہرے پر مُسکراہٹ لائیں۔

غصہ کافور کرنے، شک کے جذبات اور تذبذب کی کیفیت دور کرنے میں مسکراہٹ کی ایسی تاثیر ہے جس میں دوسری کوئی شے اس کی شریک وسہیم نہیں۔ بہادر وہ ہے جو اپنے جذبات پر حاوی ہو اور بدترین حالات میں بھی مسکرانا نہ چھوڑے۔

ایک دن نبی ﷺ کسی کام سے جا رہے تھے۔انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ نبی ﷺ نے موٹے کناروں والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ راستے میں ایک اعرابی دونوں کے پیچھے چلتا ہوا آیا۔ وہ نبی ﷺ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو نبی ﷺ کی چادر کا پلّو اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے چادر کو ایک جھٹکے سے کھینچا۔ انس رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں اس بدّو نے چادر اس شدت سے کھینچی کہ نبی ﷺ کی گردن پر رگڑ کے نشان پڑ گئے۔

یہ بدّو کیا چاہتا تھا؟ آپ سوچتے ہوں گے وہ کسی نہایت ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوگا۔

شاید اس کا گھر جل رہا تھا اور وہ مدد مانگنے آیا تھا؟

یا اس کے قبیلے کو مشرکین کی طرف سے کسی حملے کا اندیشہ تھا اور وہ اُن کے خلاف تعاون حاصل کرنے آیا تھا؟

نہیں، ایسا بالکل نہیں تھا۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا: ''اے محمد! (یہاں غور طلب پہلو یہ ہے کہ اس نے احتراماً اے اللہ کے رسول نہیں کہا) بلکہ نہایت درشت لہجے میں بولا: ''اے محمد! تمھارے پاس جو اللہ کا مال ہے، اس میں سے مجھے بھی کچھ دو۔''

رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا اور ''مسکرا دیے۔'' پھر حکم دیا کہ اسے کچھ دیا جائے۔[2]

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ ایک بہادر انسان تھے۔ اس نوع کا برتاؤ انھیں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی باتوں پر نہ آپ کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا اور نہ آپ ان کا بدلہ لیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ حد درجہ نرم دل تھے۔ آپ قوی اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ بدترین حالات میں بھی مسکراتے رہتے۔ کام کرنے سے قبل اس کے انجام پر غور کرتے۔ اندازہ کیجیے اگر رسول اللہ ﷺ اس اعرابی سے بگڑ جاتے یا اسے دھتکار دیتے تو نتیجہ کیا نکلتا۔ کیا ایسا رویہ اختیار کرنے سے نبی ﷺ کی گردن کا زخم ٹھیک ہو جاتا؟ یا بدّو تقاضا کرنے کا ڈھنگ سیکھ جاتا؟

اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور نفی ہی میں ہے تو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایسے حالات سے نپٹنے کے لیے صبر و تحمل، برداشت، بردباری، حسنِ ظن اور ٹھہراؤ سے بڑھ کر کوئی شے نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے سچ ہی کہا تھا:

«لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ»

''طاقتور وہ نہیں جو ہمیشہ (دوسروں پر) غالب آئے۔ طاقتور صرف وہ ہے جو غصے

کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔“[3]

نبی کریم ﷺ کے بابرکت چہرے کی مسکراہٹ اور بشاشت دیکھ کر عوام و خواص آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

مسلمان غزوۂ خیبر کے لیے روانہ ہوئے۔ اثنائے جنگ میں چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کچھ چربی تھی اور گھی سے بھری ایک مشک یہود کے قلعے کی فصیل پر سے نیچے آ رہے۔ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اُنھیں اٹھا لیا اور کندھے پر لاد خوشی خوشی اپنے خیمے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں اُنھیں ایک آدمی ملا جو مالِ غنیمت جمع کرنے اور اسے ترتیب دینے پر مامور تھا۔

اس نے تھیلا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا:

”لاؤ اسے میرے حوالے کرو۔ میں اسے مسلمانوں میں تقسیم کروں گا۔“

عبداللہ نے اسے اپنی بغل میں دبا لیا: ”نہیں، اللہ کی قسم! یہ میں تمھیں نہیں دوں گا۔ یہ مجھے ملا ہے۔“

اس نے کہا: ”اس سے انکار کس کو ہے کہ یہ تمھیں ملا ہے۔“

دھینگا مُشتی جاری تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے ان دونوں کو تھیلا اپنی اپنی طرف کھینچتے ہوئے دیکھا تو مسکرا دیے، پھر غنائم پر مامور آدمی سے کہا:

”تیرا باپ نہ رہے! عبداللہ اور تھیلے کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔“

اس پر اس آدمی نے وہ تھیلا عبداللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ عبداللہ اسے لے کر خیمے میں اپنے ساتھیوں کے پاس آ گئے، پھر سب نے مِل کر اس میں موجود چربی پکائی اور کھائی۔[4]

آخر میں نبی ﷺ کی ایک حدیث سن لیجیے:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»

''تمھارا اپنے بھائی کے منہ پر مسکرانا بھی صدقہ ہے۔''[5]

اسوہ

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے جب بھی دیکھا مسکرا کے دیکھا۔''

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3035. 2 صحيح البخاري، حديث: 3149. 3 صحيح البخاري، حديث: 6114، وصحيح مسلم، حديث: 2609. 4 السيرة النبوية لابن هشام: 354/3. 5 جامع الترمذي، حديث: 1956.

ریڈ لائن

وہ یونیورسٹی میں میرا طالب علم تھا۔
اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔
لوگوں سے میل جول بڑھانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔
لیکن اس کا مزاج لوگوں کے لیے ناروا تھا۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور بولا: ''یا دکتور! میرے ہم جماعت ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ وہ میرا مذاق برداشت نہیں کرتے۔''

میں نے اس سے سوال کیا: ''وہ تمھارا مذاق کیوں نہیں سہتے؟ کوئی مثال دے کر واضح کرو۔''

کہنے لگا: ''ایک کو چھینک آئی تو میں نے کہہ دیا: ''اللہ تم پر لعنت کرے۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اُسے غصّہ آیا تو میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا: ''ابلیس کے بچے! اور اللہ تم پر رحم کرے۔''

آہ...... کتنا سنگین اور ناقابلِ برداشت مذاق ہے یہ!!

وہ بے چارہ اس وجہ سے اپنے آپ کو خوش طبع خیال کیے ہوئے تھا۔ لوگ آپ کی اٹکھیلیاں اور آپ کا مذاق جتنا بھی برداشت کر لیں لیکن بہر حال ایک ریڈ لائن ہوتی ہے

جسے پار کرنا لوگ مذاقاً بھی پسند نہیں کرتے۔ خاص طور پر جب ایسا کسی محفل میں ہو۔ بعض افراد اس بات کا خیال نہیں رکھتے، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کا بے جا اور حد سے بڑھا ہوا مذاق بعض اوقات لوگوں کی اشد ضروریات کے سلسلے میں بھی انھیں ظلم و زیادتی کا شکار کر جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کا کوئی دوست بے پروائی سے آپ کا موبائل فون اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور یونہی کوئی نمبر ملا کر بات شروع کر دیتا ہے، یا آپ کے موبائل فون کے ذریعے سے ایسے افراد کو پیغامات ارسال کرتا ہے جو آپ کو ناپسند ہیں اور آپ نہیں چاہتے کہ وہ آپ کے فون نمبر سے مطلع ہوں، یا آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی گاڑی لے اُڑتا ہے، یا جب تک آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اجازت نہ دے دیں وہ اصرار کر کے آپ سے گاڑی مانگتا رہتا ہے۔ یا مثلاً یونیورسٹی کے چند طالبِ علم ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ ایک طالبِ علم یونیورسٹی جانے کے لیے علی الصبح بیدار ہوتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا کوٹ فلاں پہن گیا ہے اور اس کا جوتا فلاں کے پیروں میں ہے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ بعض لوگ کسی ایسی محفل میں جہاں عوام کی کثیر تعداد موجود ہو، کوئی گھناؤنا مذاق یا کوئی بے تکا سوال کر کے اپنے دوست یا ساتھی کو پریشان کر دیتے ہیں۔ ایسی حرکت بھی ریڈ لائن سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے۔

کوئی شخص آپ سے کتنی ہی محبت کرتا ہو اور آپ سے اس کا رشتہ کیسا ہی گہرا اور اٹوٹ ہو، وہ بہر حال ایک انسان ہے۔ وہ اگر کسی بات سے راضی ہوتا ہے تو اسے غصہ بھی آ سکتا ہے۔ وہ اگر خوش ہوتا ہے تو کسی معاملے میں تلخ روئی بھی اختیار کر سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ تبوک سے مدینہ واپس آئے۔ اسی مہینے عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ آپ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اپنی قوم ثقیف کے ایک عالی مقام اور جلیل القدر سردار تھے۔

مدینہ پہنچنے سے قبل ہی وہ رسول اللہ ﷺ سے جا ملے اور مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے آپ سے اجازت چاہی کہ وہ لوٹ جائیں اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔

رسول اللہ ﷺ نے خدشہ ظاہر کیا کہ عُروہ کی قوم اُنھیں گزند پہنچائے گی۔ آپ نے اُن سے کہا:

''وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ ثقیف ایک تند خو اور سخت مزاج قوم ہے۔ غرور و تکبر اس کے قوام کا حصہ ہے۔ اپنی نخوت کے آگے وہ اپنے بلند مرتبہ سردار کی بڑائی کو بھی خاطر میں نہیں لائے گی۔

عُروہ نے اطمینان دلایا: ''اے اللہ کے رسول! میں انھیں ان کی کنواری عورتوں اور ان کے تمام شرفاء سے زیادہ پیارا ہوں۔''

عروہ واقعی اپنی قوم کے محبوب و مقتدا تھے۔

چنانچہ وہ انھیں اسلام کی طرف بلانے کا عزم لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ عروہ کو امید تھی کہ قوم اپنے درمیان ان کی عظمت اور بڑائی کی وجہ سے ان کی مخالفت نہیں کرے گی۔

وہ اپنی قوم کی آبادی میں پہنچے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر انھیں پکارا۔ وہ سب جمع ہو گئے۔ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو اُن کے سردار تھے، انھیں اسلام کی دعوت دی اور بتایا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ عروہ بار بار کہتے رہے: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ سُن کر اُن کی قوم نے غُل مچانا شروع کر دیا۔ وہ اس بات پر مشتعل ہو گئے کہ ان سے ان کے خداؤں کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہر طرف سے عروہ پر تیروں کی بارش کر دی۔ عروہ شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کے عم زادے بھاگے بھاگے

ان کے پاس آئے۔ عروہ دم توڑ رہے تھے۔ چچازاد بھائیوں نے کہا:

''عروہ! اپنے خون کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا ہم آپ کے خون کا بدلہ لیں؟''

عروہ نے جواب دیا: ''یہ تو ایک شرف ہے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے۔ یہ شہادت ہے جس سے اللہ نے مجھے ہمکنار کیا ہے۔ میرے متعلق وہی بات ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ہمراہی میں قتل کیے جانے والے شہداء کے متعلق تھی۔ آپ میری خاطر کسی کو قتل نہ کرنا اور نہ کسی سے میرا بدلہ لینا۔'' کہا جاتا ہے جب نبی ﷺ کو عروہ کے شہید ہونے کی خبر دی گئی، آپ نے فرمایا:

''اپنی قوم کے اندر عروہ (سورۂ) یٰس والے آدمی کے مانند تھے۔'' [1]

اس لیے ہوشیار رہیں۔

لوگوں کے اپنے اپنے احساسات اور جذبات ہوتے ہیں۔ آپ ان کے کتنا ہی قریب ہوں، ان کے ساتھ برتاؤ میں یا خوش طبعی کرتے ہوئے اپنی حد میں رہنے کی کوشش کریں اور زیادہ جرأت و بے باکی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ریڈ لائن سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ افراد کی عزتِ نفس مجروح نہ کریں، چاہے اُن کے دلوں میں آپ کی کیسی ہی قدر و منزلت ہو اور خواہ خاندانی حیثیت یا رشتے کے اعتبار سے وہ آپ سے کم تر اور چھوٹے ہی ہوں۔ نبی ﷺ نے اس کی سخت تاکید کی اور مومن کو گھبراہٹ میں ڈالنے سے منع کیا ہے۔

ایک دن آپ صحابۂ کرام کے ہمراہ محوِ سفر تھے۔ ہر آدمی کے پاس اس کا ذاتی سامان، اسلحہ، بستر اور کھانا وغیرہ موجود تھا۔

قافلے نے کسی منزل پر پڑاؤ کیا۔ ایک آدمی سویا تو اس کا ساتھی ہنسی مذاق میں اس کے رسے کی طرف بڑھا اور اسے اٹھا لیا۔ وہ آدمی جاگا تو اسے اپنا سامان کم لگا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اپنا رسّا ڈھونڈنے چلا گیا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

”ایک مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو مضطرب کردے۔“[2]

ایک اور واقعے میں صحابۂ کرام نبی ﷺ کی معیت میں سفر کررہے تھے۔ ایک آدمی کو سواری پر بیٹھے بیٹھے اونگھ آگئی۔ ساتھی نے موقع پاکر اس کے ترکش سے ایک تیر اڑا لیا۔ اس آدمی کو کھٹک گیا کہ کوئی اس کے ہتھیاروں سے چھیڑ چھاڑ کررہا ہے۔ وہ ڈر کے مارے جاگ اُٹھا۔

اس پر اللہ کے پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

”کسی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ ایک مسلمان کو پریشان کرے۔“[3]

یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو آپ سے یہ سمجھ کر مذاق کرتا ہے کہ یوں وہ آپ کو خوشی دے گا، حالانکہ وہ آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور آپ کے دل کو اضطراب اور کرب سے بھر دیتا ہے۔ آپ اپنی گاڑی کسی دکان پر کھڑی کرکے دکان میں داخل ہوتے ہیں، آپ کے دوست کو مذاق سوجھتا ہے۔ وہ کھیل کھیل میں آپ کی گاڑی چلا کر دور لے جاتا ہے۔ آپ پریشان ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گاڑی چوری ہوگئی جبکہ دراصل آپ انجانے میں اپنے دوست کے مذاق کا نشانہ بن چکے ہوتے ہیں۔ آپ کو حقیقت کا پتا چلتا ہے تو ہنس کر ٹال دیتے ہیں جبکہ اندر سے سینہ فگار ہوتا ہے اور آپ پیچ و تاب کھا رہے ہوتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

وَلَرُبَّمَا صَبَرَ الْحَلِيمُ عَلَى الْأَذَى
وَفُؤَادُهُ مِنْ حَرِّهِ يَتَأَوَّهُ

”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متحمل مزاج آدمی تکلیف پر صبر کرلیتا ہے جبکہ اس کا دل تکلیف کی سوزش سے آہ آہ کررہا ہوتا ہے۔“

وَلَرُبَّمَا شَكَّلَ الْحَلِيمُ لِسَانَهُ
حَذَرَ الْكَلَامِ وَإِنَّهُ لَمُفَوَّهُ

''اور عام طور پر بُردبار انسان بات سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی زبان مقید کر لیتا ہے جبکہ وہ بڑا باتونی ہوتا ہے۔''

نقطۂ نظر

''ہر وہ چیز جو حد سے بڑھ جائے، نقصان دہ ہوتی ہے۔ کئی مذاق ہاتھا پائی پر ختم ہوتے ہیں۔''

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4/192,191. [2] سنن أبي داود، حديث: 5004، وجامع الترمذي، بعد الحديث: 2159. [3] مجمع الزوائد: 6/254.

رازداری

پرانی کہاوت ہے: ''ہر وہ راز جو دو سے تجاوز کر جائے، پھیل جاتا ہے۔''

پوچھا گیا کہ دو سے کیا مراد ہے تو جواب آیا کہ دو سے مراد دونوں ہونٹ ہیں۔

میری عمر پینتیس سال ہے۔ ان پینتیس سالوں میں آج تک مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی آدمی کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ کر اس سے راز داری کی درخواست کی ہو اور اس نے چند موٹی موٹی قسمیں کھا کر مجھے یقین نہ دلایا ہو کہ تمھارا راز ایک ایسے کنویں میں ڈال دیا گیا ہے جس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں۔

اسی طرح مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کسی نے میرا راز سن کر صاف صاف کہہ دیا ہو کہ ''محمد بھائی! معاف کرنا، میں آپ کے راز کو راز نہیں رکھ سکوں گا۔''

اس کے برعکس ہر وہ شخص جسے آپ اپنا راز بتا رہے ہوں، سینے پر ہاتھ مار کر کہے گا: ''قسم ہے ربِّ ذوالجلال کی! لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں...... یا میری گردن پر تلوار رکھ کر کہیں کہ میں تمھارا راز افشا کر دوں تو بھی نہ بتاؤں گا۔''

پھر آپ اس کی باتوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور بھروسا کر کے اسے اپنے اسرار سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ وہ مہینہ دو مہینے بمشکل صبر کرتا ہے، پھر آپ کا راز کھول دیتا ہے۔

رازلوگوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور گھومتا گھامتا آپ تک جا پہنچتا ہے۔ دراصل قصور لوگوں کا نہیں، قصور آپ کا ہے۔ ابتدا آپ ہی نے کی۔ یہ کیونکر مناسب تھا کہ آپ کا راز آپ کے ہونٹوں کے حدود پار کر جاتا۔

لوگوں پر اتنا بوجھ ڈالنا چاہیے جتنا وہ اٹھا سکتے ہوں۔

إِذَا ضَاقَ صَدْرُ الْمَرْءِ عَنْ سِرِّ نَفْسِهِ
فَصَدْرُ الَّذِي يَسْتَوْدِعُ السِّرَّ أَضْيَقُ

''جب آدمی کا سینہ اپنے ہی راز کے لیے تنگ پڑ جائے تو اس شخص کا سینہ جسے وہ یہ راز سپرد کرے، زیادہ تنگ ہوگا۔''

خود میں نے کئی لوگوں کو آزمایا اور اُنھیں ایسا ہی پایا ہے۔ آپ ان کے پاس کسی معاملے میں مشورہ کرنے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو مشورہ دے دیتے ہیں، پھر آپ کا راز فاش کر دیتے ہیں اور آپ کی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ آپ کو ان سے شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے:

''معرکۂ بدر سے قبل جب رسول اللہ ﷺ نے یہ سنا کہ شام سے قریش کا ایک قافلہ آرہا ہے تو آپ نے اس پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ آپ اپنے اصحاب کے ہمراہ قافلے کی جانب روانہ ہوئے۔ قافلے کے رہبر ابوسفیان کو مسلمانوں کی پیش قدمی کا پتا چلا تو اس نے ضمضم بن عمرو نامی ایک شخص کو اجرت پر مکے روانہ کیا اور کہا کہ فوراً جاؤ اور قریش کو صورتِ حال سے آگاہ کرو۔ ضمضم نہایت برق رفتاری سے مکہ روانہ ہوا۔ مکہ پہنچنے کے لیے اسے کئی دنوں کا سفر طے کرنا تھا۔ اُدھر اہلِ مکہ کو درپیش خطرے کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس دوران ایک رات عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔ صبح ہوئی تو اس نے اپنے بھائی عباس بن عبدالمطلب کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو اس نے کہا: ''یا اخی،

واللہ! میں نے آج رات ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے گھبرا دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں اس خواب کے بعد آپ کی قوم پر کوئی مصیبت نہ آن پڑے۔ جو کچھ میں آپ سے کہوں اسے راز رکھیے گا اور کسی کو نہ بتایئے گا۔

عباس نے کہا: ''ہاں! ٹھیک ہے! اب بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے؟''

عاتکہ بولی: ''میں نے ایک شتر سوار آتے دیکھا۔ وہ آیا اور وادیِ ابطح میں ٹھہر کر باآوازِ بلند پکارا: ''سنو، ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ۔''

پھر میں دیکھتی ہوں کہ لوگ اس آدمی کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس کے بعد وہ چلتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے مسجد میں آ گئے۔ دریں اثنا کہ لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے تھے، اس کا اونٹ اپنے سوار کو لیے کعبہ کی چھت پر جا چڑھا۔ کعبہ پر کھڑے ہو کر اس آدمی نے پھر وہی اعلان کیا: ''ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ۔''

پھر وہ آدمی اونٹ پر سوار جبلِ ابوقبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ وہاں بھی اس نے وہی الفاظ دہرائے: ''ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ۔''

پھر اس نے ایک چٹان اٹھائی اور پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دی۔ چٹان لڑھکتی ہوئی پہاڑ کے دامن میں پہنچی تو ریزہ ریزہ ہو کر کنکروں میں بٹ گئی اور مکہ کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں چٹان کا کوئی کنکر نہ گرا ہو۔''

خواب سن کر عباس بے قرار ہو گئے اور کہا: ''بخدا! یہ ایک اہم خواب ہے۔''

پھر انھیں خدشہ ہوا کہ خواب کی بات کھل جائے گی، چنانچہ انھوں نے عاتکہ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا: ''تم بھی اس خواب کو پیٹ میں رکھنا اور کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔''

پھر عباس خواب کے متعلق بے فکر ہو گئے۔ گھر سے نکلے تو راستے میں ان کا دوست

ولید بن عتبہ انھیں ملا۔ عباس نے سارا خواب ولید کو کہہ سنایا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی کہ اسے پوشیدہ ہی رکھنا اور کسی کو اس کی خبر نہ کرنا۔ ولید چلا گیا۔ اس کی ملاقات اپنے بیٹے عتبہ سے ہوئی تو اس نے خواب عتبہ کو بتا دیا، پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عتبہ نے اپنے چند ساتھیوں کو بھی خواب سے مطلع کر دیا۔ ہوتے ہوتے سب لوگوں کو خواب کا پتا چل گیا اور بات اہلِ مکہ میں پھیل گئی، حتیٰ کہ قریش کی عام محفلوں میں بھی عاتکہ کے خواب کا تذکرہ ہونے لگا۔ چاشت کے وقت عباس کعبہ کا طواف کرنے گئے۔ ابوجہل کعبہ کے سائے میں قریش کی ایک ٹولی میں بیٹھا تھا۔ وہ لوگ عاتکہ کے خواب کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

ابوجہل نے عباس کو دیکھا تو کہا: ''ابوالفضل! طواف سے فارغ ہو جاؤ تو ہماری طرف آنا۔'' عباس کو حیرانی ہوئی کہ ابوجہل کو ان سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ انھیں بالکل توقع نہ تھی کہ ابوجہل ان سے عاتکہ کے خواب کے حوالے سے کوئی بات پوچھے گا۔ بہرکیف عباس نے طواف مکمل کیا اور ابوجہل کی مجلس کی جانب بڑھے۔ قریب آ کر ان کے درمیان بیٹھ گئے۔

ابوجہل نے ان سے کہا: ''بنوعبدالمطلب! یہ نبیہ (نبی عورت) تم میں کب پیدا ہوئی ہے؟

عباس نے پوچھا: ''کیا مطلب؟''

اس نے کہا: ''وہ خواب جو عاتکہ نے دیکھا ہے۔''

اس پر عباس ذرا گھبرائے اور انجان بنتے ہوئے سوال کیا: ''کیا دیکھا ہے عاتکہ نے؟''

ابوجہل بولا: ''بنوعبدالمطلب! کیا اس بات سے تمھارا دل نہیں بھرا تھا کہ تمھارے مرد نبوت کا دعویٰ کریں؟ اب تمھاری عورتیں بھی نبی ہونے کا دعویٰ کرنے لگی ہیں۔ عاتکہ کہتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے، ایک آدمی کہہ رہا تھا: ''ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اندر اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ۔'' ٹھیک ہے ہم تین دن انتظار کرتے ہیں۔ اگر یہ

بات سچ ہوئی تو ایسا ہو کر رہے گا۔ اور اگر تین دن گزرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم تم لوگوں کے متعلق ایک تحریر لکھیں گے کہ تم عرب کا سب سے جھوٹا خاندان ہو۔"

یہ سن کر عباس بہت پریشان ہوئے اور کوئی جواب نہ دیا، تاہم انھوں نے خواب کی تردید کی اور اس بات کا انکار کیا کہ عاتکہ نے کچھ دیکھا ہے، پھر مجلس برخاست ہوگئی ہے۔ عباس گھر آئے تو بنی عبدالمطلب کی تمام خواتین ان کے پاس نہایت غصے کی حالت میں آئیں اور ہر ایک نے یہی کہا: "اس فاسق خبیث (اشارہ ابوجہل کی طرف تھا) نے تمھارے مردوں کی بے عزتی کی اور تم چپ رہے۔ اب وہ تمھاری عورتوں کی بے عزتی کرنے پر اتر آیا ہے اور تم خاموش کھڑے سنتے رہتے ہو۔ تم لوگوں میں غیرت وحمیت نام کی بھی کوئی شے ہے کہ نہیں؟"

لعنت ملامت سن کر عباس نے جوش اور غیرت میں آ کر کہا: "واللہ! ابوجہل نے دوبارہ ایسی بات کی تو میں اس کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

عاتکہ کے خواب کے تیسرے روز عباس مسجد میں آئے۔ وہ غصے میں تھے۔ مسجد میں انھوں نے ابوجہل کو دیکھا تو اس کے درپے ہوئے کہ وہ اپنی بات واپس لے۔ ابوجہل نے عباس کے تیور دیکھے تو مسجد سے دوڑ لگا دی۔ عباس کو اس کی برق رفتاری پر بڑا تعجب ہوا۔ وہ تو آج ابوجہل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ عباس نے دل ہی دل میں کہا: "اللہ اس پر لعنت کرے! اسے کیا ہوا؟ کیا یہ میری سرزنش کے ڈر سے بھاگا ہے؟"

راستے میں ابوجہل کو ضمضم بن عمرو غفاری کی آواز سنائی دی جسے ابوسفیان نے اہلِ مکہ سے مدد مانگنے بھیجا تھا۔ ضمضم اونٹ پر سوار وادی میں شور مچاتا پھر رہا تھا۔ اس نے اونٹ کی ناک کاٹ رکھی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ ضمضم نے اپنا گریبان چاک کیا اور

چلایا: ''اے اہلِ قریش! تجارتی قافلہ، تجارتی قافلہ، ابوسفیان کے پاس تمھارے مال و متاع پر محمد اور اس کے ساتھی حملہ کرنے والے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ تم وقت پر پہنچ کر انھیں روک لو گے۔''

پھر ضمضم پوری طاقت سے چیخا: ''مدد، مدد۔''

اہلِ قریش نے فی الفور تیاری کی اور نکل کھڑے ہوئے۔ بدر کے معرکے میں جو شکست اور ذلّت ان کا مقدر بنی وہ سب کو معلوم ہے۔[1]

یہاں غور طلب پہلو یہ ہے کہ غیر معمولی احتیاط کے باوجود راز ایک لمحے میں جنگل کی آگ کے مانند پھیل گیا۔

اسی نوع کا ایک اور واقعہ سماعت کیجیے۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انھوں نے چاہا کہ یہ بات پھیل جائے اور سب لوگ جان لیں کہ عمر مسلمان ہو گیا ہے۔ وہ قریش کے ایک آدمی کے پاس گئے جو ہر بات کا ڈھنڈورا پیٹنے میں مشہور تھا اور اس سے کہا: ''اے فلاں، میں تمھیں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ اسے پوشیدہ رکھنا اور کسی سے نہ کہنا۔''

وہ بولا: ''کیا بات ہے؟''

عمر نے کہا: ''میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ ہوشیار رہنا۔ اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔''

یہ کہہ کر عمر واپس ہو گئے۔ ابھی وہ اس آدمی کی نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے لوگوں میں پھر پھر کر ہر ایک سے کہنا شروع کر دیا:

''کچھ خبر ہے؟ عمر مسلمان ہو گیا ہے۔ جانتے ہو عمر مسلمان ہو گیا ہے؟''[2]

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انس رضی اللہ عنہ کو کسی کام سے بھیجا۔

راستے میں انھیں ان کی والدہ ملیں۔ انھوں نے انس سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے تجھے کس کام سے بھیجا ہے؟

انس نے جواب دیا: ''واللہ! میں رسول اللہ ﷺ کا راز افشا نہیں کروں گا۔''[3]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابِ کرام کو راز داری کی تربیت دی تا کہ وہ امورِ خلافت کی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہو سکیں۔

انس رضی اللہ عنہ صغر سنی ہی میں حفظِ اسرار کے اس اصول پر سختی سے کار بند تھے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی ہوئی آئیں۔ اُن کی چال ہو بہو نبی ﷺ جیسی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مرحبا کہا اور انھیں اپنے دائیں یا بائیں بٹھا لیا، پھر آپ نے چپکے سے فاطمہ سے کوئی بات کہی۔ وہ سن کر رو پڑیں۔ میں نے ان سے کہا:

''کیوں روتی ہو؟''

رسول اللہ ﷺ نے پھر ان سے کوئی بات راز دارانہ کہی تو وہ ہنس پڑیں۔ میں نے کہا: ''میں نے ایسی خوشی آج تک نہیں دیکھی جو غم سے اتنی قریب ہو۔'' میں نے فاطمہ سے پوچھا کہ نبی ﷺ نے ان سے کیا کہا تھا۔ انھوں نے صاف جواب دیا: ''میں رسول اللہ ﷺ کا راز فاش نہیں کر سکتی۔''

نبی ﷺ کی وفات کے بعد میں نے فاطمہ سے پوچھا تو انھوں نے بتایا: ''رسول اللہ ﷺ نے پہلی بات یہ کہی تھی کہ جبریل مجھ سے سال میں ایک بار قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ انھوں نے دو بار قرآن کا دور کیا ہے۔ ان کے اس فعل سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ میرا وقت اب قریب آ گیا ہے۔ تم میرے گھرانے میں سب سے پہلے مجھ سے ملو گی۔ یہ سن کر میں رو پڑی۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں پسند نہیں کہ اہل جنت یا مومنین کی عورتوں

کی سردار (سیدہ) بنو۔'' اس پر میں ہنس دی۔[4]

جس قدر آپ راز کو راز رکھنا سیکھیں گے لوگ اسی قدر آپ پر اعتماد کریں گے اور آپ کے لیے اپنے دلوں کے قفل کھولیں گے۔ ان کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا اور وہ آپ کو ثقہ و امانت دار سمجھیں گے۔

اس لیے نفس کو اپنے راز روک کر رکھنے اور دوسروں کے اسرار کی حفاظت کرنے کا عادی بنائیں۔

اہلِ دانش کا قول

''جس نے تمھارا راز جان لیا اس نے گویا تمھیں اسیر کر لیا۔''

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 219/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 386/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 2482. [4] صحيح البخاري، حديث: 3623، وصحيح مسلم، حديث: 2450.

حاجت براری

جن دنوں میں نے ایم۔اے کے مقالے کی تیاری کا آغاز کیا، ادیان و مذاہب کی بیشتر کتب میری نظر سے گزریں۔ اس ضمن میں جن مذاہب کی تاریخ کا میں نے بغور مطالعہ کیا ان میں سے ایک ''براجماتی مذہب'' تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہم اسے ''مفاد پرست'' یا ''خود غرض'' مذہب کہہ سکتے ہیں۔ اس مذہب کو میں نے گہرائی سے پڑھا تو مجھے ادراک ہوا کہ ہم امریکی یا یورپی معاشرے کے متعلق ایسی باتیں کیوں سنتے ہیں کہ ان کے ہاں عموماً بیٹا باپ کو چھوڑ جاتا ہے۔کسی جگہ دونوں کا آمنا سامنا ہو جائے تو ہر ایک اپنا دفاع کرتا ہے۔

فی الواقع جب مجھے آپ سے کوئی فائدہ نہیں ملتا تو میں آپ کے کام کیوں آنے لگا؟ میں اپنا پیسہ کیوں لٹاؤں؟ اپنا وقت کس لیے ضائع کروں؟ بغیر کسی مادی منفعت کے اپنی کوشش کیوں صرف کروں؟

اسلام نے یہ ترازو الٹ دیا ہے۔

اللہ نے اپنی کتاب میں کہا:

﴿وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

''اور اچھائی کرو، بلاشبہ اللہ اچھائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

اللہ کے رسول ﷺ نے کہا:

«لَئِنْ أَمْشِي مَعَ أَخِي فِي حَاجَةٍ حَتّٰى أُثْبِتَهَا لَهُ، أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَعْتَكِفَ فِي مَسْجِدِي هٰذَا شَهْرًا»

''اگر میں اپنے بھائی کے کسی کام آجاؤں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں اپنی اس مسجد میں ایک ماہ اعتکاف کروں۔''[2]

اور کہا:

«وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ، كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ»

''جو اپنے بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کے کام میں لگا رہتا ہے۔''[3]

رسول اللہ ﷺ راستے میں چل رہے ہوتے، کوئی لونڈی آپ کو ٹھہرا لیتی اور کہتی: ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' تو آپ کھڑے ہو کر اس کی بات سنتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ آپ اس کے ساتھ اس کے آقا کے ہاں چلے جاتے اور اس کا مسئلہ حل کراتے۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں سے میل جول رکھتے اور ان کے مصائب و آلام پر صبر کرتے تھے۔ آپ کا لوگوں سے برتاؤ نہایت رحیمانہ تھا۔ آپ انھیں اور اپنے آپ کو جسد واحد سمجھتے تھے۔ غریب کی غربت، غمزدہ کے غم، مریض کے مرض اور محتاج کی محتاجی کا احساس رکھتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں بیٹھے صحابۂ کرام سے باتوں میں مشغول تھے کہ دور سے چند لوگ آتے دکھائی دیے۔ وہ فقراء و مساکین تھے جو نجد کی جانب سے آئے تھے۔ اُن کا تعلق قبیلۂ مضر سے تھا۔ ناداری کی انتہا یہ تھی کہ انھیں کپڑے سلائی کرنے کو سوئی دھاگا بھی میسر نہیں تھا اور انھوں نے کپڑے درمیان سے

چاک کر کے گردنوں میں لٹکا رکھے تھے۔ تلواریں ان کے پاس تھیں۔ اس ایک کپڑے کے علاوہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی تہبند، عمامہ، شلوار یا چادر نہیں تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ عریانی، تنگدستی اور بھوک دیکھی تو آپ کا رنگ فق ہو گیا۔ فوراً کھڑے ہوئے، گھر تشریف لے گئے لیکن ان لوگوں کے لیے کوئی شے نہ ملی۔ آپ اس گھر سے نکلے اور دوسرے گھر میں داخل ہو گئے۔ ادھر بھی کچھ نہیں تھا، پھر مسجد کی طرف چل پڑے۔ ظہر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا: اما بعد، اللہ نے اپنی کتاب میں یہ آیت اتاری ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝﴾

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناتے توڑنے سے بچو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔''[1]

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ (بھال) لے کہ کل (قیامت) کے لیے اس نے (اعمال کا) کیا (ذخیرہ) بھیجا ہے۔ اور (ہر وقت) اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔''[2]

آپ اسی طرح آیات سنا سنا کے نصیحت کرتے رہے، پھر فرمایا:

''صدقہ کرو، اس سے پہلے کہ تم صدقہ نہ کر سکو۔ صدقہ کرو، اس سے پہلے کہ تمھیں صدقہ کرنے سے روک دیا جائے۔ ہر آدمی اپنے درہم و دینار، گندم اور جو کا صدقہ کرے اور کوئی صدقے کی کسی چیز کو حقیر نہ جانے۔''

پھر آپ صدقے کی انواع گنواتے رہے، آخر میں فرمایا:

''صدقہ کرو، خواہ آدھی کھجور ہی کا ہو۔'' اس پر انصار کا ایک آدمی اپنے ہاتھ میں تھیلی لیے کھڑا ہوا۔ اس نے وہ تھیلی منبر پر رسول اللہ ﷺ کو پکڑا دی۔ آپ کے مبارک چہرے پر خوشی کے آثار دکھائی دیے۔

آپ نے فرمایا:

''جس نے کوئی اچھی سنت جاری کی اور اس پر عمل کیا گیا تو اسے اس کا اور ان افراد کا اجر بھی ملے گا جنھوں نے اس پر عمل کیا لیکن ان کے اپنے اجر میں بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے کوئی بُری سنت جاری کی اور اس پر عمل کیا گیا تو اس کا گناہ اور ان لوگوں کا گناہ جنھوں نے اس پر عمل کیا، اسی پر ہوگا۔ ان لوگوں کے اپنے گناہ بھی کم نہیں ہوں گے۔''[1]

مجلس برخاست ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو گئے اور صدقات لے کر آئے۔ کوئی ایک دینار لے کر آیا تو کوئی ایک درہم۔ کوئی ایک کھجور لایا اور کوئی کپڑے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو ڈھیر لگ گئے۔ ایک ڈھیر کھانے پینے کی اشیاء کا اور دوسرا کپڑوں کا۔ یہ منظر دیکھ کر آپ کا چہرہ دمکنے لگا گویا چاند کا ٹکڑا ہو۔ آپ نے یہ سارا سامان انھی فقراء میں تقسیم کر دیا۔ جی ہاں! رسول اللہ ﷺ لوگوں کی ضروریات پوری کر کے ان کے دل جیت لیتے تھے۔ آپ اُن کے لیے اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی کوشش صرف کرتے تھے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے گھر میں رسول اللہ ﷺ کی مصروفیت کے متعلق پوچھا گیا تو

انھوں نے جواب دیا:

''آپ گھر کے کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔''

آپ بھی لوگوں کی ضروریات پوری کر کے اور ان کے کام آ کے اس راستے سے ان کے دلوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ کسی بیمار کو ہسپتال جانا ہو تو آپ اسے ہسپتال چھوڑ سکتے ہیں۔ کوئی آدمی اپنی کسی الجھن میں آپ سے مدد کا طالب ہو اور اس کا خیال ہو کہ آپ اس کی الجھن دور کر سکتے ہیں تو اس کی مدد ضرور کیجیے۔ بے لوث ہو کر اس کے کام آیئے۔ وہ آپ سے محبت کرے گا، آپ کے لیے دعا گو رہے گا اور جب کبھی آپ کو ضرورت پڑے گی آپ کی مدد کو آئے گا۔

کسی عرب شاعر نے کہا تھا:

أَحْسِنْ إِلَى النَّاسِ تَسْتَعْبِدْ قُلُوبَهُمْ

فَطَالَمَا اسْتَعْبَدَ الْإِنْسَانَ إِحْسَانُ

''لوگوں سے اچھائی کرو، تم ان کے دلوں کو اپنا غلام بنا لو گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ احسان انسان کو اپنا بنا لیتا ہے۔''

ایک عربی کہاوت بھی اسی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے:

«اَلْإِنْسَانُ عَبْدُ الْإِحْسَانِ»

''انسان احسان کا بندہ ہے۔''

ایک نظر اِدھر بھی

”جو دوسروں کے لیے جیتا ہے وہ مشقت تو ضرور اٹھاتا ہے لیکن زندگی بھر لوگ بڑا آدمی ہونے کی حیثیت سے اسے عزت دیتے اور مرنے کے بعد بھی یاد کرتے ہیں۔“

---

1 البقرة 2:195. 2 المعجم الكبير للطبراني: 12/453، حديث: 13646. یہ حدیث ضعیف ہے۔ 3 صحيح البخاري، حديث: 2442، وصحيح مسلم، حديث: 2580. 4 النسآء 4:1. 5 الحشر 59:18. 6 صحيح مسلم، حديث: 1017، و السنن الكبرى للبيهقي: 4/176، حديث: 7835. 7 صحيح البخاري، حديث: 676.

جو کام نہیں کر سکتے اس کا ذمہ نہ لیجیے

ایک صاحب جن سے میرا تعلق خاطر تھا، بڑے با اخلاق، دیندار اور عقل مند انسان تھے۔ وہ اپنے گھر کے پہلو میں واقع ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو ان کی مذمت کرتے اور برا بھلا کہتے سنا تھا۔ مجھے ان باتوں پر تعجب ہوتا اور ان کا کوئی مناسب جواب نہ مل پاتا۔

ایک دن ان کا پڑوسی میرے ہاں آیا اور کہنے لگا: ''یا شیخ! آپ کا دوست ہمیں نماز پڑھاتا ہے اور نہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔''

اس نے کہا: ''مجھے نہیں معلوم، البتہ امام وہی ہے۔ اس کے باوجود وہ اکثر مسجد سے غائب رہتا ہے۔'' میں ان صاحب کی طرف سے جنھیں وہ میرا دوست کہہ رہا تھا، عذر گھڑنے لگا: ''ہوسکتا ہے وہ کسی ضروری کام سے جاتا ہو۔ عین ممکن ہے وہ گھر پر موجود ہی نہ ہو۔''

وہ بولا: ''یا شیخ! اس کی گاڑی دروازے پر کھڑی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ گھر ہی پہ ہے لیکن امام ہوتے ہوئے بھی نماز باجماعت میں حاضر نہیں ہوتا۔''

مجھے ان صاحب سے ہمدردی تھی۔ میں ان کی خیر خواہی کرنا چاہتا تھا اور ان کی اس کوتاہی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ معمولی تگ و دو کے بعد مجھے ان کی مسجد سے غیر حاضری کی

وجہ معلوم ہو گئی۔ وہ صاحب چونکہ مسجد کے امام تھے، لوگ اپنی ضروریات لے کر ان کے پاس آتے اور مدد کے طالب ہوتے تھے۔

مثال کے طور پر کوئی مقروض آتا جو ایسے آدمی کی تلاش میں ہوتا جو اس کا قرض ادا کر دے۔ یا کوئی طالب علم سیکنڈری اسکول پاس کر کے آتا اور یونیورسٹی میں داخلے کے لیے سفارش کی درخواست کرتا۔ کوئی مریض آتا جو کسی ہسپتال میں داخل ہونے کے لیے ان کی اعانت کا خواست گار ہوتا۔ کسی کے گھر بن بیاہی بیٹیاں یا بہنیں بیٹھی ہیں اور وہ ان کے لیے مناسب بَر کی تلاش میں آتا۔ کوئی گھر کرائے پر لے کر اس کی ادائیگی کے متعلق پریشان ہوتا۔ کوئی طلاق وغیرہ کے بارے میں فتوے کا کاغذ لیے آتا کہ امام صاحب مفتیِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوں اور فتویٰ لے کر آئیں۔ (واضح رہے کہ سعودی عرب میں مساجد کے ائمہ کو بلند معاشرتی مقام حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کی تمام مساجد کا انتظام و انصرام حکومت کی ذمہ داری ہے۔)

لوگ قطار اندر قطار اپنی ضروریات کے سلسلے میں ان کے پاس آتے رہتے اور وہ جو معمولی صلاحیتوں کے حامل ایک معمولی انسان تھے جن کے نہ تو تعلقات اتنے وسیع تھے اور نہ شخصیت ہی ایسی بارعب تھی، بے چارے شرم و حیا اور مروّت کے مارے معذرت کرنے کے بجائے ہر ایک سے وعدہ فرماتے جاتے کہ اس کا کام ہو جائے گا۔

لوگ مقررہ وقت پر ان کے پاس آتے۔ وہ معذرت کر کے انھیں پھر کسی وقت آنے کے لیے کہہ دیتے۔ اور حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ لوگوں سے بھاگتے پھر رہے تھے۔ کسی کا فون نہ اٹھاتے اور اکثر گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ سرِ راہ کسی ستم رسیدہ سے آمنا سامنا ہو جاتا تو اول وہ ان کے خوب لتے لیتا۔ یہ عذر پیش کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرتے تو وہ کہتا: ”ٹھیک ہے، آپ درست کہتے ہوں گے لیکن مجھے بتائیے، میرا کیا قصور تھا؟ مجھ سے

آپ نے وعدہ کیوں کیا تھا؟ مجھ سے اتنی امیدیں کیوں بندھوائی تھیں؟''
کوئی کہتا: ''مجھے آپ سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تو میں نے دوسروں کو چھوڑ کر صرف آپ پر بھروسا کیا۔''

مجھے ان کے احوال سے کچھ واقفیت ہوئی تو میں نے اندازہ لگایا کہ انھوں نے اپنے فائدے کی خاطر ایک گڑھا کھودا جس میں وہ خود گر چکے ہیں۔ ایک بار میں نے انھیں کسی صاحب سے معذرت کرتے ہوئے سُنا، وہ نہایت لجاجت سے کہہ رہے تھے: ''مجھے بہت افسوس ہے، میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔'' جبکہ وہ صاحب غصے میں گرج رہے تھے: ''ٹھیک ہے، آپ نے میرا وقت کیوں ضائع کیا؟ آپ مجھے پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟''

تب مجھے یہ حکمت بھرا قول بہت یاد آیا: ''ابتدا میں معذرت کر لینا آخر میں معذرت کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔'' ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں سے واقف ہو اور ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔

اللہ بھی ہماری تربیت اسی نہج پر کرنا چاہتا ہے۔ کتاب اللہ میں لکھا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔''[1]

کتاب اللہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر مرقوم ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ﴾

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی شے کی جو اللہ نے اسے عطا کی ہے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس بات سے منع کیا ہے کہ آدمی وہ کام اپنے ذمے لے جسے انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ مجھے ذاتی طور پر اس امر کا تجربہ ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ الریاض کی ملٹری اکیڈمی میں ایک بار میں نے لیکچر دیا تھا۔ لیکچر کے اختتام پر ایک

نوجوان میرے پاس آیا اور بولا: ''ایک بہت ضروری موضوع پر میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''جی، فرمایئے۔''

اس نے کہا: ''نہیں، اب نہیں۔ آج وقت کم ہے۔ آیندہ کسی روز میں آپ سے ملاقات کروں گا۔'' وہ موضوعِ گفتگو کو اس کے حجم سے بڑھ کر اہمیت دیتا رہا اور میں اطمینان سے اس کی ڈینگیں سنتا رہا۔

دوسری بہت سی باتوں کی طرح زندگی نے مجھے یہ بھی سکھایا ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو ان کے سائز سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے ایسے بہت سے افراد کا مشاہدہ کیا ہے جنھیں ادنیٰ ضرورت بھی درپیش ہو تو اسے پورا کیے بنا وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔

نوجوان نے مجھ سے کہا: ''جہاں تک مجھے معلوم ہے کل فلاں شہر میں آپ کا لیکچر ہے جو الریاض سے 200 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا:

''میں وہاں لیکچر کے بعد آپ سے ملوں گا۔''

مجھے اس کا جوش و خروش دیکھ کر ایک گونہ تعجب ہوا۔

اگلے روز واقعی میں لیکچر دے کر نکلنے لگا تو وہ نوجوان نظر آیا۔ وہ بھاگتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اسے لے کر ایک طرف ہو گیا۔

میں نے گرم جوشی سے کہا: ''آیئے آیئے! اللہ آپ کے شوق میں اضافہ کرے۔ فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

وہ گویا ہوا: ''یا شیخ! میرا ایک بھائی ہے جس کے پاس میٹرک کی سند ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے کوئی ملازمت دلا دیں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا: ''بس، یہی بات تھی؟

وہ بولا: ''جی، بس یہی بات تھی۔''

وہ نوجوان بہت پُر امید تھا۔ میرا دل بھی اس کی مدد کرنے کو چاہ رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا بھائی واقعی مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ میں اس سے کوئی وعدہ کر بیٹھا تو پورا نہیں کر سکوں گا۔ اس دور میں لوگ بی۔ اے کی ڈگری کو نہیں پوچھتے۔ میٹرک کی سند پر کسی کو کیا نوکری مل سکتی تھی۔ میرے اختیارات کس حد تک ہیں، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے صورتِ حال پیچیدہ تھی۔ میری دِلی تمنا تھی کہ میرے پاس اختیار ہوتا تو میں اس بے چارے کی ضرور کوئی نہ کوئی مدد کرتا۔ لیکن بہر صورت میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اسے مناسب انداز سے ٹالنا چاہا تاکہ اس کے جذبات مجروح نہ ہوں اور بات بھی اس کی سمجھ میں آ جائے۔

میں نے کہا: ''بھائی! بات یہ ہے کہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا بھائی میرا بھی بھائی ہے۔ جس طرح آپ اس کے لیے فکرمند ہیں ویسے میں بھی فکرمند ہوں۔ اس کے باوجود میں آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے معاف کر دینا بھائی۔''

اس نے کہا اور امید کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا:

''یا شیخ! کوشش تو کیجیے۔''

''بھائی! میں نے کہا نا کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا مجھے تھماتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے جنابِ شیخ! یہ کاغذ اپنے پاس رکھیے۔ اس میں ہمارے فون نمبر ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ملازمت نظر آئے تو ہمیں بتا دیجیے گا۔''

معاً مجھے ادراک ہوا کہ وہ مجھے امید کی رسی سے باندھے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ میرے فون کا انتظار کرے گا۔ خود بھی آرزو مند ہوگا اور اپنے بھائی کو بھی امید و بیم کی سولی پر لٹکائے رکھے گا۔

میں نے امید کی یہ رسی کاٹتے اور اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا:

"بلکہ یہ کاغذ آپ اپنے پاس رکھیے۔ اور یہ لیجیے میرا فون نمبر۔ آپ کو کوئی ملازمت نظر آئے تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ ہوسکتا ہے میں اس سلسلے میں سفارش وغیرہ کر کے آپ کی مدد کرسکوں۔"

نوجوان چند ثانیے خاموش رہا۔ میں انتظار میں تھا کہ وہ مجھے الوداع کرے۔ لیکن اس نے مجھے خوشگوار حیرت میں ڈالتے ہوئے کہا:

"اللہ آپ کا چہرہ روشن رکھے۔ واللہ یا شیخ! پچھلے برس میں نے اپنے بھائی کے بارے میں شاہی خاندان کے ایک فرد سے بات کی تھی۔ انھوں نے کاغذ تو لے لیا مگر آج تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ ایک بار میں نے میجر جنرل صاحب سے بات کی تو انھوں نے بھی کاغذ لے لیا۔ لیکن مجھ سے رابطہ نہیں کیا اور نہ اس بات کو کوئی اہمیت دی۔ یہ لوگ غریبوں کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ اللہ ان سے انتقام لے گا............ اللہ۔"

وہ ان پر بددعائیں کرنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اگر کاغذ لے لیا ہوتا تو بددعائیں لینے والا تیسرا شخص میں ہوتا۔

جی ہاں! ابتدا ہی میں معذرت کر لینا وعدہ خلافی کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر ہم اپنے اختیارات کے حدود میں رہتے ہوئے لوگوں سے صاف اور سیدھی بات کہہ دیا کریں اور لوگوں ہی پر کیا موقوف، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے گھر بار کی چھوٹی موٹی ضروریات میں بھی ہمیں اس اصول سے سرِ مو انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

ایسا عموماً ہوتا ہو گا کہ آپ گھر سے نکلتے ہیں اور پیچھے سے بیگم صاحبہ پکارتی ہیں:
''دودھ لیتے آیئے گا! چینی ختم ہو چکی ہے! یا پھر!! آج رات کھانا نہیں پکے گا، باہر سے لیتے آیئے گا، وغیرہ وغیرہ۔'' اس موقع پر لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نہ کہیے کہ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیتا آؤں گا، باوجودیکہ آپ کو یقین ہو کہ آپ یہ کام انجام نہیں دے سکیں گے۔ بلکہ آپ بھی پکار دیجیے:
''میں نہیں لا سکوں گا۔''

اس وقت صاف صاف جواب واپسی پر جھوٹے عذر تراشنے سے بہتر ہو گا کہ وقت کم تھا، دکانیں بند تھیں یا میں بھول گیا تھا۔

یہی طرزِ عمل اپنے ساتھیوں، رفقائے کار اور اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی رکھیے۔

میرا خیال ہے جو بات میں آپ کے ذہن میں بٹھانا چاہتا ہوں وہ آپ تک بخوبی پہنچ چکی ہو گی۔

نچوڑ

''شروع میں معذرت کر لینا اخیر میں عذر تراشنے سے بدرجہا بہتر ہے۔''

---

1 البقرۃ 286:2. 2 الطلاق 7:65.

بلی کو لات کس نے ماری؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے پوری کہانی سن لیجیے۔

وہ ایک بداخلاق اور ترش رُو باس کا بدنصیب و ناہنجار سیکرٹری تھا۔ باس لوگوں سے تعامل کے طریقوں سے یکسر ناواقف تھا۔ اُس نے دفتر کے بیشتر کام سیکرٹری کے ذمّے ڈال رکھے تھے۔ اتنا بوجھ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

ایک روز باس نے سیکرٹری کو پکارا۔ وہ آیا اور کھڑے کھڑے مؤدبانہ عرض کی:

''جی جناب! فرمایئے؟''

باس نے گرج کر کہا: ''میں نے آپ سے رابطے کے لیے آپ کے دفتر فون کیا تھا۔ آپ نے فون نہیں اٹھایا۔''

سیکرٹری عاجزی سے بولا: ''جناب! میں ساتھ والے دفتر میں تھا۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کا فون نہیں سن سکا۔''

باس نے نہایت اکتاہٹ سے چیخ کر کہا: ''ہر وقت مجھے افسوس ہے! مجھے افسوس ہے! کیا بکواس ہے یہ! یہ کاغذات پکڑیے اور شعبۂ سیکورٹی کے نگران کو دے کر جلدی واپس آیئے۔''

سیکرٹری جو روز روز کی اس جھک جھک سے تنگ آ چکا تھا، شعبۂ سیکورٹی کے دفتر پہنچا

اور کاغذات نگران کی میز پر ڈالتے ہوئے بولا: ''ہمارا کام جلدی کر دیجیے گا۔''

وہ آدمی بھی سیکرٹری کے طریقِ کار سے اکتا چکا تھا۔ اس نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ انھیں ترتیب سے رکھ دیجیے۔'' سیکرٹری کو غصہ آ گیا۔ وہ بولا: ''ترتیب! ترتیب! بس آپ جلد از جلد ان کاغذات کو نمٹا دیجیے۔'' دونوں میں جھگڑا ہوا۔ خوب تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ معاملہ ٹھنڈا ہوا تو سیکرٹری اپنے دفتر چلا آیا۔ دو گھنٹے کے بعد شعبۂ سیکورٹی سے تعلق رکھنے والا نچلے درجے کا کوئی ملازم نگران کے دفتر آیا اور بولا:

''جناب! میں اپنے بیٹے کو اسکول سے لے آؤں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔''

نگران جو پہلے ہی سیکرٹری سے جھگڑا کر چکا تھا، پوری قوت سے چلایا: ''آپ روز ہی چلے جاتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا: ''جناب! میں دس سال سے متواتر اپنے بچوں کو اسکول سے لینے جاتا ہوں۔ آج پہلی بار آپ نے اعتراض کیا ہے۔''

''آپ سختی ہی کے لائق ہیں۔ نرمی آپ کو راس نہیں آتی۔ اپنے دفتر جائیے۔''

ملازم بے چارہ نگران کے رویے پر حیران اپنے دفتر جا بیٹھا۔ اس نے اسکول فون کیا کہ اس کے بچوں کو کسی ذریعے سے گھر پہنچا دیا جائے۔ لیکن وہ معصوم خاصی دیر دھوپ میں کھڑے رہے۔ آخر اسکول کے ایک استاد نے انھیں گھر پہنچایا۔ شام کو چھٹی کے بعد ملازم اپنے گھر آیا۔ نگران کے ساتھ ہونے والی بدمزگی کا رنج اور غصہ ابھی تک باقی تھا۔ اس کا چھوٹا بیٹا بھاگا بھاگا اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھلونا تھا۔

''بابا! یہ کھلونا مجھے ٹیچر نے دیا ہے کیونکہ میں نے......''

''دفع ہو جاؤ اپنی ماں کے پاس۔'' باپ نے غصے سے اُسے دھکا دیتے ہوئے ڈانٹا۔

بچہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کی پیاری بلی اس کی طرف آئی اور اپنی عادت کے مطابق اس کے پیروں میں لوٹنے لگی۔ بچے نے اسے ایسی لات رسید کی کہ وہ

اڑتی ہوئی دیوار سے جاٹکرائی۔

یہاں میرا سوال ہے کہ بلی کو لات کس نے ماری؟

میرا خیال ہے آپ مسکرا کر جواب دیں گے: ''باس نے۔''

بالکل درست، باس ہی نے بلی کو لات ماری ہے کیونکہ وہی دباؤ میں آکر اپنے سیکرٹری پر پھٹ پڑا تھا۔ آخر ہم کاموں کی مناسب تقسیم کا فن کیوں نہیں سیکھتے؟

جو کام آپ نہیں کر سکتے جرأت کر کے کہہ دیں کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ بالخصوص جب آپ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کے بد اثرات اُن لوگوں تک بھی پہنچتے ہیں جو اس سلسلے میں ذرہ برابر قصوروار نہیں ہوتے۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ آپ کو مجبور کریں اور آپ پر دباؤ ڈالیں، پھر آپ ان سے ایسے وعدے کر بیٹھیں جنھیں پورا کرنا آپ کے بس میں نہ ہو۔

اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ مدینہ چلیں، جہاں رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی مبارک مجلس میں تشریف فرما ہیں۔ دین کی بات پھیل چکی ہے۔ عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اسلام کا چرچا ہے۔ ربّ العالمین کی وحدانیت کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ قبائل کے رؤسا بھی گروہ در گروہ توحید کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مدینہ وارد ہو رہے ہیں۔ زیادہ تر اطاعت کا اقرار کر کے اور مسلمان ہو کر آرہے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام کی بالادستی اور حقانیت کو قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

انھی لوگوں میں عرب کا ایک بڑا رئیس عامر بن طفیل بھی مدینے آتا ہے۔ اس کی قوم نے روز بروز اسلام کی بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر اس سے کہا تھا: ''عامر! لوگ جوق در جوق اسلام لا رہے ہیں۔ آپ بھی مسلمان ہو جائیں تو بہتر ہے۔''

عامر نے جو ایک متکبر اور بالادست سردار ہے، جواب دیا تھا: ”واللہ! میں نے قسم کھائی ہے کہ اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک عرب مجھے اپنا بادشاہ تسلیم نہ کرلیں اور میرے نقشِ قدم پر نہ چلنے لگیں، پھر میں قریش کے اس جوان کی پیروی کروں؟“

پھر جب عامر بن طفیل نے اسلام کی تمکنت اور اس کا جاہ وجلال اور رسول اللہ ﷺ کی طرف لوگوں کا میلان دیکھا تو اپنی اونٹنی پر سوار ہوا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ نبی کریم ﷺ کی ملاقات کو مدینے روانہ ہوگیا۔ مدینہ پہنچ کر مسجد میں رسول اللہ ﷺ سے ملا اور کہا: ”محمد! میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔“ رسول اللہ ﷺ اس قسم کے افراد سے محتاط رہتے تھے۔ آپ نے کہا:

”نہیں، اللہ کی قسم، حتی کہ آپ اللہ واحد پر ایمان لے آئیں۔“

اس نے پھر وہی مطالبہ کیا: ”محمد! میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے پھر انکار کر دیا۔

وہ یہی کہتا رہا: ”محمد! میرے ساتھ چلیں، میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، میرے ساتھ چلیں، میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

آخر رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ ہو لیے۔ عامر نے جلدی سے اپنے ایک ساتھی اربد کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کے ساتھ مل کر عامر نے پہلے سے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ عامر نے اِربد سے کہا: ”میں محمد کو اپنی طرف مشغول رکھوں گا۔ تم موقع پا کر تلوار کا وار کر دینا۔“

اِربد تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھے مستعد ہوگیا، پھر وہ دونوں دیوار کے ساتھ علیحدگی میں چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ عامر سے بات چیت کرنے ان کے پاس آئے۔ اِربد کا ہاتھ بدستور تلوار کے دستے پر تھا۔ وہ جب بھی تلوار سونتنا چاہتا، اس کا ہاتھ شل ہونے لگتا۔

آخر تک وہ تلوار میان سے نہ نکال سکا۔ اُدھر عامر رسول اللہ ﷺ کو باتوں میں مصروف رکھنے کی کوشش میں تھا اور اِربد کو دیکھ رہا تھا جو جامد و بے بس کھڑا تھا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے بھی مڑ کر اِربد کو دیکھا۔ آپ نے عامر سے کہا:

''عامر! اسلام قبول کر لیجیے۔''

اس نے کہا: ''محمد! میں اسلام قبول کر لوں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟''

آپ نے صاف جواب دیا:

''آپ کو وہی کچھ ملے گا جو مسلمانوں کو ملتا ہے اور آپ پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں پر ہیں۔''

عامر بولا: ''میں اسلام قبول کر لوں تو آپ مجھے اپنے بعد بادشاہت دیتے ہیں؟''

نبی ﷺ نے چاہا کہ عامر سے کوئی ایسا وعدہ نہ کریں جو بعد میں پورا نہ ہو سکے۔ آپ اسے صاف صاف اور جرأت مندانہ جواب دے رہے تھے۔ آپ نے کہا:

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ یا آپ کی قوم کو سرداری نہیں ملے گی۔''

عامر نے اپنے مطالبے میں قدرے تخفیف کرتے ہوئے کہا: ''پھر ایسا کرتے ہیں، میں اہلِ بادیہ کا بادشاہ ہوں گا اور آپ اہلِ شہر کے۔''

آپ ﷺ کا وہی صاف اور کورا جواب تھا: ''نہیں۔''

اس پر جوشِ غضب سے عامر کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ چلایا:

''محمد! اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میں تمھارے اس شہر کو برق رفتار گھوڑوں اور نوجوان جنگجوؤں سے بھر دوں گا۔ میں یہاں کی ہر کھجور سے ایک گھوڑا باندھوں گا اور غطفان کے ایک ہزار بھورے گھوڑوں اور اتنی ہی بھوری گھوڑیوں کے ہمراہ تم پر حملہ آور ہوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتا اور دھمکیاں دیتا ہوا مسجد سے نکل گیا۔

رسول اللہ ﷺ اسے جاتا دیکھتے رہے، پھر آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور دعا کی:

''اے اللہ! عامر کے متعلق مجھے بے فکر کر دے اور اس کی قوم کو ہدایت نصیب فرما۔''[1]

عامر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے نکل کر اپنی قوم کے دیار کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا مصمم ارادہ تھا کہ اپنے علاقے میں پہنچ کر ایک زبردست لشکر تیار کرے گا اور مدینہ پر چڑھائی کر دے گا۔ راستے میں آرام کی غرض سے سلولیہ نامی ایک عورت کے خیمے میں ٹھہرا جو اس کی قوم سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ ایک فاحشہ عورت تھی جسے لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کے ہاں ٹھہرنے والے شخص کو بھی لوگ فاسق و فاجر گردانتے تھے۔ عامر کو سفر کی تکان اتارنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ملی تھی، اس لیے وہ مجبوراً سلولیہ کے ہاں جا اترا اور اس کے خیمے میں پڑ کر سو رہا۔ اسی اثنا میں عامر کی گردن پر ایک گلٹی نکل آئی۔ ایسی گلٹی عموماً اونٹ کی گردن پر ظاہر ہوتی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔ گلٹی دیکھ کر عامر گھبرایا اور بے حد پریشان ہوا۔ وہ ورم کے مقام کو چھوتا اور کہتا:

''اونٹ کی گلٹی جیسی ایک گلٹی! اور سلولیہ کے گھر میں موت!!''

یعنی نہ موت عزت کی ہے اور نہ جگہ کی کوئی قدر و منزلت۔

عامر کی تمنا تھی کہ وہ میدانِ جنگ میں سورماؤں کی تلواروں سے قتل ہوتا۔ مگر یہ کیا! وہ ایک فاحشہ کے گھر میں حیوانوں کی بیماری سے مر رہا تھا۔ اس کے نزدیک یہ بڑی ذلت آمیز موت تھی۔ وہ چیخ پکار کرنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''میرا گھوڑا لاؤ۔''

گھوڑا حاضر کیا گیا۔ وہ ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ نیزہ ہاتھ میں تھاما۔ گھوڑا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس نے اپنی گردن کو پکڑ رکھا تھا اور درد کی شدت سے

چلا رہا تھا:

«غُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَعِيرِ وَمَوتٌ فِي بَيْتِ سَلُولِيَّةٍ»

''اونٹ کی گلٹی جیسی ایک گلٹی اور سلولیہ کے گھر میں موت!!۔''

اس کا گھوڑا چکراتا رہا۔ موت نے عامر کو مزید مہلت نہ دی اور وہ گھوڑے پر بیٹھا جہنم واصل ہوا۔ عامر کے ساتھیوں نے اس کی لاش وہیں چھوڑی اور اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔ قوم کی آبادی میں پہنچے تو لوگوں نے آگے بڑھ کر اِربد سے پوچھا:

''اِربد! پیچھے کی کیا خبر ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''خبر کیا ہوتی! محمد نے ہمیں کسی شے کی بندگی کرنے کی دعوت دی ہے۔ کاش وہ اس وقت میرے پاس ہوتا تو میں تیر مار کر اسے قتل کر دیتا۔''

یہ بات کہنے کے ایک یا دو دِن بعد اِربد اپنا ایک اونٹ لے کر روانہ ہوا جسے وہ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اور اس کے اونٹ پر بجلی گرادی جس نے ان دونوں کو بھسم کر ڈالا۔ [2]

جی ہاں! ہمیشہ وہی وعدہ کریں جس کے متعلق آپ کو پورا یقین ہو کہ اللہ کی توفیق سے آپ اسے نبھا سکیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

ایسا کوئی کام اپنے ذمّے مت لیں جسے انجام دینے پر آپ قادر نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کام سے معذرت کرتے ہوئے بہتر سے بہتر انداز اختیار کیا جائے۔

مثال کے طور پر آپ کے پاس کوئی آدمی یہ درخواست لے کر آتا ہے کہ آپ اس کے بھائی کو کوئی ملازمت دلا دیں کیونکہ آپ کا والد یا بھائی یا آپ خود کسی اونچے عہدے پر فائز ہیں اور آپ کو اندازہ ہے کہ آپ اس کی مدد نہیں کر سکیں گے تو معذرت کرتے وقت

صدقِ دل سے ایسا اسلوب اختیار کیجیے جس سے اس شخص کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ پہنچے اور اسے احساس ہو کہ آپ بھی اس کے بھائی کے لیے اتنے ہی فکر مند ہیں جتنا وہ خود ہے۔ مثلاً آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ کے بھائی کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ لیکن اس وقت میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، اس لیے میرا عذر قبول کریں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے بھائی کا مسئلہ حل کرے۔

یہ باتیں کہتے ہوئے ایک لطیف مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے رکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ گفتگو کے اس خوبصورت اور موثر انداز سے اسے اتنی ہی خوشی ہو گی جتنی خوشی اسے اس کا کام ہونے پر ہوتی۔

نقطۂ نظر

”اپنے ضمیر سے معاملہ صاف رکھیں۔ لوگوں سے معاملات طے کرتے ہوئے جرأت مندانہ موقف اختیار کریں۔ اپنی صلاحیتیں پہچانیں اور ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں۔“

---

[1] مجمع الزوائد:126/6۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:4/213-216۔

تواضع وانکسار

ایک دفعہ میں رؤسائے شہر کی ایک پُر وقار محفل میں موجود تھا۔ ایک رئیس زادے نے دورانِ گفتگو کہا: ”میں ایک مزدور کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں تردد میں پڑ گیا، پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کر لیا۔“ اس نے بڑی رعونت سے کہا۔ ”حالانکہ میں عموماً اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔“

مجھے رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل یاد آ گیا۔ کوئی عام سی لونڈی بھی آپ کو راستے میں روک کر اپنے آقا کے ظلم یا کام کی زیادتی کی شکایت کرتی تو آپ اس کے مالک سے سفارش کرنے اس کے ساتھ چل پڑتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ»

”جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔“[1]

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا: ”فلاں آدمی متکبر ہے۔ فلاں خود پسند ہے۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے لوگ اسے ناپسند کرتے اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“

آپ کسی ضرورت مند سے پوچھیں: ”آپ اپنے مسئلے کے حل میں اپنے پڑوسی سے مدد کیوں نہیں لیتے؟“ تو وہ جواب دیتا ہے: ”وہ بڑا متکبر ہے۔ وہ تو مجھ سے سیدھے منہ بات کرنے کا روادار نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ اس سے مدد لوں۔“

واقعی وہ لوگ قابل نفرت ہیں جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے اور لوگوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ شخص بھی مسترد کیے جانے کے قابل ہے جو خود پسندی کا شکار ہے۔

وہ شخص جو لوگوں کے سامنے کلا پھلاتا اور زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتا ہے، قابلِ گردن زدنی ہے۔ اور وہ شخص بھی جو مزدوروں، نوکروں اور فقراء و مساکین پر رعب جھاڑتا اور ان سے ذلت آمیز سلوک کرتا ہے، مردود ہے۔

رسول اللہ ﷺ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ ان راستوں سے گزرے جہاں آپ کو اذیتیں دی گئیں، مذاق اڑایا گیا۔ انھی راستوں پر آپ نے بارہا یہ آوازے بھی سنے: ''ابے او پاگل، او جادوگر، کاہن کہیں کے، جھوٹے مکار۔''

آج آپ اس شہر میں بالادست اور فاتح قائد کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔ اس شہر کے باسیوں کو اللہ نے رسول اللہ ﷺ کا رہینِ منّت بنا دیا تھا۔ شہرِ مقدس میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے اس پروقار قائد کے کیا تاثرات، کیا احساسات تھے۔

عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ وادیِ ذی طویٰ میں پہنچے تو آپ کی سواری ذرا دیر کو رُکی۔ آپ نے سَر اور منہ پر سرخ ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ اللہ نے آپ کو فتح سے نوازا تھا جس کی شکر گزاری میں آپ کا سر ربّ ذوالجلال کے حضور جھکا ہوا تھا اور آپ کی ٹھوڑی پالان کے اگلے حصے کو مس کر رہی تھی۔''[2]

انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ آپ کی ٹھوڑی پالان کو چُھو رہی تھی۔''[3]

ابنِ مسعود بتاتے ہیں: ''ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس نے کسی مسئلے پر آپ سے بات کی۔ اس دوران آپ کی ہیبت سے اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا:

''اطمینان رکھیے۔ میں قریش کی ایک عام عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔''[4]

رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے:

''میں بندے کی طرح بیٹھتا اور بندے ہی کی مانند کھاتا ہوں۔''[5]

کسی عربی شاعر نے تواضع وانکسار کی حقیقت بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے:

تَوَاضَعْ تَكُنْ كَالنَّجْمِ لَاحَ لِنَاظِرٍ
عَلَى صَفَحَاتِ الْمَاءِ وَهُوَ رَفِيعُ

''عاجزی اختیار کرو۔ تم تارے کی طرح ہو جاؤ گے جس کا عکس دیکھنے والے کو پانی کی سطح پر نظر آتا ہے جبکہ وہ تارا اس سے بہت بلند ہوتا ہے۔''

وَلَا تَكُ كَالدُّخَانِ يَعْلُو بِنَفْسِهِ
عَلَى طَبَقَاتِ الْجَوِّ وَهُوَ وَضِيعُ

''دھواں مت بنو جو فضا کی پہنائیوں میں اپنے آپ کو بلند کرتا ہے، اس کے باوجود حقیر ہی ہوتا ہے۔''

بالاختصار

''جو اللہ کے لیے تواضع وانکسار اختیار کرے اور نیچا ہو، اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔ تواضع کی بدولت اللہ بندے کی عزت وتکریم میں اضافہ کرتا ہے۔''

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 91، وجامع الترمذي، حديث: 1999، وصحيح الترغيب والترهيب: 541/3. [2] السلسلة الصحيحة، حديث : 1874. [3] السيرة النبوية لابن هشام :48,47/4. [4] المستدرك للحاكم :466/2، ودلائل النبوة للبيهقي : 69/5. [5] الطبقات الكبرى لابن سعد:371/1.

مخفی عبادت

دس برس ہوتے ہیں۔ بہار کی رُت تھی۔ ایک خنک رات میں اپنے دوستوں کے ساتھ صحرا میں تھا۔ ہماری ایک گاڑی خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے مجبوراً ہمیں بے آب و گیاہ صحرا میں کھلے آسمان تلے رات گزارنی پڑی۔ مجھے بخوبی یاد ہے ہم نے آگ جلائی تھی جس کے گرد دائرہ بنائے ہم رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ جب رات خاصی گزر گئی تو ہمارا ایک ساتھی چپکے سے کھسک گیا۔ وہ نیک آدمی تھا اور مخفی عبادت کیا کرتا تھا۔ میں نے بارہا دیکھا تھا کہ وہ سویرے ہی جمعہ پڑھنے نکل کھڑا ہوتا اور اکثر مسجد کا دروازہ کھلنے سے پہلے وہاں موجود ہوتا۔

جاتے ہوئے وہ پانی کا برتن ساتھ لے گیا۔ میں سمجھا شاید پیشاب کرنے گیا ہے۔ خاصی دیر کے بعد جب وہ نہ آیا تو میں اس کے پیچھے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ساتھیوں سے دور تنہا رات کے اندھیرے میں جسم پر موٹی چادر لپیٹے ننگی زمین پر سجدہ ریز اپنے رب کی خوشامد کر رہا ہے۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اللہ بھی یقیناً اس سے محبت کرتا ہوگا۔ اس مخفی عبادت کا آخرت میں جو صلہ ہے وہ تو ہے ہی لیکن آخرت سے پہلے دنیا میں بھی اس کا صلہ عزت اور فائز المرامی کی صورت میں ملتا ہے۔

سالہا سال گزر گئے۔ میں آج بھی اپنے اس ساتھی کو جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس

کے لیے زمین میں مقبولیت رکھ دی ہے۔ آج وہ اسلام کا بہت بڑا داعی ہے۔ لوگ اس کے ہاتھوں راہِ راست پر آرہے ہیں۔ وہ بازار یا مسجد جاتا ہے تو چھوٹے بچے بھاگ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ بڑے اس سے محبت کرتے ہیں۔ کتنے ہی تاجروں، امراء و رؤسا اور شہرت یافتہ افراد کی خواہش ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی بھی ایسی ہی محبت ہو جیسی اس نوجوان کی ہے۔ لیکن شاید ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔

کسی دانا نے اپنے حریف سے کہا تھا:

''میں رات جاگ کر گزاروں اور تم سو کر گزارو، پھر تمھیں خواہش ہوتی ہے کہ میرا مقام و مرتبہ حاصل کرو؟ (تعجب انگیز بات ہے!)''

قرآن میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ۝﴾

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ انجام دیے، جلد ہی رحمٰن ان کے لیے (لوگوں کے دلوں میں) محبت ڈال دے گا۔''[1]

سچ ہے کہ اللہ جس سے محبت کرے، اس کے لیے زمین میں مقبولیت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو آواز دیتا ہے: ''میں فلاں سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔'' جبریل اس سے محبت کرنے لگتا ہے، پھر جبریل اہلِ آسمان میں اعلان کرتا ہے: ''اللہ فلاں سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو۔'' اہلِ آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس آدمی کے لیے اہلِ ارض کے درمیان محبت نازل ہوتی ہے۔''[2]

اللہ کی اس بات کا یہی مطلب ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا﴾

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ انجام دیے، جلد ہی رحمٰن ان کے لیے (لوگوں کے دلوں میں) محبت ڈال دے گا۔''

''اور جب اللہ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو جبریل کو آواز دیتا ہے: ''میں فلاں سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس سے نفرت کرو۔'' جبریل اس سے نفرت کرنے لگتا ہے، پھر وہ اہلِ سماء میں اعلان کرتا ہے: ''اللہ فلاں آدمی سے نفرت کرتا ہے، تم بھی اس سے نفرت کرو۔'' اہلِ سماء بھی اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس آدمی کے لیے زمین میں نفرت اترتی ہے۔''

سبحان اللہ! وہ کیا سماں ہوگا جب اللہ زمین پر چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، رہتے سہتے بندے کا نام لے کر آسمان پر اعلان کرتا ہوگا:

''میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔''

جلیل القدر صحابی زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''تم میں سے جو شخص ایسا کر سکے کہ اس کا کوئی صالح عمل پوشیدہ رہے تو وہ ضرور ایسا کرے۔'' مثلاً رات کو پابندی سے نماز پڑھنا، چاہے وہ وتر کی ایک رکعت ہی کیوں نہ ہو جسے آدمی نمازِ عشاء کے متصل بعد یا سونے سے قبل یا فجر کی نماز سے پہلے ادا کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ، فَأَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ»

''اللہ وتر (ایک، یکتا) ہے اور وتر پسند کرتا ہے، اس لیے اے اہلِ قرآن! (حاملینِ قرآن!) وتر پڑھا کرو۔''

لوگوں کی آپس میں صلح کرانے کا عمل بھی عبادتِ خفی کی ایک قسم ہے۔ روٹھے ہوئے ساتھیوں کو منانا، پڑوسیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور ناراض میاں بیوی کی باہمی تلخیاں دور کرنا نیکی کے بڑے عمل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''کیا میں تم لوگوں کو ایسا عمل نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقے سے افضل ہے؟'' صحابۂ کرام نے عرض کی: ''ضرور بتائیں۔''

آپ نے فرمایا:

''آپس میں صلح کرانا۔''

مزید فرمایا:

''آپس میں فساد ڈالنا دین کو مونڈ کر صاف کر دینے والا کام ہے۔''[5]

اللہ کا کثرت سے ذکر کرنا بھی ایک بڑی اور مخفی عبادت ہے۔ فطری طور پر جو آدمی کسی سے محبت کرتا ہو اس کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تم لوگوں کو بہترین عمل کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمھارے رب کے نزدیک بہت پاکیزہ اور تمھارے درجات کو بہت بلند کرنے والا ہے۔ یہ عمل تمھارے لیے سونے اور چاندی کا عطیہ کرنے سے بہتر ہے اور اس امر سے بھی بہتر ہے کہ دشمن سے تمھارا آمنا سامنا ہو، تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمھاری گردنیں ماریں؟''

صحابۂ کرام نے پُر شوق انداز میں جواب دیا: ''کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! ہمیں ضرور بتائیں کہ وہ کون سا عمل ہے۔''

آپ نے فرمایا:

''اللہ عزوجل کا ذکر۔''

مخفی عبادت کا ایک بڑا عمل ہے: ''چھپا کر صدقہ کرنا۔''

''چھپا کر صدقہ کرنا'' رب کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ آپ فجر کی نماز کے بعد صحرا کی طرف نکل جاتے۔ وہاں چند ساعتیں گزارتے اور مدینہ واپس آجاتے۔ عمر رضی اللہ عنہ کو بڑا تعجب ہوا کہ ابوبکر صبح ہی صبح صحرا میں کیا لینے جاتے ہیں۔ ایک دن فجر کی نماز کے بعد انھوں نے چھپ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ معمول کے مطابق مدینہ سے نکلے اور صحرا میں ایک پرانے خیمے کے اندر گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ ایک چٹان کی اوٹ میں چپکے سے انھیں دیکھنے لگے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر بعد خیمے سے باہر آئے اور مدینے روانہ ہو گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ چٹان کی اوٹ سے نکلے اور خیمے میں داخل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نابینا کمزور عورت اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہیں۔ آپ نے اس عورت سے دریافت کیا: ''یہ کون ہے جو تمھارے پاس آتا ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''میں اسے نہیں جانتی۔ کوئی مسلمان ہے۔ ایک عرصے سے ہر صبح ہمارے پاس آتا ہے۔'' پوچھا: ''تمھارے پاس آکر کیا کرتا ہے؟''

وہ بولی: ''گھر میں جھاڑو دیتا ہے، آٹا گوندھتا ہے، ہماری بکری کا دودھ دوہتا ہے اور چلا جاتا ہے۔''

اس کی بات سن کر عمر رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہوئے خیمے سے باہر آگئے: ''ابوبکر! آپ نے اپنے بعد کے خلفاء کو بڑی مشقت میں ڈال دیا ہے۔ آپ نے اپنے بعد کے خلفاء کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

عمر رضی اللہ عنہ بھی عبادت اور اخلاص کے معاملے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہ رہے۔

طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے انھیں رات کی تاریکی میں اپنے گھر سے نکل کر ایک گھر میں داخل ہوتے اور پھر وہاں سے نکل کر دوسرے گھر میں جاتے دیکھا۔ وہ حیران ہوئے کہ امیر المومنین ان گھروں میں کیا کرتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی طلحہ اس بات کا سراغ لگانے پہلے گھر گئے۔ ان کی ملاقات چارپائی پر پڑی نابینا بڑھیا سے ہوئی۔ اس سے دریافت کیا:

''یہ آدمی آپ کے پاس کیوں آتا ہے؟''

بڑھیا بولی: ''یہ آدمی ایک مدت سے میرا خیال رکھتا ہے۔ گھر کی صفائی کرتا ہے۔ تازہ پانی بھرتا ہے۔ میرا بول و براز صاف کرتا ہے۔''

اس پر طلحہ یہ کہتے ہوئے بڑھیا کے گھر سے باہر آگئے: ''طلحہ! تمھاری ماں کی بربادی! کیا عمر کی غلطیاں تلاش کرتے ہو؟''

ایک رات امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ کے نواح میں نکلے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مسافر سے ہوئی جو راستے میں پھٹا پرانا خیمہ نصب کیے پریشان حال بیٹھا تھا۔

عمر رضی اللہ عنہ نے استفسار کیا: ''کون ہو بھئی! کہاں سے آئے ہو؟''

وہ بولا: ''بادیہ سے آیا ہوں۔ امیر المومنین کے دربار میں حاضر ہوکر ان سے کچھ امداد حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔''

آپ کو خیمے کے اندر سے کسی عورت کی آہ و بکا سنائی دی۔ پوچھا کیا ماجرا ہے۔

وہ آدمی کہنے لگا: ''اللہ تم پر رحم کرے، جاؤ اپنا کام کرو۔''

عمر نے کہا: ''یہ میرا کام ہے۔''

اس پر وہ بولا: ''میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ میرے پاس نہ پیسے ہیں نہ کھانا اور نہ کوئی مدد کرنے کو ہے۔''

عمر رضی اللہ عنہ جلدی سے گھر واپس آئے۔ اپنی بیوی امّ کلثوم بنتِ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے کہا: ''اللہ نے ایک بھلائی تمھارے مقدر میں کی ہے۔''

بیوی نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ساری بات بتائی۔ امّ کلثوم نے کچھ ضروری سامان اپنے ساتھ لیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بورے میں کچھ غلہ، ایک ہانڈی اور چند لکڑیاں ڈالیں اور دونوں میاں بیوی مسافر کے خیمے کی طرف چل پڑے۔

امّ کلثوم رضی اللہ عنہا خیمے کے اندر اس عورت کے پاس گئیں اور عمر رضی اللہ عنہ باہر آدمی کے قریب بیٹھے۔

انھوں نے آگ جلائی اور لکڑیوں میں پھونک پھونک کر اسے بھڑکانے لگے۔ آگ جلی تو انھوں نے ہنڈیا چڑھا دی۔ دھواں عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی کے درمیان سے گزر گزر کر اڑ رہا تھا۔ آدمی بیٹھا انھیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں اندر سے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی آواز آئی: ''امیر المومنین! اپنے ساتھی کو بیٹے کی خوشخبری سنائیے۔''

آدمی نے ''امیر المومنین'' کا لفظ سُنا تو چونک اٹھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا: ''آپ خلیفہ عمر بن خطاب ہیں؟''

''ہاں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ آدمی پریشان اور مرعوب ہو کر ذرا پرے ہٹنے لگا۔

آپ نے کہا: ''اپنی جگہ بیٹھے رہو۔''

پھر عمر رضی اللہ عنہ نے آگ پر سے ہنڈیا اٹھائی، اسے خیمے کے قریب لائے اور امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو آواز دی:

''بہن کو کھانا کھلا دو۔''

زچّہ نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ باقی کھانا واپس باہر بھیج دیا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ اٹھے، کھانا لیا اور اس آدمی کے آگے رکھ کر کہا:

''کھاؤ، تم بہت دیر سے جاگ رہے ہو۔''

انھوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ باہر آ گئیں۔

جاتے جاتے عمر رضی اللہ عنہ نے آدمی سے کہا: ''صبح ہمارے پاس آنا۔ ہم تمھارے کھانے پینے اور رہائش وغیرہ کا بندوبست کریں گے۔''

علی بن حسین رحمہ اللہ رات کو روٹیوں کا بورا کمر پر لادے گھر سے نکلتے اور روٹیوں کا صدقہ کرتے۔ کہا کرتے:

''چھپا کر صدقہ کرنا ربّ کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔''

انھوں نے وفات پائی تو غسل دیتے ہوئے لوگوں کو اُن کی کمر پر سیاہ نشان نظر آئے۔ لوگوں نے کہا: ''یہ مزدور کی کمر ہے۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ انھوں نے کبھی مزدوری کی ہے۔''

اُن کی وفات پر مدینہ کی بیواؤں اور یتیموں کے سو گھروں میں کھانا پہنچنا بند ہو گیا۔ علی بن حسین رحمہ اللہ روز رات کو ان گھروں میں کھانا تقسیم کیا کرتے تھے۔ گھروں والے نہیں جانتے تھے کہ کھانا کون لاتا ہے۔ ان کی وفات پر سب کو معلوم ہوا کہ وہی ان سب گھروں میں کھانا دے کر آیا کرتے تھے۔

اسلاف میں سے ایک بزرگ نے بیس سال یوں روزے رکھے کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن نہ رکھتے۔ لیکن آخر تک گھر والوں کو ان کے روزے کا علم نہ ہوا۔ ان بزرگ کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ صبح سویرے سورج طلوع ہونے پر ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ساتھ لیے اپنی دکان پر چلے جاتے۔ جس دن روزہ رکھتے کھانا صدقہ کر دیتے۔ اور جس

دن روزہ نہ رکھتے کھانا کھا لیتے۔ شام کے بعد گھر لوٹتے اور رات کا کھانا گھر والوں کے ساتھ کھاتے۔

دراصل یہ لوگ زندگی کے تمام حالات میں اللہ کی عبادت کا شعور بیدار رکھتے تھے۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں متقی تھے جن کے متعلق اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۝ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ۝ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ۝﴾

''بلاشبہ متقین کے لیے بڑی کامیابی ہے۔ باغات اور انگور۔ اور نوجوان ہم عمر عورتیں۔ اور چھلکتے جام۔ وہ ان (باغات) میں کوئی لغویت اور کذب بیانی نہ سنیں گے۔ تیرے رب کی جزا، کافی عطا ہے۔''[7]

اس لیے آپ خالق کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کریں، مخلوق کے دلوں میں آپ کی محبت کا بیج وہ خود بو دے گا۔

نور کی کرن

''یہ مقصد نہیں کہ لوگ اوپرا اوپر سے آپ کو چاہیں بلکہ غرض و غایت یہ ہے کہ لوگ دِل سے بھی آپ کے گرویدہ ہوں۔''

---

[1] مریم 96:19. [2] صحیح البخاري، حدیث:6040، وصحیح مسلم، حدیث:2637، وجامع الترمذي، حدیث:3161، ومسند احمد:413/2. [3] مریم 96:19. [4] سنن أبي داود، حدیث: 1416، وجامع الترمذي، حدیث:453. [5] سنن أبي داود، حدیث:4919، وجامع الترمذي، حدیث:2509، ومسند أحمد 444/6-445. [6] جامع الترمذي، حدیث:3377، وسنن ابن ماجة، حدیث:3790. [7] النبأ 78:31-36.

اُنھیں گڑھے سے باہر نکالیں

کیا آپ کی زندگی میں کبھی ایسا پُر پیچ لمحہ بھی آیا جب کسی شخص نے بھری محفل میں کوئی تیکھی بات کہہ کر آپ کو زچ کر دیا؟ یا کسی شخص نے آپ کے لباس، آپ کی بات یا آپ کے انداز کا مذاق اڑایا جسے سُن کر آپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے؟ اس پریشان کُن صورتِ حال میں کسی آدمی نے آپ کا دفاع کیا جسے آپ نے اس کا عظیم احسان جانا، گویا آپ کو گہرے گڑھے میں دھکا دیا گیا اور اس نے بڑھ کر آپ کا دامن پکڑ لیا اور گہرے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔

آپ لوگوں سے ایسا طرزِ عمل اختیار کر کے دیکھیے۔ آپ کو اس رویے کی جادوئی تاثیر کا اندازہ ہوگا۔ آپ اپنے کسی دوست کے ہاں جاتے ہیں۔ اس کا چھوٹا بیٹا کھانے کی ٹرے لیے آتا ہے۔ جلدی میں کھانے کی ٹرے گرتے گرتے بچتی ہے۔ اس کا باپ غصے سے اس کی طرف دیکھتا اور چلا کر کہتا ہے:

”اتنی جلدی کس بات کی ہے؟“

”کتنی بار میں نے تمھیں سمجھایا ہے؟“

”کب عقل آئے گی تمھیں؟“

بچے کا چہرہ خوف اور شرم کے احساس سے پیلا پڑ جاتا ہے۔

آپ اس صورتِ حال میں بچے کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''نہیں، ماشاء اللہ، یہ تو بہت بہادر اور عقل مند ہے۔شاید اس نے کسی وجہ سے جلدی کی ہو۔''

اللہ اکبر! وہ بچہ آپ کے ان چند جملوں کو کتنا بڑا احسان مانے گا، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ چھوٹے تو چھوٹے ہیں، بڑوں سے اس طرزِ عمل کے اس سے بھی زیادہ دور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔آپ کا کوئی رفیقِ کار دفتر کی ماہانہ میٹنگ میں سنگ ہائے ملامت کی بارش میں بھیگتا ہے تو آپ اس کے لیے تعریف کے چند بول کہہ دیں۔

یا گھر کے سب افراد کسی چھوٹی موٹی غلطی کی وجہ سے آپ کے چھوٹے بھائی پر برستے ہیں تو آپ اس کی ستائش میں چند جملے ضرور کہیں۔ یوں اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں آپ اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔ایک شخص نے برسرِ عام ایک نوجوان کو یہ سوال کر کے پریشان کر دیا:

''ہاں بھئی، میاں صاحبزادے! یونیورسٹی سے کتنے فیصد نمبر حاصل کیے ہیں آپ نے؟''

اس سوال پر نوجوان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے نرمی سے یہ کہہ کر اس کی جان چھڑائی:

''کیوں جی! آپ اس کے نمبروں کے بارے میں کیوں پوچھتے ہیں؟ کوئی رشتہ دیکھ رکھا ہے اس کے لیے؟ یا کوئی ملازمت ہے آپ کی نظر میں؟''

میرا سوال سن کر سب ہنس پڑے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

لوگوں کی محبت حاصل کرنے کے چند مواقع ہوتے ہیں جن سے ہوشیار لوگ بھرپور

فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا تھا:

إِذَا هَبَّتْ رِيَاحُكَ فَاغْتَنِمْهَا

فَإِنَّ لِكُلِّ خَافِقَةٍ سُكُونُ

''جب تمھاری ہوائیں اوپر اٹھیں اور جوبن پر آئیں تو انھیں غنیمت جانو۔ نیچی فضا میں چلتی ہوائیں بالآخر ساکن ہو جاتی ہیں۔''

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ان دونوں کا گزر ایک درخت کے پاس سے ہوا۔ نبی ﷺ نے عبداللہ سے کہا کہ درخت پر چڑھو اور میرے لیے مسواک اتارو۔ ابن مسعود جو چھریرے بدن کے نوجوان تھے، درخت پر چڑھے اور مسواکیں اتارنے لگے۔ ہوا آئی اور ان کا کپڑا ذرا اوپر اٹھ گیا جس سے ان کی پتلی پتلی پنڈلیاں نظر آنے لگیں۔ آس پاس کھڑے لوگ ان کی دبلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

''آپ لوگ کیوں ہنستے ہیں؟''

''کیا اس نوجوان کی دبلی پنڈلیاں دیکھ کر آپ کو ہنسی آرہی ہے؟''

''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ دونوں پنڈلیاں میزان میں احد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہیں۔''[1]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے جذبات و احساسات کیا ہوں گے جب لوگ ان پر ہنسے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کا دفاع کرتے ہوئے تعریفی کلمات کہے!!

نقطۂ نظر

”لوگوں کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے چند مواقع ہوتے ہیں جن سے بیدار مغز لوگ ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

1 مسند أحمد: 421/1.

ظاہری تراش خراش کا اہتمام

ایک روز امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ طلبہ کو مسجد میں بیٹھے پڑھا رہے تھے۔ ان کے گھٹنے میں درد تھا، اس لیے انھوں نے پاؤں پسار کر دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اسی اثنا میں ایک آدمی خوبصورت لباس اور خوشنما عمامے میں ملبوس باوقار انداز سے قدم قدم چلتا ہوا آیا۔ اپنی تراش خراش سے وہ بہت عالم و فاضل اور بارعب معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی طلبہ نے اس کے لیے جگہ بنائی اور وہ با اطمینان ان کے درمیان سے گزر کر امام صاحب کے نزدیک جا بیٹھا۔ امام صاحب نے اس کا وقار اور جاہ و جلال دیکھا تو شرمسار ہو کر پاؤں سمیٹ لیے اور اس کی خاطر گھٹنے کا درد برداشت کر لیا۔ انھوں نے سبق کا سلسلہ جو اس آدمی کی آمد پر منقطع ہو گیا تھا، دوبارہ شروع کیا۔ وہ آدمی بغور سنتا رہا۔ سبق ختم ہوا تو سوال و جواب کا مرحلہ آیا۔ طلبہ مختلف سوال پوچھنے لگے۔ اس آدمی نے بھی اپنا ہاتھ کھڑا کیا۔ شیخ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا: ''آپ کا سوال کیا ہے؟''

وہ بولا: ''یا شیخ! مغرب کی نماز کا وقت کب ہوتا ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''جب سورج غروب ہو جائے۔''

اس نے کہا: ''رات کا وقت ہو جائے اور سورج غروب نہ ہو تو پھر؟''

اس پر امام ابو حنیفہ نے ہنس کر کہا: ''لو بھئی! ابو حنیفہ کے پاؤں پھیلانے کا وقت آ گیا۔''

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے پاؤں پہلے کی طرح پسار لیے اور اس فضول اور اُلٹے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ رات آجائے اور سورج غروب نہ ہو۔

آپ پر پڑنے والی پہلی نظر سامنے والے کے ذہن پر آپ کی شخصیت کے ستر فیصد سے زائد حصے کا عکس ڈال دیتی ہے۔ لیکن نہیں! شاید پہلی نظر سے آدمی کی شخصیت کے پچانوے فیصد حصے کا نقش سامنے والے کے ذہن میں بیٹھتا ہے۔ بات کرنے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد یہ تناسب کم یا زیادہ ہو جاتا ہے۔

آپ ہسپتال یا دفتر کی راہداری میں چلتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف جا رہے ہوں اور آپ کے پہلو میں کوئی صاحب خوبصورت کپڑوں میں ملبوس آہستہ خرامی سے چل رہے ہوں تو دروازے پر پہنچ کر غیر شعوری طور پر آپ اُن کی طرف متوجہ ہو کر پہلے گزرنے کی پیش کش کریں گے۔ آپ اپنے کسی دوست کے ہاں جائیں اور اس کے کمرے کو بے ترتیب پائیں تو آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ یہ شخص لاابالی اور بے قاعدہ ہے۔ لوگوں کے لباس اور ان کی تراش خراش سے بھی یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سماجی زندگی کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ آپ عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں کپڑوں کا خوشنما جوڑا پہن کر آیا کرتے تھے۔ مدینہ آنے والے وفود کے استقبال و خیر مقدم کے لیے بھی آپ نے ایک خوبصورت جوڑا سلوا رکھا تھا جسے وقتاً فوقتاً پہنا کرتے تھے۔ آپ اپنی تراش خراش اور زیب و زینت کا خیال رکھا کرتے تھے۔ آپ کو خوشبو سے پیار تھا۔

انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ کا رنگ، کھلتا ہوا اور چمک دار تھا۔ آپ جھک کر چلتے تھے۔ میں نے ایسا ریشم نہیں چھوا جو رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور نہ آج تک ایسی خوشبو سونگھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہو۔

آپ کا ہاتھ ایسا خوشبودار تھا گویا ابھی ابھی عطر فروش کے مرتبان سے نکالا گیا ہے۔ جہاں جاتے، پہلے آپ کی خوشبو وہاں پہنچ جاتی اور پتا چل جاتا کہ آپ آ رہے ہیں۔“

انس رضی اللہ عنہ نے مزید بتایا کہ رسول اللہ ﷺ خوشبو کا تحفہ رد نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ کا چہرہ سب سے زیادہ خوبصورت اور سورج کی مانند روشن تھا۔ جب آپ خوش ہوتے تو چہرے سے نور چھلکتا اور وہ چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا۔

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

”میں نے ایک چاندنی رات رسول اللہ ﷺ کا دیدار کیا۔ سُرخ جوڑا زیب تن تھا۔ میں کبھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا اور کبھی چاند پر نگاہ ڈالتا۔ زمین کا یہ چاند مجھے آسمان کے چاند سے زیادہ حسین نظر آیا۔“

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو بھی لباس کی زیب و زینت پر توجہ دینے اور اپنے حُلیے کا خیال رکھنے کو کہا کرتے تھے۔

ابو الاحوص کے والد بتاتے ہیں کہ میں گھٹیا درجے کا لباس پہنے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے میرے کپڑے دیکھ کر دریافت فرمایا:

”آپ کے پاس مال ہے؟“[1]

میں نے کہا: ”جی ہاں۔“

آپ نے پوچھا:

”کیسا مال؟“

میں نے جواب دیا: ”میرے پاس اونٹ، گائیں، بکریاں، گھوڑے، غلام سب کچھ ہے۔“

اس پر آپ نے فرمایا:

«مَنْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ نِعْمَةً، فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ يُرٰى أَثَرُ نِعْمَتِهِ عَلٰى

عَبْدِہٖ»

''جسے اللہ نے کوئی نعمت عطا کی ہو تو اللہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اس نعمت کے اثرات دیکھے۔''[2]

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ملنے ہمارے گھر آئے۔ وہاں آپ نے ایک پراگندہ حال آدمی دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''کیا یہ شخص کوئی ایسی شے نہیں پاتا جس سے اپنے بال سنوار لے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی دیکھا جس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''کیا اسے پانی نہیں ملتا جس سے یہ اپنے کپڑے دھو لے؟''[3]

آپ نے فرمایا:

''جس کے بال ہوں وہ ان کا اکرام کرے۔''[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لباس کی خوبصورتی اور تراش خراش کا خیال رکھنے کی ترغیب دیا کرتے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے:

«إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ»

''اللہ حسین وجمیل ہے اور حُسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔''[5]

تجربہ

”آپ پر پڑنے والی پہلی نظر دیکھنے والے کے ذہن میں آپ کی شخصیت کے ستر فیصد حصے کا عکس ڈالتی ہے۔“

1 سنن أبي داود، حديث: 4063، وسنن النسائي، حديث: 5226. 2 مسند أحمد: 438/4، ومجمع الزوائد: 132/5. 3 سنن أبي داود، حديث: 4062، ومسند أحمد 357/3. 4 سنن أبي داود، حديث: 4163، والسلسلة الصحيحة، حديث: 500. 5 صحيح مسلم، حديث: 91، ومجمع الزوائد: 132/5.

سچائی

میں کمرۂ امتحان میں نگرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ ہرچند ہمارے ہاں (سعودی عرب میں) جمعرات کے دن ہفتہ وار تعطیل ہوتی ہے، ہم مضامین کی بھیڑ کے باعث چھٹی کے دن بھی امتحان لینے پر مجبور تھے۔

امتحان شروع ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک طالب علم جو لیٹ ہو چکا تھا، کمرۂ امتحان میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے اس سے کہا: ''معاف کیجیے گا۔ آپ دیر سے آئے ہیں۔ میں آپ کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

وہ بے چارہ منت سماجت کرنے لگا۔

میں نے اس سے دریافت کیا: ''آپ کو دیر کیوں ہوئی؟''

اس نے صاف جواب دیا: واللہ! یا دکتور! میں سوتا رہ گیا تھا۔''

مجھے اس کا سچ بولنا پسند آیا۔ میں نے اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اس کے چند منٹ بعد ایک اور طالب علم آیا۔

میں نے پوچھا: ''آپ بدیر کیوں تشریف لائے ہیں؟''

اس نے جھوٹ بولا: ''یا دکتور! واللہ! سڑکوں پر ازدحام تھا اور ٹریفک جام تھی۔ آپ

تو جانتے ہیں صبح سویرے لوگ اپنے کاموں پر نکلتے ہیں۔ کوئی یونیورسٹی جا رہا ہے۔ کسی کو دفتر جانے کی جلدی ہوتی ہے۔"

وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ واقعی ازدحام کی وجہ سے ٹریفک جام تھی۔ وہ بھول رہا تھا کہ آج ملازمین کی ہفتہ وار تعطیل ہے بلکہ شاید راستوں پر ہمارے طلبہ کے سوا اور کوئی طالبِ علم یا ملازمت پیشہ فرد نہیں تھا۔ میں نے کہا:

"آپ کا مطلب ہے کہ سڑکوں پر ازدحام تھا اور ٹریفک جام تھی؟"

"ہاں، ہاں، واللہ! یا دکتور! سبحان اللہ! آپ تو گویا میرے ساتھ تھے۔"

میں نے مصنوعی غصہ کرتے ہوئے کہا:

"ابے او مکّار کہیں کے! جھوٹ گھڑنے سے پہلے سوچ تو لیتے۔ آج جمعرات ہے۔ ملازمین اور طلبہ کو چھٹی ہے، پھر یہ سڑکوں پر رش کہاں سے آیا؟"

چوری پکڑے جانے پر وہ گھبرایا اور پینترا بدل کر بولا:

"آہ! جناب دکتور! میں تو بھول ہی گیا۔ دراصل میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ اسے تبدیل کرتے دیر ہو گئی۔"

وہ بے چارہ جھوٹ بول کر پھنس گیا تھا۔ میں مسکرایا اور اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

کتنی بُری بات ہے کہ لوگوں کو پتا چل جائے، آپ اُن سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ جھوٹ لوگوں کو آپ سے متنفر کر دیتا ہے۔ وہ آپ سے شکایت نہیں کرتے لیکن جب آپ کوئی بات کرتے ہیں تو وہ سنتے نہیں اور سن لیں تو قبول نہیں کرتے۔

جھوٹ بُری بلا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا إِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ»

''ہر شے مومن کے مزاج کا حصہ ہو سکتی ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''[1]

آپ ﷺ سے سوال کیا گیا:

''اے اللہ کے رسول! کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟''

جواب ملا: ''ہاں۔''

''کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟''

فرمایا: ''نہیں۔''[2]

عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

''ایک دن، جبکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف فرما تھے، میری والدہ نے مجھے پکارا: ''اِدھر آؤ۔ میں تمھیں ایک چیز دوں گی۔''

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

''آپ اسے کیا دینا چاہتی تھیں؟''

والدہ نے بتایا: ''میں اسے کھجور دیتی۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر آپ کوئی شے نہ دیتیں تو ایک جھوٹ آپ کے ذمے لکھا جاتا۔''[3]

آپ کو اپنے گھر والوں میں سے کسی کے متعلق علم ہو جاتا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے تو آپ اس سے منہ پھیرے رہتے۔

بعض لوگ ترنگ میں آ کر خواہ مخواہ ڈینگیں مارنے لگتے ہیں۔ جھوٹے کارنامے مزے

لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ کہانیاں مسالے لگا کر سناتے ہیں۔ ایسی اشیاء کی ملکیت کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں جو اُن کے پاس نہیں ہوتیں خیالی پلاؤ سے اپنا اور دوسروں کا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔ جھوٹ پکڑا جائے تو بہانے تراشتے ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ نے سلطانِ وقت کے روبرو کسی مسئلے میں شہادت دی۔ سلطان نے کہا: ''آپ جھوٹ بولتے ہیں۔''

امام زہری رحمہ اللہ نے مارے غصے کے چلا کر کہا: ''اعوذ باللہ، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ واللہ! آسمان سے منادی ہو کہ اللہ نے جھوٹ بولنا حلال کر دیا ہے، میں تب بھی جھوٹ نہ بولوں۔ جب جھوٹ حرام ہے تو میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں!''

حقیقت

''لوگوں نے آپ کو دھوکا دیا اور کہا: ''سفید جھوٹ'' کیونکہ جھوٹ کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔''

---

[1] مسند أحمد: 5/252. [2] الموطأ للإمام مالك: 2/990. [3] سنن أبي داود، حديث: 4991، ومسند أحمد: 3/447، والسلسلة الصحيحة، حديث: 748.

اصولوں پر ثابت قدمی

انسان کی شخصیت جس قدر پختہ ہوتی ہے اور جتنی ثابت قدمی سے وہ اپنے اصولوں پر قائم رہتا ہے، زندگی میں اس کی اہمیت بھی اسی قدر ہوتی ہے۔

مثلاً آپ یہ اصول اپناتے ہیں کہ میں کبھی رشوت نہیں لوں گا تو چاہے کچھ بھی ہو جائے، لوگ اس کا کیسا ہی خوشنما نام رکھ دیں، تحفہ، نذرانہ، کمیشن لیکن آپ اپنے اصول پر قائم رہیں۔

بیوی زندگی کا یہ اصول بنالے کہ شوہر سے جھوٹ نہیں بولے گی تو لوگ جھوٹ کو کتنا ہی آراستہ کر کے پیش کریں کہ یہ جھوٹ تھوڑی ہے، یہ تو حالات سے سمجھوتہ ہے، بیوی کو اپنے اصول پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔

یہ اصول بھی بنایا جا سکتا ہے کہ جنسِ مخالف سے ناجائز تعلقات نہیں رکھے جائیں گے یا شراب کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ ایک آدمی جو سگریٹ نہیں پیتا، سگریٹ نوش دوستوں کی محفل میں بیٹھے تو اپنے اصول پر کاربند رہے۔ اصولوں پر قائم آدمی کو اس کے دوست احباب چاہے تنقید کا نشانہ بنائیں اور سخت مزاجی کا طعنہ دیں لیکن ان کے اندرونی احساسات اس بات پر ایمان لے آتے ہیں کہ ان کا سامنا ایک مضبوط کردار سے ہے۔ مصائب کے وقت ایسے دوست احباب، رشتے دار اکثر اسی سخت مزاج کی پناہ میں آتے

اور اپنی ذاتی مشکلات میں اسی سے مشورہ طلب کرتے ہیں۔ تب انھیں اپنے اس دوست کی اہمیت کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔

اصولوں پر قائم رہنے کا اصول کسی ایک جنس سے خاص نہیں۔ خواتین و حضرات یکساں طور پر اسے اپنا سکتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنے اصولوں پر قائم رہیے اور معذرت خواہانہ رویہ ہرگز اختیار نہ کیجیے۔ جلد ہی لوگ آپ کی بات پر سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔

عرب میں اسلام کا چرچا ہوا تو قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کو آنے لگے۔ قبیلۂ ثقیف کی طرف سے بھی چند افراد کا وفد حاضرِ خدمت ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں مسجد میں ٹھہرایا تاکہ وہ گاہے گاہے قرآن سماعت کرتے رہیں۔ انھوں نے آپ سے سود، زنا اور شراب کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ حرام ہیں۔ ان کا ایک بت تھا جس کی پوجا اور تعظیم اُنھیں آباء و اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ اس بت کا نام ربّہ تھا جسے انھوں نے ”طاغیہ“ کا لقب دے رکھا تھا۔ اس کی قوت و طاقت کے متعلق کئی کہانیاں انھوں نے گھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے آپ ﷺ سے ربّہ کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا کیا جائے؟

رسول اللہ ﷺ نے بلا تردد جواب دیا:

”اسے مسمار کر دو۔“

وہ بولے: ”ناممکن، ربہ کو پتا چل گیا کہ آپ اسے مسمار کرنے کے در پے ہیں تو وہ آپ کو اور آپ کے بال بچوں کو مار ڈالے گی۔“

عمر رضی اللہ عنہ کو جو وہاں موجود تھے، یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ یہ لوگ ایک بت مسمار کرنے سے ڈرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: ”اے معشرِ ثقیف! تم کتنے جاہل ہو! ربّہ پتھر ہے جو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع دے سکتا ہے۔“

عمر رضی اللہ عنہ کی بات پر انھیں طیش آ گیا۔ کہنے لگے: ''ابنِ خطاب! ہم تمھاری طرف نہیں آئے۔'' اس پر عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔

انھوں نے کہا: ''ہماری شرط یہ ہے کہ آپ تین سال کے لیے ''طاغیہ'' رہنے دیں، پھر چاہیں تو اُسے مسمار کر دیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے معاملے میں سودے بازی کرنا چاہتے ہیں جو مسلمان کے عقیدۂ توحید سے متعلق اور اسلام کا اصل الاصول ہے۔ وہ مسلمان ہوتے ہیں تو بت سے تعلق رکھنا چہ معنی دارد؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''نہیں۔''

انھوں نے کہا: ''اچھا، دو سال رہنے دیں، پھر مسمار کر دیں۔''

فرمایا: ''نہیں۔''

''چلیں، ایک سال رہنے دیں۔''

''نہیں۔''

''ایک مہینہ ہی اس کی جان بخشی کر دیں۔''

جواب ملا: ''نہیں۔''

انھوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی آپشن نہیں مان رہے تو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ شرک و ایمان کا مسئلہ ہے، اس میں مذاکرات کی گنجائش نہیں۔

بالآخر انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! پھر آپ ہی اسے مسمار کریں۔ ہم تو اسے ہاتھ بھی نہ لگائیں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ٹھیک ہے، میں تمھاری طرف چند آدمی بھیجوں گا جو اسے مسمار کر آئیں گے۔''

انھوں نے کہا: ''اور نماز کے متعلق یہ ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھنا چاہتے۔ ہمیں پسند نہیں کہ آدمی کے سرین اس کے سر سے بلند ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہ بات کہ تم اپنے بت اپنے ہاتھوں سے توڑو، ہم تمھیں اس تکلیف میں نہیں ڈالتے۔ اور نماز کے بارے میں یہ ہے کہ اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہ ہو۔''

چنانچہ انھوں نے ان شرائط پر آپ ﷺ سے معاہدہ کر لیا۔ آپ نے انھیں عہد نامہ لکھ دیا۔ وفدِ ثقیف کے لوگ اپنی قوم کی طرف واپس گئے، انھیں اسلام کی دعوت دی تو سب لوگوں نے طوعاً کرہاً اسلام قبول کر لیا۔

اس کے چند دنوں بعد چند صحابۂ کرام بت مسمار کرنے ثقیف کے علاقے میں گئے۔ ان میں خالد بن ولید اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ صحابۂ کرام بت کی طرف بڑھے تو بنو ثقیف گھبرا گئے۔ ان کے مرد، عورتیں اور بچے گھروں سے نکل کر تماشا دیکھنے لگے۔ ان کے دلوں میں یہ بیٹھا تھا کہ بت ہرگز مسمار نہیں ہوگا اور وہ اپنا دفاع کرے گا۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کلہاڑا پکڑا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا:

''اب دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔ تمھیں ثقیف کے لوگوں پر ہنسی آئے گی۔''

یہ کہہ کر وہ بت کے قریب آئے۔ اسے پوری قوت سے کلہاڑے کی ضرب لگائی، پھر زمین پر گر پڑے اور ایڑیاں رگڑنے لگے۔ ثقیف نے یہ دیکھ کر بہت غل اٹھایا۔ وہ خوش ہو کر کہنے لگے: ''اللہ مغیرہ کو دور کرے۔ ربّہ نے اسے مار ڈالا۔''

پھر انھوں نے صحابہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اب تم میں سے جو چاہے آگے آئے۔''

یکا یک مغیرہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہنس رہے تھے۔ انھوں نے طنز کرتے ہوئے کہا:

’’ثقیف کے لوگو! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یہ بت ہے۔ محض پتھر اور اینٹیں، اس لیے اللہ کی عافیت قبول کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔‘‘

پھر وہ آگے بڑھے اور بت کو مسمار کرنے لگے۔ اب کی بار لوگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ بت کو پتھر پتھر کر کے توڑتے رہے حتی کہ اسے زمین کے برابر کر دیا۔[1]

وحی

«مَنْ طَلَبَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ أَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ، وَمَنْ طَلَبَ رِضَااللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضٰى عَنْهُ النَّاسَ»

’’جس نے اللہ کی ناراضی کے بدلے لوگوں کی رضا مندی چاہی، اللہ اس سے ناراض ہوگا اور لوگوں کو بھی اس سے ناراض کر دے گا۔ اور جس نے لوگوں کی ناراضی کے بدلے اللہ کی رضا مندی چاہی، اللہ اس سے راضی ہوگا اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کر دے گا۔‘‘[2]

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا۔

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي:5/299-306، والبداية والنهاية:5/27-30 . [2] جامع الترمذي، حديث: 2414، والسلسلة الصحيحة، حديث: 2311، ملخصًا.

لالچ

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ برطانیہ میں ایک مسلم نوجوان نے اخبار میں کسی کمپنی کا اشتہار دیکھا کہ انھیں سیکورٹی ملازمین کی ضرورت ہے۔ وہ نوجوان انٹرویو دینے آیا۔ مسلم و غیر مسلم نوجوانوں کی بڑی تعداد انٹرویو دینے آئی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے انٹرویو کے کمرے میں جاتے رہے۔ جو آدمی انٹرویو دے کر نکلتا سب اس سے پوچھتے کہ انٹرویو لینے والوں نے کیا کیا سوال کیے اور اس نے کیا جواب دیا۔ ایک سوال سب سے پوچھا جا رہا تھا کہ آپ روزانہ شراب کے کتنے گلاس پیتے ہیں؟

اس مسلم نوجوان کی باری آئی تو اس سے بھی پے در پے کئی سوال پوچھے گئے۔ جب انھوں نے پوچھا کہ آپ کتنی پیتے ہیں تو نوجوان کو تردد ہوا کہ کیا جواب دے۔ کیا جھوٹ بولے اور کہے کہ وہ بھی دیگر نوجوانوں کی طرح خوب پیتا ہے تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ یہ انتہا پسند مسلمان ہے۔ یا سچ کہہ دے کہ وہ مسلمان ہے اور اللہ نے اس پر شراب حرام کی ہے، اس لیے وہ شراب نہیں پیتا۔ اس نے فوری طور پر سچ بولنے کا فیصلہ کیا اور برملا کہا:

''میں شراب نہیں پیتا۔''

انٹرویو لینے والوں نے پوچھا: ''کیوں، آپ بیمار ہیں؟''

''نہیں، میں مسلمان ہوں اور شراب حرام ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا: ''یعنی آپ بالکل شراب نہیں پیتے، اختتامِ ہفتہ پر بھی نہیں؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں، میں شراب بالکل نہیں پیتا۔''

وہ سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

نتائج کا اعلان ہوا تو اس مسلم نوجوان کا نام سرفہرست تھا۔ اس نے فرم میں چارج سنبھال لیا۔ چند مہینے گزرے تو ایک روز اس نوجوان نے انٹرویو لینے والی ٹیم میں شریک کسی افسر سے پوچھا:

''آپ لوگ اس دن بار بار شراب ہی کے متعلق کیوں پوچھ رہے تھے؟''

افسر نے جواب دیا: ''کیونکہ ملازمت سیکورٹی کے شعبے میں تھی۔ یہاں جب بھی کوئی جوان تعینات ہوتا، ہمیں پتا چلتا کہ وہ نشہ کرتا یا شراب پیتا ہے۔ یوں وہ اپنی ڈیوٹی سے غفلت برتتا اور کمپنی کو نقصان اٹھانا پڑتا۔ ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ شراب نہیں پیتے تو ہمیں گویا اپنی متاعِ گم گشتہ مل گئی۔ ہم نے فوراً آپ کو بھرتی کر لیا۔''

لالچ کے باوجود اصولوں پر کاربند رہنا غیر معمولی بات ہے۔ ہم ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں اصولوں پر قائم رہنے والے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جو اصولوں کے لیے جیتے اور اصولوں پر جان دیتے ہوں۔ ہر چند انھیں ہر طرح کا لالچ دیا جائے، وہ اصولوں پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں۔ جب آپ صحیح راستے پر چلیں اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے تو اصول پسند لوگ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ ایک آدمی کا رشوت قبول نہ کرنا اس کے رشوت خور رفقائے کار کے لیے یقیناً ناگوار ہوتا ہے۔

روایات میں ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک رات گشت کر رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں آپ کا گزر ایک گھر کے پاس سے ہوا۔ آپ نے گھر سے ہنسی کھیل کی

آوازیں سنی۔ چند آدمی نشے میں بول رہے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رات کے وقت گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہ سمجھا۔ آپ کو خدشہ تھا کہ کہیں یہ میری غلط فہمی نہ ہو۔ یہ سوچ کر کہ پہلے معاملے کی تحقیق کرنی چاہیے آپ نے زمین سے کوئلے کا ٹکڑا اٹھایا اور دروازے پر نشانی لگا کر چلے گئے۔

گھر کے مالک کو دروازے پر آہٹ سنائی دی تو وہ باہر نکلا۔ اسے دروازے پر کوئلے کا نشان نظر آیا۔ اس نے امیر المومنین کو جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ سارا ماجرا سمجھ گیا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ آدمی دروازے پر لگی علامت مٹا دیتا اور قصہ ختم ہوتا، اس نے کوئلے کا ٹکڑا اٹھایا اور آس پاس کے سب دروازوں پر نشان لگا دیے۔ گویا اس نے چاہا کہ لوگ اس کے معیار پر اتر آئیں اور اسی کی طرح نشہ باز بن جائیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں ہو سکا اور نہ اس نے یہ سوچا کہ وہ لوگوں کے بلند معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرے۔

عربی کی ایک کہاوت ہے کہ زانیہ عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ ساری عورتیں زنا کرنے لگیں۔ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ جو عورت خاوند سے ہمیشہ جھوٹ بولتی ہے اور جھوٹ ہی پر پروان چڑھتی ہے، اسے کوئی عورت ٹوکے اور سچائی کی نصیحت کرے تو وہ اسے بھی اسی دلدل میں کھینچنے کی کوشش کرتی ہے اور بار بار یہی کہتی ہے: ''مردوں سے یہی سلوک کرنا چاہیے۔ تم ان کے ساتھ سچ بول کر گزارا نہیں کر سکتی۔''

یوں آہستہ آہستہ وہ عورت بھی جو اسے نصیحت کرنے آئی تھی، اپنے اصولوں سے انحراف کرنے لگتی ہے یا کبھی ثابت قدم بھی رہتی ہے۔

یہی حال اس افسر کا ہے جو ماتحتوں سے اچھا سلوک کرتا اور یہ نقطۂ نظر رکھتا ہے کہ اچھا برتاؤ کام میں اضافے اور دلوں کی راحت کا باعث ہوتا ہے، پھر اس کی ملاقات بداخلاق افسر سے ہوتی ہے جس سے اس کے ماتحت نفرت کرتے ہیں تو بداخلاق افسر حسد کا شکار

ہوتا اور اسے اپنا نرم رویہ بدلنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ نہ کیا کرو۔ وہ نہ کیا کرو۔ مسکرایا نہ کرو۔ اپنے ماتحتوں سے خوش طبعی نہ کیا کرو، وغیرہ وغیرہ۔ یا کوئی پرچون فروش جو سگریٹ نہ بیچتا ہو، اس کا دوست آئے اور اسے سگریٹ بیچنے کی تلقین کرے کہ تمھاری آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

اس لیے بہادر بنئے اور اپنے اصولوں پر قائم رہیے۔ اور بلند آواز سے کہیے: ''نہیں۔'' خواہ لوگ آپ کو کیسا ہی لالچ دیں۔ کافروں نے بھی کوشش کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصولوں سے دست بردار ہو جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا:

﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾

''ان کی خواہش ہے کہ تو نرمی برتے تو وہ بھی نرم ہو جائیں۔''[1]

مطلب یہ ہے کہ کافر جو بتوں کے پجاری ہیں، ان کے ہاں تو سرے سے اصولوں کا وجود ہی نہیں کہ وہ ان پر کاربند رہیں، اس لیے اپنے بے بنیاد اصولوں سے دست بردار ہونا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ تم خبردار رہو، کہیں وہ تمھیں اصولوں سے انحراف کا لالچ نہ دیں۔

راستہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ۝ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾

''اس لیے تو تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کر۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تو نرم پڑے تو وہ بھی نرم ہو جائیں۔''[2]

[1] القلم 9:68. [2] القلم 9,8:68.

درگذر کرنا

زندگی میں ہمیں لوگوں کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ کسی نے سنگین مذاق کر دیا تو کوئی سخت بات کہہ دیتا ہے۔ کہیں بھری محفل میں دو آدمیوں میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ نقطۂ ہائے نظر اور آراء میں اختلاف سامنے آتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کی عادت ہے کہ بلاوجہ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں اور بات فراموش کر دینے یا درگذر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعض افراد تکبر کا شکار ہو کر دوسروں کا عذر قبول کرنے اور اُن کی غلطی معاف کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ درگذر کے اصول پر عمل نہ کر کے اپنے آپ کو مبتلائے عذاب کیے رکھتے ہیں۔ ان کا بنجر سینہ بغض اور کینے کی فصل سے آباد رہتا ہے اور وہ اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ کینے کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ حسد کی بیماری میں یہ خوبی زبردست ہے کہ وہ سب سے پہلے حسد کرنے والے کو برباد کرتی ہے، اس لیے آپ اپنے کو عذاب میں نہ ڈالیں۔ زندگی میں ایسی بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جن پر آپ مواخذہ نہیں کر سکتے، انتقام نہیں لے سکتے۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہو جائیں۔ ماضی بھول کر اپنا حال اور مستقبل سنوارنے کی کوشش کریں۔

رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ لوگ پُرسکون ہو گئے تو آپ خانۂ کعبہ میں گئے اور سواری پر بیٹھ کر اس کا طواف کیا، پھر عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بُلا

بھیجا۔ وہ آئے تو ان سے کعبہ کی چابی لی۔ اس کا قفل اتارا اور اندر گئے۔ کعبہ کی دیواروں پر آپ کو فرشتوں اور بعض دیگر افراد کی خود ساختہ تصویریں نظر آئیں۔ آپ نے ابراہیم علیہ السلام کی تصویر جس میں وہ پانسے کے تیر پکڑے قسمت کا حال معلوم کر رہے تھے، دیکھ کر کہا:

''اللہ انھیں مارے۔ انھوں نے ہمارے شیخ کو پانسے کے تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنے والا بنا دیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو بھلا پانسے کے تیروں سے کیا واسطہ! ''ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ مسلم حنیف (یکسو) تھے اور مشرکین سے نہیں تھے۔'' [1]

پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے وہ تمام تصویریں مٹا دی گئیں۔ آپ کو کعبے میں لکڑی کا کبوتر ملا جسے آپ نے اپنے ہاتھ سے توڑ کر پھینک دیا، پھر آپ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے۔ تمام مسلمان اور کافر مسجد میں جمع تھے اور آپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد آپ نے کعبہ میں دو رکعت نماز ادا کی اور زمزم کی طرف آئے۔ کنویں میں جھانکا، پانی منگا کر پیا اور وضو کیا۔ لوگ آپ کے وضو کے پانی پر ٹوٹ پڑے۔ مشرکین یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے اور کہنے لگے:

''ہم نے آج تک کسی بادشاہ سے اس کی رعایا کی یہ محبت نہیں دیکھی۔''

پھر آپ ﷺ مقامِ ابراہیم کی طرف آئے جو کعبہ سے متصل تھا اور اسے کعبہ سے ذرا دور ہٹا دیا، پھر بابِ کعبہ پر کھڑے ہوئے اور لوگوں پر نظر ڈالی۔ آپ نے کہنا شروع کیا:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی۔ اس نے تنہا لشکروں کو شکست دی۔ سن لو! ہر منصب یا خون یا مال جس کا دعویٰ کیا جائے، میرے ان دونوں قدموں کے نیچے رکھا ہے، سوائے بیت اللہ کی سدانت (دیکھ بھال) اور حاجیوں کی سقایت

(پانی پلانا) کے۔‘‘

پھر آپ ﷺ نے بعض شرعی احکامات بیان کرتے ہوئے کہا:

’’غور سے سنو! قتلِ خطا جو کوڑے یا ڈنڈے سے ہو، شبہ عمد ہے۔ اس میں سو اونٹوں کی دیتِ مغلظہ ہے۔ ان میں چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں۔‘‘

آپ نے اس خطبے میں کئی اور باتیں بھی کہیں۔

پھر آپ نے سردارانِ قریش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

’’اے معشرِ قریش! اللہ نے جاہلیت کا غرور اور آباء کا فخر تم سے دور کر دیا ہے۔ لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○﴾

’’اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قومیں اور قبائل بنایا تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے متقی ہے۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، نہایت باخبر ہے۔‘‘[2]

رسول اللہ ﷺ عزت و وقار کی چوٹیوں پر براجمان بابِ کعبہ پر کھڑے تھے اور مشرکین کے چہروں کو بغور دیکھ رہے تھے جو انتہائی ذلت کے عالم میں سر جھکائے ہوئے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں انھوں نے رسولِ کریم ﷺ کو جھٹلایا اور آپ کی اہانت کی تھی۔ انھوں نے رسولِ کریم کے سر پر سجدے کی حالت میں یہیں گندگی ڈالی تھی۔ آج اسی نبی کے روبرو قریش شکست خوردہ کھڑے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

"اے معشرِ قریش! بتاؤ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"[3]

قریش مکہ نے جھرجھری لے کر کہا: "آپ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ آپ اخِ کریم (اچھا بھائی) اور ابنِ اخِ کریم ہیں۔"

تعجب ہے! انھوں نے اس اخِ کریم سے جو سلوک کیا تھا، کیا وہ بھول چکے تھے؟

مجنون و ساحر و کاہن کی وہ گالیاں کیا ہوئیں؟

یہ اخِ کریم تھا اور اس کا والد بھی اخِ کریم تھا تو تم لوگوں نے اس سے جنگ کیوں کی؟

کمزور مسلمانوں کو جو تم نے مبتلائے عذاب کیے رکھا تھا، اس کا کیا جواب ہے؟

یہ بلال کھڑے ہیں جن کی پشت پر اذیتوں کے نشان آج بھی موجود ہیں!

وہ سامنے کھجور کا درخت ہے جس کے قریب سمیہ و یاسر کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا! ان کا بیٹا عمار اس جرم کا عینی شاہد ہے۔

تم نے نبی کریم اور کمزور مسلمانوں کو شعبِ ابی طالب میں تین سال محبوس رکھا حتی کہ انھیں بھوک کی شدت سے درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرنا پڑا، اس ظلم کی بابت تمھارا کیا خیال ہے؟

ننھے منے بچے بلکتے رہے، بوڑھے آہیں بھرتے رہے لیکن تم لوگوں کو رحم نہ آیا۔ تمھیں نہ کسی حاملہ عورت کا خیال آیا نہ دودھ پلانے والی کا۔

بدر و احد کے میدانوں میں تم نبی کریم ﷺ سے برسرِ پیکار رہے۔ خندق میں ان کے خلاف لشکر گری کی اور آج وہ اخِ کریم ہیں۔

نبی کریم ﷺ عمرے کے لیے مکہ آئے لیکن تم نے روک دیا۔ وہ حدیبیہ میں بیٹھے رہے۔ نبی کریم ﷺ کے عم ابو طالب کو تم نے بسترِ مرگ پر اسلام لانے سے روک دیا۔

تلخ یادوں کی لمبی فہرست تھی جو مسلمانوں کے دلوں میں تازہ ہو گئی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ چاہتے تو قریشِ مکہ کو سخت ترین سزائیں دے سکتے تھے لیکن آپ نے کینوں اور نفرتوں کی فصل جڑ سے اکھاڑتے ہوئے تاریخ ساز جملہ کہا:

«اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ»

''جاؤ! تم آزاد ہو۔''

قریش کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ فرطِ مسرت سے اُن کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ کیا واقعی رسول اللہ ﷺ نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟ انھیں یقین نہیں آتا تھا۔

پھر آپ نے کعبہ کے اردگرد نظر دوڑائی۔ تین سو ساٹھ بت تھے جن کی اللہ کو چھوڑ کر، اس کے ذی شان گھر میں عبادت کی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ اپنے مبارک ہاتھوں سے اُن بتوں پر ضربیں لگاتے اور وہ گرتے جاتے۔ آپ کہہ رہے تھے:

''حق آ گیا اور باطل اختتام کو پہنچا، حق آ گیا اور باطل نہ ابتدا میں آتا ہے اور نہ دوبارہ آئے گا۔''[4]

قریش کے چند سرکش اور کفر کی مہاتمائیں جن کی تاریخ کے اوراق سیاہ تھے، نبی ﷺ کے اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ آنے سے پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ ان میں ایک کافر صفوان بن امیہ تھا جو مکہ سے بھاگا اور حیران تھا کہ کہاں جائے۔ آخر وہ جدہ چلا گیا تاکہ وہاں سے سمندر کے راستے یمن پہنچ جائے۔ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کا عفوو درگذر دیکھا تو عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور عرض کی:

''یا نبی اللہ! صفوان بن امیہ اپنی قوم کا سردار ہے۔ آپ کے ڈر سے بھاگا ہے تاکہ اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دے۔ اللہ آپ پر رحم کرے، اسے امان دے دیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے خوش دلی سے فرمایا:

”اسے امان ہے۔“

عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے امان کی کوئی نشانی دیجیے۔“

آپ نے انھیں وہ عمامہ دیا جسے پہن کر آپ مکہ میں داخل ہوئے تھے تا کہ صفوان اسے دیکھے اور عمیر رضی اللہ عنہ کی سچائی کا اطمینان کر لے۔ عمیر عمامہ لے کر نکلے اور صفوان سے جا ملے جو سمندری سفر کے لیے پَر تول رہا تھا۔ عمیر نے کہا:

”صفوان! تم پر میرے ماں باپ فدا۔ اپنی جان کے متعلق اللہ سے ڈرو اور اسے ہلاکت میں نہ ڈالو۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمھارے لیے امان کا پیغام لایا ہوں۔“

صفوان بولا: ”تمھارا ستیاناس ہو۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

اس نے مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے تھے، ان کے انجام سے خائف تھا۔

عمیر نے پھر کہا: ”صفوان! تم پر میرے ماں باپ قربان۔ اللہ کے رسول سب سے افضل، سب سے نیکوکار، سب سے بردبار اور سب سے اچھے ہیں۔ وہ تمھارے بھتیجے ہیں۔ ان کی عزت تمھاری عزت ہے۔ ان کا شرف تمھارا شرف ہے۔ ان کی بادشاہی تمھاری بادشاہی ہے۔“

صفوان نے کہا: ”مجھے ان سے اپنی جان کا خوف ہے۔“

عمیر نے کہا: ”وہ اس سے زیادہ متحمل مزاج اور کریم ہیں۔“

اس پر صفوان عمیر کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں مکہ پہنچے۔ عمیر، صفوان کو لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صفوان نے کہا: ”یہ کہتا ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”انھوں نے سچ کہا ہے۔“

صفوان کہنے لگا: ”جہاں تک میرے اسلام لانے کا تعلق ہے، آپ مجھے دو ماہ کی

مہلت دیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

”آپ کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔“[5]

چند دن بعد ہی صفوان بن امیہ مسلمان ہو گیا۔

ماضی کی تلخیاں بھلا کر لوگوں کو معاف کر دینا کتنی اچھی عادت ہے!

بلاشبہ ایسی عادات اپنانا عظیم افراد ہی کا شیوہ ہے جو اپنے اخلاق کی بدولت انتقام، کینے اور حسد جیسی پستیوں سے بالاتر رہتے ہیں۔ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اتنے سے وقت کو حسد اور کینے کی غلاظتوں سے آلودہ کرنا عقل مندی نہیں ہے۔

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ”میں اور میرے دو ساتھی مدینہ آئے۔ ہم لوگوں کے درپے ہوئے لیکن کسی نے ہماری مہمانی نہ کی۔ پھر ہم نبی ﷺ کے ہاں آئے اور انھیں بتایا۔ آپ نے ہمیں ایک گھر میں ٹھہرایا جہاں چار بکریاں تھیں۔ آپ نے مجھ سے کہا:

”مقداد! ان بکریوں کا دودھ دوہیں۔ دودھ کے چار حصے کریں اور ہر ایک کو اس کا حصہ دیں۔“[6]

مقداد کہتے ہیں: ”میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کیا کرتا تھا۔“

مقداد رضی اللہ عنہ ہر شام بکریوں کا دودھ دوہتے، خود پیتے، اپنے دونوں ساتھیوں کو پلاتے اور نبی ﷺ کے لیے ان کا حصہ بچا رکھتے۔ آپ موجود ہوتے تو دودھ پی لیتے۔ موجود نہ ہوتے تو وہ لوگ آپ کے حصے کا دودھ سنبھال کر رکھ دیتے۔ آپ تشریف لاتے تو وہ دودھ آپ کو پیش کر دیتے۔ ایک رات مقداد نے معمول کے مطابق بکریوں کا دودھ دوہا، اس کے چار حصے کیے، تین حصے انھوں نے اور اُن کے ساتھیوں نے نوشِ جاں کیے اور چوتھا حصہ نبی ﷺ کے لیے رکھ دیا۔ آپ کو آنے میں دیر ہو گئی۔ مقداد بستر پر لیٹے سوچنے

لگے: ”نبی ﷺ انصار کے کسی گھر گئے ہوں گے اور انھوں نے آپ کو کھانا کھلا دیا ہوگا، اس لیے اُٹھو اور بچا کر رکھا دودھ پی لو۔“ ان کے دل میں بار بار یہی خیال آتا۔ بالآخر انھوں نے اٹھ کر دودھ پی لیا۔ نبی ﷺ کے لیے کچھ نہ بچا۔

مقداد کہتے ہیں: ”وہ دودھ میرے پیٹ میں داخل ہو کر قرار پا گیا تو مجھے اپنے کیے پر سخت پشیمانی ہوئی۔ میں نے کہا: ابھی نبی ﷺ آئیں گے۔ آپ کو بھوک پیاس لگی ہوگی۔ جب پیالے میں آپ کو کچھ نہ ملے گا تو آپ میرے لیے بددعا کریں گے۔ یہ سوچ کر مارے غم کے میں منہ پر کپڑا ڈالے لیٹا رہا۔ رات کے دوسرے پہر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے اتنی آواز سے سلام کیا کہ بیدار سن لے اور سوتا نہ جاگے۔ مقداد رضی اللہ عنہ بستر میں لیٹے آپ کی طرف دیکھتے رہے۔ آپ دودھ کے برتن کی طرف بڑھے۔ ڈھکنا ہٹا کر دیکھا تو وہ خالی تھا۔ اس پر آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ مقداد بہت گھبرائے اور دل ہی دل میں کہنے لگے: ”اب اللہ کے رسول میرے لیے بددعا کریں گے۔“ وہ کان لگا کر سننے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی:

”اے اللہ! جو مجھے پلائے تو اسے پلا اور جو مجھے کھلائے تو اسے کھلا۔“

مقداد رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ سن کر کہا: ”میں رسول اللہ ﷺ کی دعا کا مصداق بنوں گا۔“[7]

یہ کہہ کر وہ اٹھے، چھری ہاتھ میں لی اور بکریوں کی طرف آئے تا کہ بکری ذبح کر کے نبی ﷺ کو کھلائیں۔ سب سے موٹی تازی بکری کے انتخاب کے لیے وہ بکریاں ٹٹولنے لگے۔ اتنے میں ان کا ہاتھ ایک بکری کے تھن پر پڑا تو وہ دودھ سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے دوسری بکری کے تھن چھوئے تو ان میں بھی دودھ اٹا ہوا تھا۔ انھوں نے سب بکریاں چھو کر دیکھیں۔ سب کے تھن دودھ سے پُر تھے۔ انھوں نے گھر کے بڑے برتن میں بہت سا دودھ دوہا۔ برتن لبالب بھر گیا تو اسے نبی ﷺ کو پیش کیا اور کہا:

''اے اللہ کے رسول! نوش کیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اتنا زیادہ دودھ دیکھا تو دریافت کیا:

''مقداد! آج آپ لوگوں نے دودھ نہیں پیا؟''

مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! نوش کیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:

''مقداد! آخر ماجرا کیا ہے؟''

مقداد رضی اللہ عنہ بولے: ''پہلے نوش کیجیے، پھر بتاتا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے دودھ پیا اور برتن مقداد رضی اللہ عنہ کو پکڑا دیا۔

مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اور پیجیے۔''

آپ نے پھر پیا اور برتن اُنھیں دے دیا۔

''اور نوش کیجیے، اے اللہ کے رسول!'' مقداد رضی اللہ عنہ نے پھر کہا۔

مقداد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ خوب سیر ہو گئے اور میں آپ کی دعا کا مصداق بن گیا تو ہنس پڑا۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: ''مقداد کیا بات ہے؟''

میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آج آپ دیر سے آئے تھے۔ مجھے بھوک لگی۔ میں نے دل میں کہا کہ آپ نے انصار کے کسی گھر کھانا کھا لیا ہوگا۔''

یہ کہہ کر مقداد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو ساری بات تفصیل سے بتائی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ بکریوں کے تھن دوبارہ اتنی جلدی دودھ سے کیسے بھر گئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

”یہ صرف اللہ کی رحمت کا کرشمہ ہے۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہم آپ کے دونوں ساتھیوں کو بھی بیدار کرتے اور وہ بھی اس رحمت سے فیض یاب ہو لیتے۔“

مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا:

”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! رحمت کی برکت میں اور آپ نے حاصل کر لی تو مجھے پروا نہیں کہ کوئی اسے حاصل کر پاتا ہے یا نہیں۔“[8]

نقطۂ نظر

”زندگی ”کچھ لو اور کچھ دو“ کا نام ہے۔ آپ کا ”دینا“ ”لینے“ سے زیادہ ہونا چاہیے۔“

---

[1] البداية والنهاية: 300/4. [2] الحجرات 13:49. مسند أحمد: 412/5، وسنن أبي داود، حديث: 1905. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 55,54/4. [4] فتح الباري: 18:8. [5] صحيح البخاري، حديث: 4287، وصحيح مسلم، حديث: 1781. [6] البداية والنهاية: 307/4. [7] مسند أحمد: 54/6. [8] مسند أحمد: 3/6.

جود و سخا

رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا:

''آپ لوگوں کا سردار کون ہے؟''

انھوں نے کہا: ''ہمارا سردار فلاں ہے، اگرچہ ہم اسے بخیل سمجھتے ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''بخل سے بڑی بیماری بھی کوئی ہے؟ آپ لوگوں کا سردار فلاں گھنگریالے بالوں والا سفید آدمی ہے۔''[1]

ان جملوں کا تبادلہ رسول اللہ ﷺ اور ایک عرب قبیلے کے لوگوں کے درمیان ہوا جو اسلام لائے تھے۔ آپ نے ان کے سردار کے بارے میں پوچھا تھا تاکہ ان کے اسلام کے بعد مناسب سمجھیں تو اسی کو برقرار رکھیں ورنہ بدل دیں۔

جی ہاں! بخل سے بڑی بیماری اور کوئی نہیں!

کنجوسی نہایت بُری عادت ہے۔ لوگ اسے بہت ناپسند کرتے ہیں اور وہ اُن پر بے حد گراں گزرتی ہے۔ بے چارے کنجوس لوگ، نہ اپنے گھروں میں دعوت کا اہتمام کر سکتے ہیں، نہ تحفہ دے سکتے ہیں، نہ اپنی تراش خراش پر توجہ دیتے ہیں، پیسے بچانے کی خاطر کوئی اچھی خوشبو تک استعمال نہیں کر سکتے۔ سخی آدمی اپنے ساتھیوں اور ہم چشموں پر فوقیت

رکھتا ہے۔ احباب سے قریب ہوتا ہے۔ بھائی بند مجلس جمائیں تو اسی کے گھر میں، کسی کو کوئی ضرورت ہو تو اسی کے دروازے پر آتا ہے۔ وہ سخاوت کے ذریعے سے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔

مسلمان کا اکرام کرتے وقت ضروری ہے کہ آپ کی نیت درست ہو۔ مسلمانوں سے الفت و محبت کے برتاؤ سے آپ کا مقصود یہی ہونا چاہیے کہ اللہ کا تقرب حاصل کیا جائے۔ نیت میں شہرت یا مدح وستائش کے حصول کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تین لوگ ہیں جن سے سب سے پہلے آگ بھڑکائی جائے گی۔''

اور ان میں کا ایک آدمی وہ ہے جو بہت خرچ کرے گا تاکہ اسے سخی کہا جائے۔ اب پوری روایت سنیے۔

سفیان رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں مدینہ میں داخل ہوا۔ میں نے ایک آدمی دیکھا جس کے اردگرد لوگ جمع ہیں۔ میں نے پوچھا:

''یہ کون ہے؟''

''ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ)۔'' لوگوں نے بتایا۔

میں قریب جا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ لوگوں سے احادیث بیان کر رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئے اور لوگ چلے گئے تو میں بولا: ''میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھ سے وہ حدیث بیان کریں جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی اور خوب سمجھی۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں ایسا ہی کروں گا۔ میں آپ سے ضرور وہ حدیث بیان کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے بیان کی۔ میں نے اسے خوب سمجھا اور یاد کیا۔''

پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئے اور کہا:

''میں آپ سے ضرور وہ حدیث بیان کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ میں اور رسول اللہ ﷺ اس گھر میں تھے۔ یہاں میرے اور ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ چند ثانیے بعد ہوش میں آئے، چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ کو ضرور ہی وہ حدیث سناؤں گا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ میں اور وہ اس گھر میں تھے اور یہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔''

اتنا کہا اور بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو کر منہ کے بل گر پڑے۔ میں نے دیر تک انھیں سہارا دیے رکھا، پھر ہوش میں آ کر بولے:

''مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کی طرف اُن کے فیصلے کرنے اترے گا۔ ہر امت گھٹنوں کے بل بیٹھی ہو گی۔ سب سے پہلے وہ تین آدمیوں کو بلائے گا۔ ایک وہ جس نے قرآن یاد کیا۔ دوسرا وہ جو اللہ کی راہ میں مقتول ہوا اور تیسرا وہ جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا تھا۔ قاریِ قرآن سے اللہ دریافت کرے گا:

''میں نے جو کلام اپنے رسول پر نازل کیا تھا، تجھے نہیں سکھایا تھا؟''

وہ جواب دے گا:

''میرے رب! کیوں نہیں!''

اللہ فرمائے گا:

''اچھا تو نے جو کچھ سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟''

قاریِ قرآن کہے گا:

''میں دن رات نمازوں میں اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔''

اللہ اس سے فرمائے گا:

”تو نے جھوٹ بولا۔“

فرشتے بھی کہیں گے: ”تم نے جھوٹ بولا۔“

اللہ عزوجل فرمائے گا:

”تو نے چاہا تھا کہ کہا جائے: ”فلاں قاری ہے۔“ تو یہ کہا جا چکا ہے۔“

(یعنی دنیا میں تمھارا بدلہ مل چکا۔ تم نے قرآن کی تلاوت سے یہی چاہا تھا کہ لوگ تعریف کریں۔ لوگوں نے ستایش کردی تھی کہ فلاں قاری ہے۔)

پھر امیر آدمی لایا جائے گا اور اللہ فرمائے گا:

”میں نے تجھ پر رزق کے دروازے نہیں کھولے تھے، یوں کہ تجھے کسی کا محتاج نہیں چھوڑا؟“

وہ کہے گا: ”ہاں۔“

اللہ فرمائے گا:

”پھر میں نے تجھے جو کچھ عطا کیا، اسے تو نے کہاں خرچ کیا؟“

وہ کہے گا: ”میں (اس مال و دولت کے ذریعے سے) رشتہ داری جوڑتا اور صدقہ کرتا تھا۔“

اللہ فرمائے گا:

”تو نے جھوٹ بولا۔“

فرشتے بھی کہیں گے: ”تم نے جھوٹ بولا۔“

اللہ فرمائے گا:

”بلکہ تم نے چاہا تھا کہ کہا جائے: ”فلاں سخی ہے۔ تو یہ کہا جا چکا ہے۔“

پھر اللہ کی راہ میں مقتول لایا جائے گا۔

اس سے دریافت کیا جائے گا:
''تجھے کیوں قتل کیا گیا تھا؟''
وہ کہے گا: ''آپ نے اپنے رستے میں جہاد کا حکم دیا تھا۔ میں نے جنگ کی، یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔''
اللہ فرمائے گا:
''تو نے جھوٹ بولا۔''
فرشتے بھی اسے مخاطب کر کے کہیں گے: ''تم نے جھوٹ بولا۔''
اللہ فرمائے گا:
''بلکہ تیرا ارادہ تھا کہ کہا جائے: ''فلاں بہادر ہے۔'' تو یہ کہا جا چکا ہے۔''
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا:
''ابو ہریرہ! روزِ قیامت اللہ کی مخلوق میں سب سے پہلے انھی تینوں کے ذریعے سے آگ بھڑکائی جائے گی۔''[2]

چنانچہ اگر آپ کی نیت درست ہے تو یقیناً بھلائی آپ کا مقدر بنے گی۔
سب سے پیشتر اپنے گھر والوں، ماں باپ، بیوی بچوں پر خرچ کیجیے۔
پھر قریبی رشتے داروں سے نیکی کا سلوک کیجیے۔ اپنے آپ سے آغاز کیجیے، پھر ان افراد کی ضروریات پوری کیجیے جن کے آپ کفیل ہیں۔ بلاشبہ جن افراد کے نان ونفقہ کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے انھیں نظر انداز کر دینا بڑا گناہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انفاق (راہِ خدا میں خرچ کرنا) اور اسراف (فضول خرچی) میں فرق کرنا بھی ضروری ہے۔
قدیم محلے کی پرانی گلی سے ایک آدمی کا گزر ہوا۔ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو بوسیدہ کپڑے پہنے، کس مپرسی کے عالم میں کھنڈر نما گھر کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ اس نے

پوچھا: ''تم کون ہو؟''

لڑکی نے جواب دیا: ''میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔''

اس نے کہا: ''حیرت ہے۔ اتنے بڑے سخی کی بیٹی اور اس حال میں؟''

لڑکی کہنے لگی: ''ہمارے والد کی سخاوت ہی نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھ (انفاق فی سبیل اللہ سے کنارہ کشی نہ کر) اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے (اسراف بھی نہ کر) کہ ملامت وحسرت زدہ ہو کر بیٹھ جائے۔''[1]

سخی بلاشبہ قابلِ تعریف ہے لیکن فضول خرچ انسان مذمت کے قابل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل خرچ نہ کرنے اور حد سے زیادہ خرچ کرنے سے منع کیا ہے۔ اس نے ہمیں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ کشادہ دل اور سخی انسان تھے۔ آپ حریص، لالچی اور مفاد پرست نہیں تھے کہ اپنے بارے میں سوچیں اور کسی کی پروا نہ کریں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''اللہ کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں بھوک سے نڈھال ہو کر زمین سے جا لگتا تھا اور بھوک کے مارے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ ایک دن میں مسجد کے قریب لوگوں کے راستے میں بیٹھ گیا۔ ابو بکر گزرے۔ میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی۔ میں نے ان سے صرف اس لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ لیکن وہ آیت کی تفسیر بتا کر چل دیے۔ پھر عمر کا ادھر سے

گزر ہوا۔ میں نے ان سے بھی کتاب اللہ کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی۔ میں نے ان سے یہ سوچ کر سوال کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے لیکن وہ بھی آیت کی تفسیر بتا کر چلے گئے۔ ان دنوں صحابۂ کرام عام طور پر فاقے کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی مہمان آجاتا تو اس کے کھانے کو بھی کچھ نہ ہوتا۔ پھر ابوالقاسم (ﷺ) میرے قریب سے گزرے اور مجھے دیکھ کر مسکرا دیے۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر دل کی بات بھانپ گئے۔ چلتے چلتے فرمایا:

"ابوہر ؓ!" میں نے کہا: "لبیک یا رسول اللہ!"

"آجاؤ۔"

میں آپ کے پیچھے پیچھے گیا۔ آپ گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دی اور میں بھی اندر چلا گیا۔ ایک پیالے میں آپ کو تھوڑا سا دودھ نظر آیا۔ دریافت کیا:

"یہ دودھ کہاں سے آیا؟" گھر والوں نے کہا: "فلاں آدمی یا فلاں خاتون نے تحفہ بھیجا ہے۔"

فرمایا: "ابوہر ؓ!" میں نے کہا: "لبیک یا رسول اللہ۔"

"اہل صفہ کے پاس جاؤ اور انھیں بلا لاؤ۔"

اہلِ صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے اور مسجد نبوی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ اسباب۔ رسول اللہ ﷺ ان پر خاص شفقت کیا کرتے تھے۔ آپ کے پاس صدقہ آتا تو ان کے پاس بھیج دیتے اور اس میں سے کچھ نہ لیتے۔ تحفہ آتا تو انھیں بھی اس میں شریک کرتے۔ مجھے فکر پڑ گئی۔ میں نے سوچا: "اتنا سا دودھ اہلِ صفہ کے کس کام آئے گا۔" میں ہی یہ دودھ پی لیتا اور جسم میں کچھ طاقت آتی۔ اہلِ صفہ آئیں گے تو رسول اللہ ﷺ مجھی کو حکم دیں گے اور میں ہی

انھیں دودھ پیش کروں گا، پھر میرے لیے کیا بچے گا! لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔ بہرحال میں گیا اور انھیں بلا لایا۔ وہ آئے، آپ نے اجازت دی اور وہ گھر میں آ کر بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کیا:

''ابوہرؓ!''

میں نے کہا: ''لبیک یا رسول اللہ!''

''پیالہ اُٹھاؤ اور اہلِ صفہ کو دو۔''

میں باری باری سب کو پلانے لگا۔ سب سیر ہو گئے۔ پیالہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا۔ آپ نے پیالہ ہاتھوں میں اٹھایا، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: ''ابوہرؓ!''

''لبیک یا رسول اللہ!'' میں نے کہا۔

''اب میں اور تم رہ گئے۔''

''بالکل صحیح فرمایا، یا رسول اللہ۔''

''لو، بیٹھو اور پیو۔''

آپ ﷺ نے پیالہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔

میں نے بیٹھ کر پیا۔ فرمایا:

''اور پیو۔''

میں نے اور پیا۔

آپ ﷺ کہتے رہے:

''اور پیو۔''

یہاں تک کہ میں نے کہا: ''نہیں، قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، اب اس کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔''

فرمایا:

''اچھا، مجھے دکھاؤ۔''

میں نے پیالہ دیا، آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کا نام لے کر پیالے میں بچا دودھ پی لیا۔''[4]

جود وسخا کے بھی چند اسرار و رموز ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ کبھی آپ براہِ راست کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ اس شخص سے اچھائی کا سلوک کرتے ہیں جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

ایک دن میرا دوست مجھے ملنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں ٹافیاں اور کھلونے تھے۔ ان اشیاء پر میرے خیال میں اس کے چند ہی روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ اس نے تھیلا میرے ہاتھ میں دے کر کہا: ''یہ بچوں کے لیے لایا تھا۔'' بچے یہ چیزیں پا کر بہت خوش ہوئے اور انھیں خوش دیکھ کر میں بھی یقیناً خوش ہوا۔

اسلاف میں ایک عالم ہو گزرے ہیں جو نادار تھے۔ ان کے شاگرد وقتاً فوقتاً انھیں تحفے دیتے رہتے تھے۔ یہ تحفے زیادہ تر کھجور یا آٹے کی شکل میں ہوتے تھے۔ تحفہ جب تک باقی رہتا، شیخ تحفہ دینے والے کا اکرام کرتے اور اس کی طرف متوجہ رہتے۔ تحفہ ختم ہو جاتا تو وہ اپنے سابقہ رویے پر واپس آ جاتے۔

ایک شاگرد نے سوچا کہ شیخ کو کوئی ایسی شے تحفے میں دینی چاہیے جو کم قیمت ہو اور تا دیر باقی رہے۔ اس نے نمک کا تھیلا شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ دو ایسی چیزیں بتائیں جو دوست کو تحفے میں دی جا سکتی ہوں تو میں کہوں گا: ''قیمتی اور عمدہ عطر اور دیوار کی گھڑی (Wall clock)۔'' ان دونوں میں سے بھی تحفے کے طور پر دینے کے لیے میرا پہلا انتخاب دیوار کی گھڑی ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تا دیر باقی رہتی ہے اور تحفہ دینے والے کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ اس کی قیمت بھی

عموماً مناسب ہی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ایک شاگرد کو دیوار کی گھڑی تحفے میں دی تھی۔ وہ کالج سے فراغت پا گیا اور کئی سال گزر گئے۔ میں ایک شہر لیکچر دینے کے لیے گیا تو وہ میرے لیکچر میں حاضر ہوا اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے مہمان خانے میں قدم رکھا تو اس نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ میرے پاس سب سے قیمتی تحفہ ہے۔''

ایک بات رہ گئی کہ اس گھڑی کی قیمت اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی معنوی قیمت کہیں زیادہ تھی۔

نقطۂ نظر

''لوگوں کے دل جیتنے کے چند مواقع ہوتے ہیں جو بار بار نہیں آتے۔''

---

1 الروض الداني إلى المعجم الصغير للطبراني: 199/1، حديث: 317، ومجمع الزوائد: 315/9، حديث: 15743و15745. 2 جامع الترمذي، حديث: 2382، وصحيح ابن خزيمة، حديث: 2482. 3 بنی إسراء يل 29:17. 4 صحيح البخاري، حديث: 6452.

ایذا رسانی سے بچنا

ایک دن رسول اللہ ﷺ اصحاب کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا:

''جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟''

صحابۂ کرام نے جواب دیا:

''ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار اور دنیا کا مال و متاع نہ ہو۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو روزِ قیامت نماز، روزے اور زکاۃ کے اعمال لائے گا۔ اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان باندھا ہوگا، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں میں سے سب کے بدلے چکائے گا۔ حساب چکاتے چکاتے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو لوگوں کی خطائیں اُٹھا کر اس پر ڈال دی جائیں گی، پھر اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔''[1]

عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا۔ نہ عورت کو اور نہ کسی غلام کو،

الا یہ کہ آپ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں ہوتے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو اذیت دی گئی ہو اور آپ نے اس کا انتقام لیا ہو۔ ہاں! اللہ کے محارم میں سے کسی شے کی بے حرمتی کی جاتی تو اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔''[2]

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو آدمی اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے لوگوں کو اذیت دیتا ہے، لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اسے عذاب میں ڈال دیتا ہے اور اس کی تباہی دکھا کر لوگوں کے سینے ٹھنڈے کرتا ہے۔

میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو حافظِ قرآن اور نیک آدمی ہیں۔ بیمار لوگ اُن کے پاس آتے ہیں۔ وہ قرآن پڑھ کے دم کر دیتے ہیں اور اللہ ان کے ہاتھوں جسے چاہتا ہے شفا دے دیتا ہے۔

ایک دن اُن صاحب کے پاس ایک آدمی آیا جو چہرے مہرے سے خاصا مالدار اور آسودہ حال دکھائی دیتا تھا۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا اور بولا:

''یا شیخ! میرے بائیں ہاتھ میں شدید درد ہے۔ نہ رات کو نیند آتی ہے، نہ دن کو چین ملتا ہے۔ بے شمار ڈاکٹروں کو دکھایا۔ کئی ٹیسٹ کرائے لیکن بے سود۔ درد ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔

یا شیخ، میں کاروباری آدمی ہوں اور کئی کمپنیوں کا مالک ہوں۔ لگتا ہے مجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے یا کسی بد بخت نے مجھ پر جادو کرا دیا ہے۔''

وہ صاحب بتاتے ہیں:

''میں نے اس پر سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی، سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ چند دنوں بعد دوبارہ اسی درد کی شکایت لے کر آیا۔ میں نے اس پر قرآن پڑھا۔ وہ چلا گیا۔ چند دنوں بعد سہ بارہ آیا، میں نے پھر قرآن

پڑھا لیکن کوئی بہتری نہ آئی۔ درد روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ میں نے اس سے کہا:

''ہوسکتا ہے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے وہ آپ کے کسی گناہ کی سزا ہو۔ آپ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہو یا کسی کا حق مارا ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو فوراً توبہ کیجیے اور جس پر ظلم کیا ہے اس سے معافی مانگیے اور جس کا حق مارا ہے جلد از جلد اس کا حق ادا کر دیجیے۔''

اس آدمی نے میری بات کو اہمیت نہ دی اور متکبرانہ انداز میں کہا: ''میں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا، نہ کسی کا حق مارا ہے۔ آپ کے مشورے کا شکریہ۔''

یہ کہہ کر وہ نکل گیا۔ چند دن گزر ے۔ وہ آدمی دوبارہ نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اسے میری بات پر غصہ آیا ہے، تاہم پشیمانی نہیں تھی کیونکہ میں نے اس کی خیر خواہی کی تھی۔ ایک دن اچانک سرِ راہ اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ میری جانب آیا۔ خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

''کیا ماجرا ہے؟''

وہ بولا: ''الحمد للہ، اب میرا ہاتھ بغیر کسی علاج اور دوا کے، بالکل ٹھیک ہے۔''

میں نے حیرت سے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

کہنے لگا: ''جب میں آپ کے ہاں سے آیا تو مجھے آپ کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ میرا ذہن ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ چند سال پیشتر جب میں اپنا محل تعمیر کر رہا تھا، محل کے پہلو میں موجود خالی زمین خرید کر اس میں ضم کرنا چاہتا تھا۔ یہ زمین ایک بیوہ کی ملکیت تھی جس کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی زمین فروخت کر دے لیکن اس نے انکار کر دیا اور بولی: ''زمین بیچ کر میں کیا کروں گی۔ یہ ان یتیموں کی امانت ہے۔ بڑے ہوں گے تو خود ہی سنبھال لیں گے۔ اب بیچ دی تو ضائع ہی ہونی ہے۔'' میں نے بارہا اسے پیغام بھیجا لیکن وہ ہر بار انکار کرتی رہی۔ میں

سوچ میں پڑ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں نے اپنے خاص ذرائع سے وہ زمین ہتھیالی۔''

میں نے پوچھا:

''خاص ذرائع سے؟ کیا مطلب؟''

اس نے کہا: ''ہاں۔ میرے وسیع و عریض تعلقات، جنھیں استعمال کر کے میں نے بیوہ کی زمین پر تعمیر کی اجازت حاصل کر لی اور اسے اپنی زمین میں ضم کر لیا۔''

میں نے فکر مندی سے استفسار کیا:

''اور یتیموں کی والدہ کا کیا بنا؟''

وہ کہنے لگا: ''یتیموں کی ماں نے جب یہ سنا کہ زمین ہتھیالی گئی ہے تو وہ بلا ناغہ آتی، چیختی چلاتی اور تعمیر کا کام کرتے مزدوروں اور معماروں کو روکنے کی کوشش کرتی۔ وہ اسے پاگل سمجھ کر ہنستے اور نظر انداز کر دیتے۔ دراصل وہ نہیں، میں پاگل ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ روتے روتے کبھی دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتی اور مجھے بددعائیں بھی دیتی۔ ظلم کی یہ کہانی مجھے یاد آئی تو میں اس بیوہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ آخر میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ میں اس کے سامنے رویا، معافی مانگی اور اس وقت تک گڑگڑاتا رہا جب تک اس نے اپنی زمین کے عوض دوسری زمین لینا قبول نہ کر لیا۔ اس نے مجھے معاف کر دیا اور میرے لیے دُعا کی۔ واللہ! ابھی اس نے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ مجھے اپنے بدن میں عافیت اترتی محسوس ہوئی۔''

یہ کہہ کر وہ چند ثانیے سر نہوڑائے خاموش رہا، پھر سر اٹھا کر بولا:

''اور اللہ کے حکم سے اس کی دعا نے مجھے فائدہ پہنچایا اور جس درد نے سارے ڈاکٹروں کو عاجز کر دیا تھا، مجھے اس سے نجات ملی۔

عبرت

نَامَتْ عُيُونُكَ وَالْمَظْلُومُ مُنْتَبِهٌ
يَدْعُو عَلَيْكَ وَعَيْنُ اللّٰهِ لَمْ تَنَمِ

''تیری آنکھ سو گئی اور مظلوم جاگ کر تیرے لیے بددعا کرتا رہا۔ یاد رکھ، اللہ کی آنکھ نہیں سوتی۔''

[1] صحيح مسلم، حديث: 2581، وجامع الترمذي، حديث: 2418. [2] صحيح مسلم، حديث: 2328.

دشمنیاں نہ پالیں

انسان کو لوگوں سے واسطہ پڑے تو عجیب وغریب قسم کے مزاج سامنے آتے ہیں۔ کوئی غصے والا ہے تو کوئی ٹھنڈے دل کا متحمل مزاج۔ کوئی ہوشیار چالاک ہوتا ہے اور کوئی کند ذہن غبی۔ کوئی پڑھا لکھا اور کوئی ان پڑھ جاہل۔ کوئی حسنِ ظن رکھنے والا ہوتا ہے اور کوئی بدگمانی کرنے والا ہوتا ہے۔

ظالم اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج سمجھتا ہے۔ بدھو سمجھتا ہے کہ وہ بہت ہوشیار ہے۔ بے وقوف کا خیال ہے کہ وہ دانائے سبل ہے۔

جن دنوں میں سیکنڈری اسکول کا طالب علم تھا، ہمارے ہاں ایک گراں بار مہمان وارد ہوا۔ شاید اس نے ابتدائی تعلیم بھی پوری طرح حاصل نہیں کی تھی، البتہ وہ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ جس وقت وہ ہمارے گھر آیا، میں ایک شرعی مسئلے میں الجھا ہوا تھا اور مجھے اس کا کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سامانِ تواضع اس کے سامنے رکھا اور فون اٹھا کر شیخ امام عبدالعزیز بن باز کا نمبر ملانے لگا تا کہ اُن سے مسئلے کا حل دریافت کروں۔ شیخ نہیں ملے۔ مہمانِ گرامی نے مجھے اس درجہ مصروف دیکھا تو استفسار کیا کہ تم کس سے رابطہ کر رہے ہو۔

میں نے جواب دیا:

''شیخ ابن باز سے۔ مجھے ان سے ایک اہم فتویٰ پوچھنا ہے۔''

اس پر میرے مہمانِ گرامی نے پورے اعتماد سے کہا: ''سبحان اللہ! ابن باز! جبکہ میں موجود ہوں؟''

اسی طرح کے کئی خوش فہم لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑ سکتا ہے، آپ اُن کی گراں باری برداشت کیجیے اور ان سے نہایت نرمی کا برتاؤ کریں۔ بقدر امکان کوشش کریں کہ دشمنیاں مول نہ لیں۔ آپ کو ان لوگوں کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ جس قدر ہو سکے اپنا دامن بچائیے اور اپنے آپ کو عذاب میں نہ ڈالیے۔

[illegible]

''زندگی بہت مختصر ہے۔ اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نہ کیجیے۔''

زُبان بادشاہ ہے

کبھی کبھی میں لوگوں کی آپس کی شکر رنجیوں اور عداوتوں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ وہ کیونکر پیدا ہوتی ہیں۔ دشمنیوں کے سبب لوگ ایک دوسرے کو دیکھنا، باہمی مجلسوں میں بیٹھنا اور دوسروں کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے، حتی کہ جس دعوت میں وہ مدعو ہوں اُس میں شرکت کرنا بھی انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ انسان کو اس پریشان کن صورتِ حال سے دوچار کرنے والی شے زبان ہے۔ معاشرے میں جنم لینے والے زیادہ تر حادثات کا تعلق زبان ہی سے ہے۔ غیبت، چغلی اور گالی گفتار کی وجہ سے بھائی بھائیوں سے جدا ہو جاتے ہیں اور میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے، کسی شاعر نے زبان کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا:

لِسَانُ الْفَتٰى نِصْفٌ وَّ نِصْفٌ فُؤَادُهٗ

فَلَمْ يَبْقَ إِلَّا صُورَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ

”آدمی کی زبان اس کا نصف اور دوسرا نصف دل ہے۔ اس کے بعد صرف خون اور گوشت پوست کی ایک صورت ہی باقی رہ جاتی ہے۔“

ہم دوسروں تک اپنے افکار ونظریات عمدہ طریقے سے بھی پہنچا سکتے ہیں، پھر بداسلوبی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے تمام دانت گر چکے ہیں۔ بادشاہ نے معبّر بلوایا اور اس سے خواب بیان کیا۔ معبّر نے خواب سنا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اعوذ باللہ اعوذ باللہ کہنے لگا۔ بادشاہ نے گھبرا کر دریافت کیا: ''کیا تعبیر ہے اس خواب کی؟''

معبّر نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''چند سال کے بعد آپ کے خاندان کے سب افراد وفات پا جائیں گے اور آپ سلطنت میں اکیلے رہ جائیں گے۔''

یہ سُن کر بادشاہ طیش میں آ گیا۔ اس نے معبّر کو خوب گالیاں دیں اور کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے دوسرا معبّر حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وہ آیا تو بادشاہ نے اسے خواب سنایا اور تعبیر پوچھی۔ معبّر خوش رُوئی سے مُسکرایا اور بولا: ''خوش خبری ہو۔ سراسر خیر ہے۔ سراسر بھلائی ہے، بادشاہ سلامت۔''

بادشاہ نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

معبّر نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا: ''اس کی تعبیر یہ ہے کہ آپ کی عمر لمبی ہوگی، آپ خاندان میں سب سے آخر میں فوت ہوں گے اور تمام عمر بادشاہ رہیں گے۔''

بادشاہ یہ تعبیر سن کر بے حد خوش ہوا اور معبّر کو انعام و اکرام سے نوازا۔

بات ایک ہی تھی لیکن مختلف طریقوں سے کہی گئی۔ پہلی تعبیر سے بادشاہ ناراض ہوا اور وہی بات دوسرے انداز سے کہی گئی تو بادشاہ خوش ہوا اور معبّر کو انعام سے نوازا۔

واقعی! زبان سرداروں کی سردار ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُولُ: اتَّقِ اللّٰهَ فِينَا، فَإِنَّمَا نَحْنُ بِكَ، فَإِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا، وَإِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا»

''جب ابنِ آدم صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان کے سامنے عرض گزار ہوتے ہیں: ''ہمارے متعلق اللہ سے ڈرنا۔ ہم تیری ہی بدولت ہیں۔ تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے۔ تو ٹیڑھی ہوئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔'' [1]

ہاں! واللہ! زبان سردار ہے۔ خطبۂ جمعہ میں اس کا طوطی بولتا ہے۔ لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں اس کا ڈنکا بجتا ہے۔ تجارت کے معاملات میں یہ سردار ہے۔ وکالت کے پیشے میں اس کی عمل داری ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان زبان جیسی نعمت سے محروم ہو، بول نہ سکتا ہو تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ نہیں! بلکہ عزمِ مصمم کا حامل شخص بہت سی صلاحیتوں کے فقدان کے باوجود میدانِ عمل میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ابو عبداللہ میرے دیگر احباب سے مختلف نہیں۔ لیکن ایک شے اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ ہے اس کا بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ وہ ہمیشہ گوناگوں دعوتی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ ان میں سے ایک نمایاں سرگرمی اس کا گونگے بہرے افراد کے ادارے میں مترجم کے فرائض انجام دینا ہے۔

ایک روز اس کا فون آیا: ''کیا خیال ہے آپ کی مسجد میں گونگے بہرے افراد کے ادارے سے منسلک دو طالبِ علم پیش کیے جائیں جو وہاں موجود نمازیوں کو خطاب کریں گے؟''

میں نے تعجب سے کہا: ''گونگے بولنے والوں کو خطاب کریں گے؟''

وہ بولا: ''بالکل! پھر ہم اتوار کو آئیں گے۔''

میں بے چینی سے اتوار کے دن کا منتظر رہا۔

اتوار کے دن میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اتنے میں ابو عبداللہ کی گاڑی دروازے کے سامنے رکی اور اس کے ساتھ دو آدمی گاڑی سے برآمد ہوئے۔

ایک تو ابوعبداللہ کے پہلو میں چل رہا تھا اوردوسرے کو وہ ہاتھ سے پکڑ کر لا رہا تھا۔ میں نے پہلا آدمی دیکھا۔ وہ گونگا بہرا تھا، یعنی سن اور بول نہیں سکتا تھا، البتہ اسے آنکھوں سے نظر آتا تھا جبکہ دوسرا گونگا بہرا ہونے کے ساتھ ساتھ نابینا بھی تھا۔ نہ وہ سنتا تھا نہ دیکھتا تھا اور نہ بول سکتا تھا۔ میں نے ابوعبداللہ سے ہاتھ ملایا۔ دائیں کھڑا احمد میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے بھی مصافحہ کیا۔ ابوعبداللہ نے نابینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''فائز سے بھی ہاتھ ملایئے۔'' میں نے کہا: ''السلام علیکم، فائز۔''

ابوعبداللہ نے ٹوکا: ''اس کا ہاتھ پکڑیے۔ وہ آپ کو سن نہیں سکتا اور نہ دیکھ رہا ہے۔''

میں نے اپنا ہاتھ فائز کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام کر ہلایا۔ ہم سب مسجد میں آگئے۔ نماز کے بعد ابوعبداللہ کرسی پر بیٹھ گیا، دائیں طرف احمد اور بائیں طرف فائز کو بٹھا لیا۔ لوگ حیرت سے تک رہے تھے۔ انھوں نے آج تک کسی گونگے کو لیکچر چیئر پر بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ ابوعبداللہ نے احمد کو اشارہ کیا۔ احمد کے ہاتھ حرکت میں آگئے۔ اس کی تقریر شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں کی سمجھ میں احمد کی کوئی بات نہیں آئی۔ میں نے ابوعبداللہ سے کہا کہ وہ ترجمہ کر کے بات سمجھائے۔ احمد کے اشارے یا تو کوئی گونگا سمجھ سکتا تھا یا وہ جس نے گونگے بہروں کی زبان سیکھ رکھی ہو۔ ابوعبداللہ مائیک پر آیا اور بولا: ''احمد آپ سے اپنی ہدایت کی کہانی کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں پیدائشی گونگا ہوں اور میں نے جدہ میں پرورش پائی۔ میرے گھر والے مجھے نظر انداز کرتے تھے۔ میں لوگوں کو مسجد جاتے دیکھتا تو سوچتا کہ یہ لوگ آخر مسجد کیوں جاتے ہیں۔ میں بارہا والد کو بھی دیکھتا کہ وہ جائے نماز بچھاتے اور رکوع و سجود کرتے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں اور یہ اٹھک بیٹھک کیسی ہے۔ میں گھر والوں سے کچھ پوچھتا تو وہ حقارت سے جواب نہ دیتے۔''

اتنا کہہ کر ابوعبداللہ نے احمد کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنی کہانی کا سلسلہ دوبارہ جوڑا اور ہاتھوں سے اشارے کرنے لگا۔ یکا یک اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا۔ ابوعبداللہ نے سر جھکا دیا۔ احمد رو پڑا اور زاروقطار رویا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیوں رور رہا ہے۔ بہرکیف اس نے اشاروں سے تقریر جاری رکھی، پھر توقف کیا تو ابوعبداللہ نے بتایا:

''احمد آپ سے بیان کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں تبدیلی کیسے آئی۔ راہ چلتے ایک اجنبی نے از راہِ شفقت اُسے اللہ کے بارے میں بتایا اور نماز سکھائی۔ جب اس نے پہلی بار نماز پڑھی تو اسے اللہ کے قرب کا احساس ہوا۔ اسے خیال گزرا کہ اللہ نے اسے جس آزمائش میں ڈالا ہے، اس کا بڑا اجر ہے۔ اس نے ایمان کی حلاوت کا مزہ چکھ لیا تھا۔''

اس کے بعد ابوعبداللہ نے احمد کی بقیہ کہانی سنائی۔ اکثر لوگ یہ باتیں نہایت دلچسپی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ لیکن میں مصروف تھا۔ میں کبھی احمد کو دیکھتا اور کبھی فائز پر نظر کرتا اور دل ہی دل میں کہتا: ''احمد دیکھ سکتا ہے اور اشاروں کی زبان جانتا ہے۔ ابوعبداللہ بھی اشاروں کے ذریعے سے اس کی باتیں سمجھ جاتا ہے۔ فائز کی باتیں وہ کیسے سمجھے گا جو نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے اور نہ بات کرتا ہے۔''

احمد کی تقریر اختتام کو پہنچی اور وہ آنسو پونچھتا ہوا اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ اب ابوعبداللہ فائز کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے دل میں کہا: ''ہاہ! یہ کیا کرے گا؟''

ابوعبداللہ نے انگلیوں سے فائز کے گھٹنے پر آہستگی سے ضرب لگائی۔ فائز تیر کی طرح اُٹھا اور نہایت اثر انگیز تقریر کی۔ لیکن کیسے؟ بول کر؟ نہیں، وہ تو گونگا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ یا پھر اشاروں کے ساتھ؟ نہیں، وہ تو نابینا تھا، اشاروں کی زبان نہیں سیکھ سکا۔ اس نے چھو کر تقریر کی۔ جی ہاں چُھو کر! ابوعبداللہ نے اپنا ہاتھ فائز کے آگے رکھا اور فائز

مخصوص جگہوں کو چھو کر بتاتا۔ مترجم اس کی بات سمجھ کر حاضرین سے بیان کرتا۔ اتنی دیر فائز ساکن کھڑا رہتا۔ مترجم کی بات ختم ہوتی تو وہ فائز کے گھٹنے پر ضرب لگاتا اور فائز دوبارہ ہاتھ پھیلاتا، مترجم اپنا ہاتھ اس کے آگے کرتا اور فائز اسے چھو کر اپنا مدعا بیان کرتا۔ لوگ کبھی حیرت سے فائز کو دیکھتے اور کبھی مترجم کو تکتے۔ فائز لوگوں کو توبہ کا درس دے رہا تھا۔ وہ کبھی کانوں کو ہاتھ لگاتا، کبھی زبان پکڑتا اور کبھی ہاتھ آنکھوں پر رکھتا۔ ہم اس کی کوئی بات نہ سمجھ پاتے یہاں تک کہ ابوعبداللہ ترجمہ کر کے بتاتا۔ فائز لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ آنکھیں اور کان حرام سے بچا کر رکھیں۔ میں لوگوں کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ بعض ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' کہہ رہے تھے۔ کچھ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ زیادہ تر افراد توجہ اور شوق سے دیکھ اور سن رہے تھے۔ چند ایک رو رہے تھے۔ رہ گیا میں۔ میں ذرا پیچھے کو ہٹ گیا اور فائز کی صلاحیتوں اور لوگوں کی صلاحیتوں، ان کی خدمتِ دین اور اس کی خدمتِ دین کا موازنہ کرنے لگا۔ جو فکر اس گونگے بہرے اور نابینا شخص کو تھی دوسرے لوگوں کے سینوں میں شاید اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔

محدود صلاحیتوں کا ایک آدمی خدمتِ دین کی تڑپ میں گھل رہا تھا۔ وہ اس احساس تلے دبا جا رہا تھا کہ وہ اسلام کا سپاہی ہے اور ہر گناہ گار و کوتاہ عمل کا ذمہ دار ہے۔

وہ سرشاری سے ہاتھوں کو حرکت دیتا، گویا کہہ رہا ہو:

''اے نماز کے تارک، آخر کب تک؟''

''اے حرام پر نگاہ رکھنے والے، کہاں تک؟''

''اے فواحش کے مرتکب!''

''اے حرام کھانے والے!''

''اے شرک کرنے والے!''

”آخر کب تک یہ سلسلہ چلے گا؟“

اتنا کافی نہیں کہ اعدائے اِسلام اس دین سے برسرِ پیکار ہیں جو تم نے بھی اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے؟

لوگ واقعتاً فائز سے بہت متاثر ہوئے۔ میں نے انھیں دیکھا نہیں لیکن تسبیح پڑھنے اور رونے کی آوازیں متواتر آرہی تھیں۔ فائز نے تقریر ختم کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ اسے ملنے اور سلام کرنے اردگرد جمع ہو گئے۔ ابوعبداللہ نے اس کا ایک ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی لوگوں کو سلام کہہ رہا تھا۔ وہ سب کو سلام کہہ رہا تھا۔ سب لوگ اس کے نزدیک برابر تھے۔ آقا و غلام، امیر و مامور، محتاج و غنی اور عام و خاص، وہ سبھی کو سلام کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا کاش بعض مفاد پرست لوگ بھی تمھارے جیسے ہوتے فائز!

ابوعبداللہ فائز کو لیے مسجد سے باہر آ گیا۔ اُن دونوں کا رُخ گاڑی کی طرف تھا۔ میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ دونوں خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے سے ہنسی کر رہے تھے۔

آہ! دنیا کس قدر حقیر ہے!

کتنے لوگ ہیں جن کے ہاتھ پاؤں، آنکھیں کان اور زبان سلامت ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو افسردگی اور غم واندوہ سے چھٹکارا دلانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ لوگ آخر اپنی زندگی میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے؟ اپنی صلاحیتوں سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟ حالات کے مطابق زندگی گزارنا کیوں نہیں سیکھتے؟

زندگی کا یہ پہلو کتنا حسین وجمیل ہے کہ اللہ اپنے بندے کو آزمائش میں ڈالے، پھر بندہ اپنے دل کی طرف دیکھے تو اسے صابر و شاکر اور راضی برضا پائے۔

دن پر دن گزرتے رہے لیکن فائز کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی۔

فائز نابینا اور گونگا بہرا ہونے کے باوجود زندگی میں کامیاب ہوسکتا ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرسکتا ہے تو اس شخص کو کیا پرابلم ہے جسے اللہ نے بولتی زبان، دیکھتی آنکھ اور سنتے کان عطا کیے ہیں؟!

حقیقت

لِسَانُ الْفَتیٰ نِصْفٌ وَّ نِصْفٌ فُؤَادُهٗ
فَلَمْ یَبْقَ إِلَّا صُورَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ

''آدمی کی زبان اس کا نصف اور دوسرا نصف دل ہے۔ اس کے بعد صرف خون اور گوشت پوست کی ایک صورت ہی باقی رہتی ہے۔''

1 جامع الترمذي، حديث: 2407، ومسند أحمد: 96/3.

اپنی زبان قابو میں رکھیے

بعض اوقات آدمی پروا کیے بغیر اللہ کی ناراضی کی بات کہہ دیتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ قیامت تک کے لیے اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بے سوچے سمجھے بات منہ سے نکالنے کی ممانعت کی ہے۔ زبان کی مہار کھلی چھوڑ دینا ہمیشہ ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ کسی شاعر نے زبان کی حفاظت کے متعلق کیا خوب صورت بات کہی ہے:

اِحْفَظْ لِسَانَكَ أَيُّهَا الْإِنْسَانُ
لَا يَلْدَغَنَّكَ إِنَّهُ ثُعْبَانُ

''اے انسان! اپنی زبان کی حفاظت اور نگرانی کر یہ تجھے ڈس نہ لے، یہ اژدہا ہے۔''

كَمْ فِي الْمَقَابِرِ مِنْ قَتِيلِ لِسَانِهِ
كَانَتْ تَهَابُ لِقَائَهُ الشُّجْعَانُ

''زُبان کے کتنے مقتول قبروں میں پڑے ہیں جن کا سامنا کرنے سے بڑے بڑے بہادر ڈرتے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ نے غصے کی حالت میں خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ غصے کے عالم میں انسان ایسی بات کہہ جاتا ہے جو اسے ہلاکت اور بربادی کے

راستے پر ڈال دیتی ہے۔

مجھے یاد ہے میں کچھ عرصہ پہلے صلح کرانے کے لیے دو خاندانوں کے بیچ پڑا تھا۔ اُن کا مسئلہ یہ تھا کہ ایک ساٹھ سال کی عمر سے متجاوز اچھا خاصا عقل مند آدمی اپنے چند دوستوں کے ہمراہ شکار پر نکلا۔ سب دوستوں کی عمریں تقریباً ایک جیسی تھیں۔ مل کر بیٹھے تو بچپن کی یادوں کا ذکر چھڑا۔ باتوں باتوں میں وہ اس بات پر بحث کرنے لگے کہ گاؤں میں کس کے آباء واجداد کی کتنی اراضی ہے۔ دو دوست ایک زمین کے متعلق الجھ پڑے۔ ایک کا کہنا تھا کہ وہ زمین اس کے آباء واجداد کی ہے۔ دوسرے کا دعویٰ تھا کہ اس اراضی کے مالک اس کے آباء واجداد ہیں۔ بات بڑھی تو زمین کے مالک نے طیش میں آ کر اپنے دوست سے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر تم میری زمین کے قریب نظر آئے تو میں اسے تمھارے سر میں دھنسا دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے شکار کی بندوق اٹھائی، اس کا رخ اپنے دوست کی طرف کیا اور اس کے سر کے ایک ڈیڑھ میٹر اوپر رکھ کر لبلبی دبا دی۔ قریب تھا کہ دونوں دوست گتھم گتھا ہو جاتے لیکن دیگر ساتھیوں نے مداخلت کر کے اُن کا غصہ ٹھنڈا کیا، پھر وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ وہ آدمی جس کے سر کے اوپر گولی چلائی گئی تھی، اس رات شدتِ غضب سے سو نہ سکا۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس نے طے کیا کہ وہ اپنا سینہ ضرور ٹھنڈا کرے گا۔ اس نے اپنی کلاشنکوف اٹھائی اور اپنے دوست کو جو اَب اس کا دشمن تھا، تلاش کرنے لگا۔ وہ اسے گرلز اسکول کے قریب گاڑی میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اسکول کی استانیوں کو گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر چھوڑنے والی گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ گاڑی اسکول کے دروازے پر کھڑی کر کے وہ دروازے کی اندرونی جانب بیٹھا استانیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی کے ساتھ اس جیسی کئی دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں جو طالبات کے لیے مخصوص تھیں۔

وہ آدمی دور ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر کمزور تھی۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے ڈرائیور کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ یکے بعد دیگرے تین گولیاں ڈرائیور کے سر میں دھنس گئیں اور وہ موقع پر جاں بحق ہو گیا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ چیخ پکار بلند ہوئی۔ پولیس نے آ کر علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ قاتل اطمینان سے پولیس اسٹیشن گیا اور اعتراف کیا کہ اس نے فلاں شخص کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا سینہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اب چاہے قتل کیا جائے، جلایا جائے یا قید میں رکھا جائے اسے کوئی پروا نہیں۔ پولیس نے اسے عارضی طور پر جیل میں بند کر دیا۔ ایک پولیس افسر نے جائے وقوعہ کا معاینہ کیا۔ مقتول کا شناختی کارڈ دیکھا تو انکشاف ہوا کہ قاتل جس شخص کو قتل کرنا چاہتا تھا، اس کی جگہ غلطی سے وہ کسی اور کو قتل کر بیٹھا ہے۔ افسر جلدی سے تھانے واپس آیا۔ قاتل جس آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ افسر نے اسے جیل کی سلاخوں کے سامنے کھڑا کیا اور قاتل سے کہا: ''اے فلاں! تمھارا دعویٰ ہے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے؟ جبکہ گولی کسی اور کو لگی ہے۔''

اس پر قاتل بے چارے نے زوردار چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ کئی دن بے ہوش رہا۔ افاقے کے بعد اسے جیل بھیجا گیا اور شرعی جج نے اسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا۔

خلیفۂ اوّل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سچ کہا تھا:

''زبان سے بڑھ کر طویل قید کی محتاج کوئی شے نہیں۔''

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا:

''تعجب ہے، بعض لوگ حرام کھانے سے پرہیز کر سکتے ہیں، زنا سے بھی بچ سکتے ہیں، چوری بھی نہیں کرتے لیکن اپنی زبان قابو میں نہیں رکھ سکتے اور اُس کے ذریعے سے لوگوں کی عزتیں تار

تار کرتے ہیں۔"

تجزیہ

"جانور کی زبان لمبی ہوتی ہے لیکن وہ بولتا نہیں۔ انسان کی زبان چھوٹی ہوتی ہے اور وہ خاموش نہیں ہوتا۔"

نصیحت کرنے کا درست طریقہ

بہت سے لوگ صرف اس لیے نصیحت قبول نہیں کرتے کہ نصیحت کرنے والا صحیح انداز اختیار نہیں کرتا۔ مربیِ حکیم محمد ﷺ نصیحت کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرتے تھے کہ لوگ اسے قبول کیے بنا نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک روز آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز کے بعد کا ذکر سکھانا چاہا تو معاذ کے پاس آئے اور فرمایا:

''معاذ! واللہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم ہر نماز کے بعد یہ کہا کرو:

«اللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ»

''اے اللہ! اپنے ذکر و شکر اور حسنِ عبادت پر میری مدد فرما۔''[1]

اب بتائیے رسول اللہ ﷺ کی بات کے پہلے حصے ''واللہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں'' کا دوسرے حصے ''تم ہر نماز کے بعد یہ کہا کرو'' سے کیا تعلق ہے؟ یہ بات گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے۔ ''واللہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں'' سچے جذبات پر مبنی تمہید ہے جو قبولِ نصیحت کے لیے قائم کی گئی ہے۔ یہ الفاظ سن کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو خوشی ہوئی تو آپ نے نصیحت کے الفاظ کہہ دیے۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لیا، پھر اس کے اوپر بایاں ہاتھ رکھا اور فرمایا:

''یا عبداللہ! جب تم تشہد کے لیے بیٹھا کرو تو یہ کہا کرو:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ»

یہ الفاظ اور رسول اللہ ﷺ کا مشفقانہ طریقِ تعلیم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذہن کی تختیوں پر نقش ہو گیا۔ کئی سال بعد جبکہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے تھے، عبداللہ نے فخر سے یہ بات لوگوں کو بتائی:

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد کی دعا سکھائی جبکہ میری ہتھیلی آپ کی ہتھیلیوں کے درمیان تھی۔''[2]

عمر رضی اللہ عنہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حجر اسود کے قریب پہنچے تو وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ خوب دھکم پیل ہوئی۔ عمر رضی اللہ عنہ مضبوط اور قوی الجثہ آدمی تھے۔ وہ ہجوم میں گھس گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو تمہید کے طور پر کہا:

''عمر! آپ بلاشبہ مضبوط آدمی ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ اس تعریف پر یقیناً خوش ہوئے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

''حجرِ اسود کے پاس دھکم پیل نہ کیا کیجیے۔''[3]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک تہجد کی نماز کے متعلق نصیحت کرنا چاہی تو فرمایا:

''عبداللہ اچھا آدمی ہے۔ کاش! وہ قیام اللیل کیا کرتا۔''[4]

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''عبداللہ! فلاں کی طرح نہ ہونا۔ وہ رات کو نماز (تہجد) پڑھا کرتا تھا، پھر اس نے رات کی نماز ترک کر دی۔''[5]

نبوت کے ابتدائی دور میں لوگ دینِ اسلام قبول کرنے کے متعلق تردد کا شکار تھے۔ کوئی ساتھ ملتا تھا اور کوئی نہیں ملتا تھا۔ مدینہ میں ایک سوید بن صامت نامی آدمی تھا جو دانش ور اور شاعر تھا۔ قوم کے اشراف میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ قدیم دانش وروں کا کلام اسے یاد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لقمان حکیم سے روایت کردہ تمام اقوال اسے ازبر تھے۔

اس کے لیے لوگوں کی پسندیدگی کا عالم یہ تھا کہ وہ شجاعت، شاعری، شرف اور حسب و نسب کے افتخار کے باعث اسے ''کامل'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

ایک روز سوید بن صامت حج یا عمرہ کرنے مکہ آیا۔ لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ ٹولیوں کی شکل میں اس کی زیارت کرنے نکلے۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ بھی آئے۔ اسے اللہ کی طرف بلایا۔ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ توحید و رسالت کے بارے میں بتایا کہ میں نبی ہوں۔ مجھ پر قرآن کی وحی کی جاتی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

سوید نے کہا: ''غالبًا آپ کے پاس جو کلام ہے وہ اسی کلام جیسا ہے جو میرے پاس ہے؟''

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

''آپ کے پاس کیا ہے؟''

سوید بولا: ''میرے پاس لقمان کی حکمت ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے نرمی سے کہا:

''وہ مجھے سنائیے۔''

سوید نے لقمان حکیم کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ رسول اللہ ﷺ نہایت اطمینان سے سنتے رہے۔ سوید کی بات اختتام کو پہنچی تو رسول اللہ ﷺ گویا ہوئے:

''یہ کلام واقعی بہت عمدہ ہے۔''

"لیکن جو کلام میرے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے۔ وہ ہدایت اور نور ہے۔"[1]

یہ کہہ کر آپ نے قرآن کی تلاوت کی۔ سوید خاموشی سے سنتا رہا۔ تلاوت ختم ہوئی۔ سوید خاصا متاثر ہوا۔ اس نے کہا:

"یہ باتیں واقعتاً لاجواب ہیں۔"

اس کے بعد سوید بن صامت مدینہ لوٹ گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اوس و خزرج کی لڑائی ہوئی۔ سوید بن صامت کو جس کا تعلق اوس سے تھا، خزرج کے لوگوں نے قتل کر دیا۔ یہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سوید مسلمان ہو گیا تھا کہ نہیں، البتہ اس کی قوم کے چند افراد کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

اس واقعے کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعوت کے سلسلے میں نہایت نرم رویہ اختیار کیا اور سختی نہیں برتی۔

اختصار

"تعریف کریں تو کھل کر کریں۔ تنقید کرتے وقت میانہ روی اختیار کریں۔"

[1] سنن أبي داود، حديث: 1522، والمستدرك للحاكم: 273/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 6265. [3] مسند أحمد: 28/1. [4] صحيح البخاري، حديث: 3739، وصحيح مسلم، حديث: 2479. [5] صحيح البخاري، حديث: 1152، وصحيح مسلم، حديث: 1159. [6] البداية والنهاية: 145/3.

جذباتی سرمایہ

اپنی شخصیت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں تشکیل پانے والے تصورات ہم خود بناتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی پہلی اور سرسری ملاقات میں آپ سے سپاٹ یا بے تاثر چہرے کے ساتھ ملتا ہے تو آپ کے حافظے میں اس کی سپاٹ شکل محفوظ ہو جائے گی۔ اب آپ جیسے ہی اس کا نام (اگر آپ جانتے ہیں) سنیں گے یا اس کی تصویر دیکھیں گے یا اس سے ملاقات کریں گے تو وہی پہلی ملاقات والا سپاٹ چہرہ آپ کے ذہن کی تختی پر ابھر آئے گا۔

اسی طرح جو شخص مسکراتے ہوئے کشادہ چہرے سے آپ کو ملے گا اس کی وہی مسکراتی اور روشن صورت آپ کے ذہن میں بیٹھے گی۔ یہ اُن لوگوں کی بات ہے جن سے آپ کے دائمی تعلقات نہیں ہوتے اور سرراہ ملاقات ہوتی ہے، البتہ وہ اشخاص جن سے ہم ہمیشہ ملتے ہیں جیسے بیوی، بچے، دوست احباب، محلے دار اور رشتے دار تو ان سے ہمارا طرزِ عمل ایک ڈھنگ کا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں ہنستے، روتے، غصے کے عالم میں، لڑتے جھگڑتے ہر حالت میں دیکھتے ہیں۔ ہمارے لیے اِن افراد کی محبت جذباتی سرمائے کی مقدار کے برابر ہوتی ہے جو اُن کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہوتا ہے۔

جب آپ کسی انسان سے اچھا سلوک کرتے ہیں تو وہ اپنی یادداشت کی ڈائری میں آپ کے حوالے سے ایک خوب صورت یاد کا اضافہ کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ

اپنے دل میں ایک اکاؤنٹ کھولتا ہے جس میں آپ کے لیے محبت واحترام کے جذبات جمع کر لیتا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے لیے اس اکاؤنٹ میں جذباتی سرمائے کا اضافہ کراتے ہیں یا کمی۔ آپ جب بھی اسے مسکرا کر ملیں گے یا تحفہ دیں گے، اس کے اکاؤنٹ میں موجود جذباتی سرمائے میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کے برعکس آپ اس سے توہین آمیز سلوک کریں گے تو وہ اپنے اکاؤنٹ میں آپ کے حوالے سے محفوظ جذباتی سرمائے کا کچھ حصہ نکال لے گا۔

ہاں! آپ کا جذباتی سرمایہ اس کے اکاؤنٹ میں کثیر مقدار میں ہوگا تو کبھی کبھار کی تلخی یا ناراضی سے اس میں غیر معمولی کمی نہیں آئے گی۔ شاعر نے کہا ہے:

وَإِذَا الْحَبِيبُ أَتَى بِذَنْبٍ وَاحِدٍ
جَائَتْ مَحَاسِنُهُ بِأَلْفِ شَفِيعِ

''محبوب ایک غلطی کرتا ہے اور اس کی خوبیاں ہزار سفارشی لیے چلی آتی ہیں۔''

اور اگر آپ کے لیے اس کے اکاؤنٹ میں سرے سے جذباتی سرمایہ موجود ہی نہیں اور آپ اپنا سرمایہ نکالنے پر تلے ہوئے ہیں تو آپ کے ذمے قرض بڑھتا رہے گا۔ یوں اس کے دل میں آپ کے لیے ناپسندیدگی آجائے گی کیونکہ آپ اکاؤنٹ سے سرمایہ نکال تو رہے ہیں لیکن اس میں کچھ نہ کچھ ڈال نہیں رہے!!

اس لیے آپ نے جس شخص کے دل میں اپنی محبت کا اکاؤنٹ کھلوالیا ہے، اس اکاؤنٹ میں موجود جذباتی سرمائے میں اضافہ کرتے رہیے۔

حقیقت

''دوسروں سے اچھائی اپنی ہی محبت میں اضافے کا باعث ہے۔''

الفاظ کی جادوگری

ایک دن عرب کے تین بڑے سردار قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر اور عمرو بن اہتم رسول اللہ ﷺ کے مہمان بنے۔ ان تینوں کا تعلق قبیلۂ بنو تمیم سے تھا۔ وہ آپ کی مجلس میں بیٹھے عربوں کے روایتی تفاخر پر اتر آئے۔

زبرقان بولا: ''اے اللہ کے رسول! میں تمیم کا سردار ہوں۔ میری بات مانی جاتی ہے۔ میں اُن پر ظلم و ستم نہیں ہونے دیتا۔ اُن کے حقوق اُنھیں دلاتا ہوں۔''

اس نے عمرو بن اہتم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔''

عمرو نے بھی زبرقان کی تعریف کی اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ واقعی بہت ذہین و فطین اور حاضر جواب ہیں۔ بارعب ہیں اور قوم ان کی بات مانتی ہے۔''

یہ کہہ کر عمرو خاموش ہو گیا اور مبالغہ آرائی نہیں کی۔ زبرقان لمبے چوڑے تعریفی جملوں کا منتظر تھا لیکن عمرو نے اختصار سے کام لیا۔ اس پر زبرقان کو غصہ آ گیا۔ اس نے سمجھا کہ عمرو کو اس کی سرداری سے حسد ہے۔ وہ بولا:

''واللہ! اے اللہ کے رسول! یہ اور بھی بہت کچھ کہتے لیکن انھیں حسد نے روک لیا ہے۔''

عمرو نے یہ بات سنی تو طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا:

''میں آپ سے حسد کروں گا؟ آپ کم ظرف اور نو دولتیے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کی اولاد بے وقوفوں کا ٹولہ ہے۔ قبیلے میں آپ کی کوئی عزت نہیں۔ واللہ! اے اللہ کے رسول! جو میں نے پہلے کہا تھا وہ بھی سچ تھا۔ اور اب جو کہا ہے وہ بھی جھوٹ نہیں۔ ہاں! جب میں راضی تھا تو ان کی اچھائیاں جو میرے علم میں تھی، بیان کیں اور جب طیش میں آیا تو ان کی برائیاں جو پہلے چھپا لی تھیں، بتا دیں۔ واللہ! میں نے دونوں بار سچ ہی کہا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کو عمرو بن اہتم کی حاضر جوابی، قوتِ بیان اور مہارتِ لسانی اچھی لگی۔ آپ نے فرمایا:

''ہاں واقعی الفاظ میں جادو ہوتا ہے۔ ہاں واقعی الفاظ میں جادو ہوتا ہے۔''[1]

الفاظ ہی کی جادوگری کا ایک اور واقعہ سماعت فرمایئے۔

معرکۂ حنین کے آغاز میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ لوگ منتشر ہو گئے اور اسلامی لشکر رسول اللہ ﷺ کو میدان میں چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا۔ طائف کا لشکر بڑی مضبوط پوزیشن میں تھا۔ مسلمانوں کی ہزیمت صاف نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا جو میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ آپ نے انصار کو آواز دی:

''اے انصار کے لوگو۔''

انصار نے جواب میں لبیک کہا اور لوٹ آئے۔ انھوں نے آپ کے سامنے صف بنا لی اور آپ کا دفاع کرنے لگے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھنے والے تیر اور نیزے اپنے سینوں پر روکے۔ مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ غنیمت کا مال رسول اللہ ﷺ کے روبرو جمع کیا گیا۔ صحابۂ کرام آپ کی طرف دیکھنے لگے۔ ہر ایک کو اپنی بھوکی اولاد اور نادار گھر والوں کا خیال تھا۔ ہر کسی کو امید تھی کہ

اسے غنیمت سے وافر حصہ ملے گا جس سے وہ اپنے گھر اور گھر والوں کی حالت سنوارے گا۔ اسی اثنا میں رسول اللہ ﷺ نے اقرع بن حابس کو بلایا۔ وہ چند دن قبل فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ آپ نے انھیں سو اونٹ عطا کیے۔ ابوسفیان کو آواز دی اور انھیں بھی سو اونٹ عنایت کیے۔ اسی طرح آپ اہلِ مکہ میں اونٹ تقسیم کرتے رہے جنھوں نے انصار کی سی بے جگری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، نہ ان کی مانند قربانیاں دی تھیں۔ انصار نے یہ منظر دیکھا تو چند افراد کے منہ سے نکل گیا: ''اللہ تعالیٰ رسول اللہ (ﷺ) کو معاف کرے، قریش کو مال دے رہے ہیں اور ہمیں محروم رکھا ہے جبکہ ہماری تلواریں مشرکین کے خون سے رنگین ہیں۔'' یہ بات سید الانصار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے کانوں میں پڑی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے خیمے میں گئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کے انصاری صحابہ دل میں آپ سے ناراض ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کو تعجب ہوا۔ آپ نے دریافت کیا: ''کیوں؟''

سعد بن عبادہ بولے: ''اس لیے کہ غنیمت کا مال آپ نے اپنی قوم کو دیا، عرب کے دیگر قبائل کو بھی بڑے بڑے عطیے دیے اور انصار کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے سعد بن عبادہ کے دل کی حالت جاننا چاہی۔ آپ نے پوچھا: سعد! ''آپ بھی یہی سوچ رہے ہیں؟''

انھوں نے اقرار کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں بھی اپنی قوم ہی کا ایک فرد ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ کو ادراک ہو گیا کہ اس مسئلے میں ایسے علاج کی ضرورت ہے جو جیبوں کے بجائے دلوں میں پہنچے۔ آپ نے فرمایا:

''قوم کے لوگوں کو اکٹھا کیجیے۔''

لوگ جمع ہوئے تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا:

”اے انصار کے لوگو! یہ کیا بات ہے جو مجھے آپ کے متعلق معلوم ہوئی ہے؟“

انصار نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! سمجھدار افراد نے کوئی بات نہیں کی۔ چند نوعمر جوانوں نے کہہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ (ﷺ) کو معاف کرے، قریش کو دیتے ہیں اور ہمیں محروم رکھتے ہیں جبکہ ہماری تلواریں اُن کے خون سے رنگین ہیں۔“

اس پر آپ نے فرمایا:

”انصار کے لوگو! کیا آپ گمراہ نہیں تھے؟ پھر اللہ نے میرے ذریعے آپ کو ہدایت دی۔“

انصار بولے: ”جی ہاں، بالکل، اللہ اور اس کے رسول کا فضل اور احسان ہے۔“

آپ نے فرمایا:

”کیا آپ نادار نہیں تھے؟ اللہ نے آپ کو غنی کر دیا۔ کیا آپ آپس میں دشمن نہیں تھے؟ اللہ نے آپ کے دلوں میں الفت ڈال دی۔“

انھوں نے جواب دیا: ”کیوں نہیں، اللہ اور اس کے رسول کا فضل و احسان ہے۔“

آپ نے فرمایا:

”واللہ! آپ کہہ سکتے ہیں اور سچ ہی کہیں گے اور آپ کی بات سچ مانی جائے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم ہمارے پاس آئے، تمھیں جھٹلایا گیا تھا لیکن ہم نے تمھاری تصدیق کی۔ تمھیں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے تمھاری مدد کی۔ تمھیں نکال دیا گیا تھا لیکن ہم نے تمھیں پناہ دی۔ تم ضرورت مند تھے، ہم نے تمھاری غم خواری کی۔“[2]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جذبات کو جھنجوڑنا شروع کیا۔ آپ نے اُن کے دلوں کے تار چھیڑتے ہوئے فرمایا:

''اے معشرِ انصار! کیا آپ اپنی خاطر اللہ کے رسول سے ناراض ہیں؟ دنیا کے حقیر مال ومتاع کی خاطر؟ میں نے تو اس مال سے چند لوگوں کی تالیفِ قلب کی ہے کہ وہ اسلام لے آئیں۔ میں نے آپ کو آپ کے اسلام کے سپرد کر دیا تھا۔''

''اے معشرِ انصار! کیا آپ اس بات پر راضی نہیں کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور آپ اللہ کے رسول کو لے کر گھروں کو لوٹیں؟

لوگ ایک راستے پر جائیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں بلاشبہ انصار کا راستہ اپناؤں گا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما۔ انصار کے بچوں پر اور ان کے بچوں پر رحم فرما۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کی باتیں سن کر سب لوگ زار و قطار رونے لگے۔ داڑھیاں آنسوؤں سے تربہ تر ہو گئیں۔ انھوں نے کہا:

''ہمارے حصے میں رسول اللہ آئے، ہم راضی ہیں۔''

بلاشبہ نیک نیتی سے کہے گئے چند میٹھے بول انسان کی زندگی بدل سکتے اور اس کا دل پھیر سکتے ہیں۔

طے شدہ

''جیسے آپ میٹھا پھل خریدتے ہیں اسی طرح میٹھے بول اپنائیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 5146، وصحيح مسلم، حديث: 869. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 4/141-143. [3] مجمع الزوائد: 10/29، ومسند أحمد: 3/76,77، ودلائل النبوة للبيهقي: 5/177.

حالات اچھے نہیں، نہ سہی!! طرزِ کلام تو اچھا ہو

زندگی کی وہ گھڑی بڑی بے رحم ہوتی ہے جب کوئی ضرورت مند آپ کے دروازے پر آئے اور بے مراد لوٹ جائے۔ لوگوں کی جائز ضروریات پوری کرنا بڑی عبادت ہے۔ اس کی فضیلت معلوم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے:

"اگر میں اپنے بھائی کی کسی ضرورت کے لیے اس کے ساتھ چلوں اور اس کی ضرورت پوری کر دوں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ اپنی اس مسجد میں ایک ماہ اعتکاف کروں۔"[1]

زندگی میں کبھی آپ پر یہ مشکل گھڑی آئے کہ آپ اپنے بھائی کی مدد نہ کر سکتے ہوں، اس کی حاجت براری نہ کر سکتے ہوں تو معذرت کرتے ہوئے نہایت نرم اور میٹھا لہجہ اختیار کیجیے۔ کیونکہ حالات اچھے نہیں، نہ سہی!! اندازِ گفتگو تو اچھا ہو۔

رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ اللہ کے محترم و مکرم گھر کعبہ کا ذکر چل نکلا۔ عمرہ و احرام کی فضیلت زیرِ بحث آئی۔ حرم شریف کی زیارت کے لیے اُن کے دل بے چین ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے سفرِ مکہ کے لیے تیاری کا حکم دیا۔ شوق کو مہمیز ملی۔ آناً فاناً تیاریاں کی گئیں۔ آپ چودہ سو صحابۂ کرام کے جلو میں عمرے کا تلبیہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ مکہ کی پہاڑیاں دکھائی دیں تو رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی قصوا اچانک

بیٹھ گئی۔ آپ نے اسے اُٹھا کر چلانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

لوگ کہنے لگے: ''قصوا اُڑ بیٹھی۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قصوا اَڑی نہیں، نہ اس کی یہ عادت ہے، البتہ اسے ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک لیا ہے۔'' (ابرہہ کے ہاتھی مراد ہیں جنھیں اللہ نے کعبہ کی طرف آنے سے روک دیا تھا۔) پھر فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ میرے سامنے کوئی ایسا لائحۂ عمل رکھیں گے جس سے ان کا مقصود اللہ کی محرمات (محترم قرار دی ہوئی اشیاء) کی تعظیم ہو تو میں ان سے ضرور اتفاق کروں گا۔''[1]

یہ کہہ کر آپ نے ناقہ کو ڈانٹا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور ایک قریبی جگہ حدیبیہ میں پڑاؤ ڈالا۔ قریش کو آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس کے سرکردہ افراد آپ کی طرف آئے تاکہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے باز رکھیں۔ آپ نے عمرہ کیے بغیر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ قریش کے سفیر مذاکرات کی غرض سے آتے رہے اور ناکام لوٹتے رہے۔ آخر قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا۔ اس نے نبی ﷺ سے ان شرائط پر صلح کا معاہدہ کر لیا کہ مسلمان مدینہ لوٹ جائیں اور آیندہ سال عمرے کے لیے آئیں۔ اس کام کے انجام پانے کے بعد مسلمانوں اور قریش کے درمیان عام مصالحت کا وثیقہ لکھا گیا۔ سہیل بن عمرو نے یہ شرط پیش کی کہ مکہ سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آئے، واپس کر دیا جائے لیکن مدینے کے مسلمانوں میں سے جو مرتد ہو کر مکہ آجائے وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

مسلمانوں نے کہا: ''سبحان اللہ! جو شخص مسلمان ہو کر ہمارے پاس آجائے ہم اسے کافروں کو واپس کر دیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

ابھی اس شرط پر ردو قدح ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان ننگے پاؤں بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے آیا اور آتے ہی پکارا: "اے اللہ کے رسول!"

سب نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ سہیل بن عمرو کا لڑکا ابو جندل تھا جو مسلمان ہو چکا تھا۔ اسے اس کے باپ نے قید میں ڈال رکھا تھا۔ اسلام لانے کی پاداش میں اس پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ مسلمان حدیبیہ میں فروکش ہیں تو وہ کسی طرح جیل توڑ کر بھاگ نکلا اور بیڑیاں گھسیٹتا ہوا مسلمانوں کے پاس آ گیا۔ اس کے زخموں سے خون رِس رہا تھا، آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ آیا اور نبی ﷺ کے قدموں میں ڈھے گیا۔ مسلمان دیکھتے رہ گئے۔ سہیل بن عمرو نے اسے دیکھا تو طیش میں آ گیا کہ یہ قید سے کیونکر نکل بھاگا۔ اس نے چیخ کر کہا: "اے محمد! یہ رہا وہ پہلا شخص جس کے متعلق میں آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اسے میرے حوالے کر دیا جائے۔"

رسول اللہ ﷺ نے انکار کرتے ہوئے کہا:

"معاہدے کی تحریر ابھی فیصلہ کُن مرحلے میں داخل نہیں ہوئی۔"

سہیل بن عمرو نے ڈھٹائی سے کہا: "ٹھیک ہے میں آپ سے مصالحت ہی نہیں کرتا۔"

رسول اللہ ﷺ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا:

"اسے میری خاطر چھوڑ دیجیے۔"

سہیل بن عمرو کا جواب نفی میں تھا: "نہیں، میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ کہا:

"کیوں نہیں؟ آپ اسے چھوڑ دیجیے۔"[3]

سہیل بن عمرو ٹس سے مس نہ ہوا: "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس پر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ سہیل بن عمرو بجلی کی طرح ابو جندل کی طرف بڑھا

اور اسے زنجیروں سے پکڑ کر باہر کو گھسیٹنے لگا۔ ابو جندل چیختا رہا، مسلمانوں کو پکارتا رہا:
''مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں لیکن مشرکین کو لوٹایا جاتا ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ مجھ پر کس قدر ظلم ڈھائے گئے؟''

وہ مدد کے لیے پکارتا رہا اور اسی حالت میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مارے غم کے مسلمانوں کے کلیجے پگھلنے لگے۔ وہ ابو جندل کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ ابو جندل ربّ العالمین سے ایمان و یقین کی بڑھوتی اور دین پر ثابت قدمی کی دعا کرتا ہوا مکہ چلا گیا۔ مسلمان شدید غم و غصے کی حالت میں مدینہ لوٹ آئے۔

اب مکہ میں محبوس کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم میں شدت آ گئی۔ قید خانوں میں دی جانی والی اذیتیں برداشت سے باہر ہو گئیں تو ابو جندل رضی اللہ عنہ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور دیگر محبوس مسلمانوں سے مل کر قید سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ ابو بصیر فرار کی کوشش میں کامیاب رہے۔ وہ سیدھے مدینہ روانہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا شوق انھیں اڑائے لیے جاتا تھا۔ مسلمانوں کی رفاقت کی امید اُن کے ہمراہ تھی۔ وہ صحرائے عرب کی وسعتیں طے کرتے مدینہ پہنچے اور مسجد نبوی میں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ہمراہ مسجد ہی میں تشریف فرما تھے۔ ابو بصیر کے جسم پر اذیتوں کے واضح نشان تھے۔ سفر کی پراگندہ حالت میں وہ مسجد میں کھڑے تھے۔ ابھی انھوں نے دَم نہیں لیا تھا کہ قریشِ مکہ کے دو آدمی مسجد میں داخل ہوئے اور پکار کر کہا: ''اے محمد! ابو بصیر ہمیں واپس کر دیجیے۔ اُسی عہد کے مطابق جو آپ نے ہم سے باندھا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر سے کہہ دیا کہ وہ مدینے سے نکل جائیں۔ وہ دونوں آدمی ابو بصیر کو لے کر چلتے بنے۔ مدینے سے ذرا دور اُن دونوں نے کھانا کھانے کے لیے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ایک ابو بصیر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا قضائے حاجت کے لیے چلا گیا۔

ابوبصیر کے پاس بیٹھے آدمی نے تلوار نکالی اور اسے لہراتے ہوئے کہا: ''میں اپنی اس تلوار سے اوس وخزرج (انصار کے قبائل) میں صبح سے شام تک خونریزی کر کے رہوں گا۔''

ابوبصیر نے اس سے کہا:

''واللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی یہ تلوار بڑی عمدہ ہے۔''

اس نے فوراً پُر جوش انداز میں جواب دیا: ''ہاں، اللہ کی قسم! یہ واقعی عمدہ ہے۔ میں نے اسے کئی بار آزمایا ہے۔''

ابوبصیر نے کہا: ''ذرا دِکھانا تو۔''

اس نے تلوار ابوبصیر کو پکڑا دی۔ جیسے ہی تلوار ابوبصیر کے ہاتھ میں آئی، انھوں نے پہلے تو اسے اوپر اٹھایا، پھر نیچے کیا گویا اس کی دھار کا بغور معاینہ کر رہے ہیں، پھر اچانک ایک جھٹکے سے اُنھوں نے تلوار لہرا کر آدمی کی گردن پر چلا دی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کا ساتھی جو قضائے حاجت کرنے گیا تھا، واپس آیا تو اپنے ساتھی کا سر قلم دیکھ کر بہت گھبرایا اور مدینے کی طرف دوڑ لگا دی۔ بھاگتا بھاگتا مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آتے دیکھا تو فرمایا:

''یہ خوفزدہ ہے۔''

وہ آدمی آتے ہی چلایا: ''واللہ! میرا ساتھی قتل کر دیا گیا۔ میں بھی ضرور قتل کر دیا جاؤں گا۔''

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ابوبصیر بھی آپہنچے۔ اُن کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی تلوار خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا:

''اے اللہ کے نبی! اللہ نے آپ کی ذمہ داری پوری کر دی۔ آپ نے مجھے اُنھیں لوٹا دیا اور اللہ نے مجھے اُن سے نجات دے دی۔ اب آپ مجھے اپنے ساتھ ملا لیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

''نہیں۔''

اس پر ابو بصیر نے چلا کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! یا پھر آپ مجھے چند آدمی دیں، میں مکہ فتح کر آتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ کو ان کی بہادری اچھی لگی۔ لیکن آپ اُن کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر تھے کیونکہ آپ کے اور اہل مکہ کے درمیان صلح کا معاہدہ تھا۔ آپ نے ابو بصیر کو نرمی سے ٹالنا چاہا کیونکہ حالات اچھے نہیں، نہ سہی!! طرزِ کلام تو اچھا ہو!

آپ نے فرمایا:

''اس کی ماں کا ستیاناس ہو! اگر اسے کوئی مدد گار مل گیا تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دے گا۔''[4]

ان الفاظ میں گویا ابو بصیر سے معذرت کا اشارہ تھا۔

ابو بصیر مسجد کے دروازے پر کھڑے رسول اللہ ﷺ سے مدینہ میں بسنے کی اجازت کے منتظر تھے۔ لیکن آپ عہد شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ابو بصیر کو حکم دیا کہ وہ مدینے سے نکل جائیں۔ ابو بصیر نے دل بُرا کیے بغیر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ مدینہ سے نکل آئے اور حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ مکہ میں اذیتیں اور قید و بند کی صعوبتیں تھیں۔ مدینہ میں عہد کی پاسداری تھی۔ ابو بصیر بحیرۂ احمر کے ساحل کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنی رہائش کے لیے کھلے آسمان تلے ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ یہاں اُن کا نہ کوئی ہمدرد تھا اور نہ ہم نشیں۔

مکہ میں محبوس مسلمانوں کو ابو بصیر کی کارروائی کا پتا چلا تو اُنھیں محسوس ہوا کہ راہِ نجات کا دروازہ کھل گیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے مسلمان عہد کی پاسداری میں اُنھیں قبول کرنے سے گریزاں تھے اور مکہ میں مشرکین نے عذاب میں ڈال رکھا تھا۔ ابو جندل بھی

قید سے فرار ہو کر ابو بصیر سے آ ملے۔ وہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ اب مکہ سے فرار ہونے والے مسلمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ یکے بعد دیگرے ابو بصیر سے آ کر ملتے رہے۔ ساحلِ سمندر پر قیام پذیر اِن مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اُنھیں ایک گونہ قوت کا احساس ہوا۔ قریشِ مکہ کی شامت آ گئی۔ مکہ کا جو تجارتی قافلہ ساحلِ سمندر یا اس کے آس پاس سے گزرتا، یہ مٹھی بھر مسلمان اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور مال و متاع لوٹ لیتے۔ ابو بصیر اور اُن کے ساتھیوں کی ترکتازیاں بڑھیں تو قریش نے نبی ﷺ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا اُنھیں اپنے پاس بلا لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آدمی بھیج کر انھیں مدینے بلا لیا۔ قاصد نے انھیں نبی ﷺ کا خط دیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ابو بصیر جو مرض الموت میں صاحبِ فراش تھے، بار بار یہی کہتے:

"میرا رب بہت بڑا اور بلند و برتر ہے۔ جس کی مدد اللہ کرے اسے کون شکست دے سکتا ہے؟"

اُن کے ساتھی خیمے میں آئے اور انھیں رسول اللہ ﷺ کا خط دکھایا کہ آپ ﷺ نے ہمیں مدینے میں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور پردیس کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ اُن کی مرادیں بر آئی ہیں اور اللہ نے اُن کی سن لی ہے۔ ابو بصیر نے خط لیا، چوم کر سینے سے لگایا اور کہا:

"میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا رسول ہے۔"

اتنا کہہ کر ہچکی بھری اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

---

1 المعجم الكبير للطبراني: 453/12، حديث: 13646، والسلسلة الصحيحة، حديث: 906.

2 صحيح البخاري، حديث: 2731، وسنن أبي داود، حديث: 2765. 3 صحيح البخاري، حديث: 2731. 4 صحيح البخاري، حديث: 2731.

دُعا

اس عنوان سے یہ نہ سمجھیے گا کہ میں یہاں دعا کے فضائل و مسائل بیان کرنے جا رہا ہوں۔ اس بحث کا ہمارے موضوع ''لوگوں سے تعامل کی مہارتیں'' سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ یہاں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دُعا کی مہارت کے ذریعے لوگوں کو کیونکر اپنا بنایا جا سکتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہا کیجیے کہ وہ ہمیں حسنِ اخلاق کی ہدایت دے۔ رسول اللہ ﷺ بھی یہ دعا کیا کرتے تھے:

«اللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِي، وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْلِي ذُنُوبِي جَمِيعًا، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ»

''اے اللہ! تو بادشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو میرا رب ہے اور میں تیرا ہی بندہ ہوں۔ میں نے خود پر ظلم کیا۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ میرے گناہ معاف کر دے۔ یہ تیری شان ہے کہ تیرے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کرتا۔ اور

مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت دے۔ بہترین اخلاق کی ہدایت تو ہی دے سکتا ہے۔ مجھے بُرے اخلاق سے بچا۔ بُرے اخلاق سے مجھے تو ہی بچا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ اور ساری خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔"[1]

لوگ عام طور پر اپنے لیے دعائیہ کلمات پسند کرتے ہیں۔ آپ اُن سے مل کر سلام کے بعد حال احوال پوچھیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ اللہ آپ کو خوش رکھے، آپ کی زندگی میں برکت دے تو لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ کسی آدمی سے ملیں، اس کے بچے بھی ہمراہ ہوں تو آپ کہہ سکتے ہیں:

"اللہ ان سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ اللہ آپ کی وحدت قائم رکھے۔ اللہ کرے آپ کی اولاد نیک زندگی بسر کرے، وغیرہ۔"

میں یہ باتیں تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گفتگو کے دوران ایسے دعائیہ کلمات کا لوگوں کے دلوں پر عجیب اثر ہوتا ہے۔

دو برس پہلے رمضان کی ایک مبارک رات کو میں معروف سیٹلائٹ ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں مدعو تھا۔ پروگرام کا موضوع تھا: "رمضان کے بابرکت مہینے میں عبادت۔"

پروگرام کا انعقاد مکہ مکرمہ میں حرم کے پڑوس میں واقع ایک بڑے ہوٹل کے کمرے میں کیا گیا تھا جہاں سے کعبہ پر سیدھی نظر پڑتی تھی۔ ہم رمضان المبارک کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سامنے بیٹھے ناظرین ہماری پچھلی جانب کھڑکی سے بآسانی حرم کا نظارہ کر سکتے تھے۔ خاصا پُر وقار منظر تھا۔ پروگرام کا میزبان اثنائے گفتگو میں رِقّتِ قلبی سے رو پڑا۔ پوری فضا روحانی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف ایک شخص کو اس کا احساس نہیں تھا۔ یہ کیمرہ مین تھا جس نے ایک ہاتھ سے کیمرہ تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں جلتا ہوا سگار تھا۔ وہ رمضان کی بابرکت رات کا ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے پھیپھڑے تمباکو کے

دھویں سے بھرنے پر تلا ہوا تھا۔ سگار کے دھویں نے مجھے بہت تنگ کیا۔ میرا اور میرے پہلو میں بیٹھے صاحب کا دم گھٹنے لگا۔ لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پروگرام براہِ راست تھا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد پروگرام خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوا۔ کیمرہ مین میرا شکریہ ادا کرنے آگے بڑھا۔ سگار اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور کہا: ''دینی پروگراموں کی عکس بندی میں آپ کی شرکت کا بھی شکریہ۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی توجہ درکار ہے۔''

وہ بولا: ''جی، جی، فرمایئے۔''

میں نے کہنا شروع کیا: ''سگریٹ نوشی اور سگار......''

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: ''آپ مجھے نصیحت مت کیجیے۔ واللہ! اس کا کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ آپ میری بات تو سن لیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ سگریٹ نوشی حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ............''

اس نے دوبارہ قطع کلامی کی: ''یا شیخ! اپنا وقت ضائع مت کیجیے۔ میں چالیس برس سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں۔ میری رگوں میں خون کی جگہ تمباکو دوڑتا ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ آپ سے بڑے علماء مجھ پر اپنا وقت ضائع کر چکے ہیں۔''

میں نے کہا: ''یعنی کوئی فائدہ ہی نہیں؟''

وہ مجھ سے تنگ آ کر کہنے لگا: ''بس، دعا کیجیے دعا۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ''میرے ساتھ آیئے۔''

وہ پوچھنے لگا: ''کہاں؟''

میں نے جلدی سے کہا: ''آیئے کعبہ کو دیکھتے ہیں۔''

ہم حرم شریف کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر کھڑے ہو گئے۔ بیت اللہ رکوع و سجود اور عمرہ کرنے والوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ یہ منظر واقعی بڑا متاثر کن تھا۔

میں نے کہا: ''آپ ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں؟''

وہ بولا: ''ہاں، دیکھ رہا ہوں۔''

میں نے کہا: ''یہ لوگ پوری دنیا سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان میں کالے گورے، عرب و عجم، غنی و فقیر ہر رنگ، ہر نسل اور ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ یہ سب اللہ سے دعائیں کر رہے ہیں کہ وہ اُن کے نیک اعمال قبول کرے اور گناہ معاف کر دے۔''

اس نے کہا: ''بالکل صحیح، بالکل درست۔''

اس پر میں نے کہا: ''آپ کی تمنا نہیں کہ اللہ آپ کو بھی وہی کچھ عطا کرے جو انھیں عطا کرتا ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''کیوں نہیں، میں ضرور یہ چاہوں گا۔''

میں نے کہا: ''اچھا، ہاتھ اُٹھائیے۔ میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ آمین کہیے گا۔''

میں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی: ''اے اللہ! اپنے اس بندے کو معاف کر دے۔''

اس نے آمین کہا۔

میں نے کہا: ''اے اللہ! اس کا درجہ بلند کر اور اسے جنت میں احباب کے ساتھ اکٹھا کر۔''

اے اللہ!!!......

میں دعا کرتا رہا اور وہ آمین کہتا رہا، یہاں تک کہ اس کا دل نرم پڑ گیا اور وہ رو دیا۔

اس کی زبان ایک تسلسل سے آمین آمین کا لفظ ادا کر رہی تھی۔

میں نے آخری دعا یہ کی: ''اے اللہ! اگر تیرے اس بندے نے سگریٹ نوشی ترک کر دی تو اس کے حق میں میری دعا قبول فرما ورنہ اسے ان دعاؤں کے ثمرات سے محروم رکھنا۔''

وہ آدمی زارو قطار رونے لگا۔ اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ چند ماہ بعد مجھے ایک پروگرام کے سلسلے میں اسی ٹی وی چینل کے مرکزی دفتر آنے کی دعوت دی گئی۔ میں دفتر کی پُر شکوہ عمارت میں داخل ہوا تو بھرے ہوئے جسم کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھے نہایت گرم جوشی سے سلام کیا اور میرا سر چوم کر ہاتھوں پر جھک گیا۔ وہ بڑا جذباتی نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

وہ بولا: ''آپ کو وہ کیمرہ مین یاد ہے جسے دو سال پہلے آپ نے سگریٹ نوشی ترک کر دینے کو کہا تھا؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

وہ کہنے لگا: ''میں وہی ہوں۔ واللہ یا شیخ! وہ دن ہے اور آج کا دن، سگار نے میرے منہ کو نہیں چھوا۔''

اب جبکہ میں یادوں کی کتاب کھول چکا ہوں تو ایک اور واقعہ سنتے جائیے:

تین سال قبل حج کے موسم میں عصر کی نماز کے بعد مجھے حجاجِ کرام کی ایک بڑی کھیپ سے خطاب کرنا تھا۔ تقریر کے اختتام پر لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ سلام دعا، تعارف اور سوالات کا سلسلہ چلا۔ میں یہاں سے جلدی فارغ ہو جانا چاہتا تھا تاکہ فوراً جا کر اگلی کھیپ کو خطاب کر سکوں۔

اتنے میں، میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان کبھی آگے آتا ہے کبھی پیچھے ہو جاتا ہے۔ وہ

دھکم پیل سے کترا رہا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور ہاتھ آگے کر دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ میں نے اسی شور شرابے میں اس سے پوچھا کہ آپ کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے اسے پکڑ کر بھیڑ کے درمیان سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں نے دریافت کیا: ''کیا سوال ہے آپ کا؟''

وہ تیزی سے بولا: ''میں رمی کرنے لگا تھا۔ میری دادی اور بہن بھی ہمراہ تھیں۔ وہاں رش بہت تھا...... اُس نے سوال ختم کیا اور میں نے جواب دے دیا۔ اس دوران مجھے اس سے تمباکو کی بو آئی۔ میں نے مسکرا کر پوچھا: ''سگریٹ پیتے ہیں؟''

اس نے جواب دیا: ''جی ہاں۔''

میں نے کہا: ''اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی مغفرت کرے، آپ کا حج قبول کرے اگر آپ ابھی اور اسی وقت سے سگریٹ نوشی ترک کر دیں۔''

وہ نوجوان خاموش رہا۔ تاثر اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔

آٹھ ماہ بعد میں لیکچر دینے ایک معروف شہر گیا۔ مسجد میں داخل ہوا تو ایک باوقار نوجوان دروازے پر میرا منتظر تھا۔ وہ میری طرف بڑھا اور پُر جوش انداز میں سلام کہا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ میں اسے نہ پہچان سکا۔ وہ بولا: ''کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''آپ کی محبت اور خیر مقدم کا شکریہ لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

وہ بولا: ''یاد کیجیے، حج کے دوران ایک سگریٹ نوش نوجوان آپ سے ملا تھا اور آپ نے اسے سگریٹ نوشی ترک کر دینے کی تلقین کی تھی۔''

میں نے کہا: ''ہاں، ہاں۔''

وہ بولا: ''میں وہی ہوں۔ آپ کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ الحمد للہ تب سے میں نے سگریٹ اپنے منہ میں نہیں رکھا۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے سے میرے کئی معاملات بہتر

ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ یہاں میرے اس یقین میں اضافہ ہوا کہ لوگوں کی موجودگی میں ان کے لیے دعا کرنا نہایت اثر انگیز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا طریقہ بھی یہی تھا۔ آپ دعا کی مہارت کے ذریعے سے لوگوں کو دین کی طرف راغب کرتے تھے۔

طفیل بن عمرو قبیلۂ دوس کے سردار و مقتدا تھے۔ وہ ایک روز کسی کام سے مکہ آئے۔ اشرافِ قریش نے انھیں دیکھا تو دریافت کیا: "تم کون ہو؟"

انھوں نے بتایا کہ "میں دوس کا سردار طفیل بن عمرو ہوں۔"

قریش کو خدشہ ہوا کہیں طفیل بن عمرو رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے متاثر نہ ہو جائیں۔ انھوں نے طفیل سے کہا: "یہاں ایک آدمی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہے۔ اس کے قریب بیٹھنے یا اس کی باتیں سننے سے پرہیز کیجیے گا۔ وہ ساحر ہے۔ اگر آپ اس کی باتیں سننے بیٹھ گئے تو دماغ خراب ہو جائے گا۔"

طفیل کہتے ہیں: "واللہ! وہ مجھے ڈراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے طے کر لیا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی بات نہیں سنوں گا اور نہ اُن سے کلام کروں گا۔ اور تو اور میں نے اس ڈر سے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ مبادا میں رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گزر رہا ہوں اور آپ کی کوئی بات میرے کانوں میں پڑ جائے۔ اگلی صبح میں مسجد میں آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں آپ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آخر اللہ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے الفاظ سنا کر چھوڑے۔ یہ بڑا عمدہ کلام تھا۔ میں نے دل میں کہا: "میری ماں کی بربادی! واللہ! میں اچھا خاصا عقل مند آدمی ہوں۔ بُرا بھلا خوب جانتا اور سمجھتا ہوں، پھر میں اس آدمی کا کلام کیوں نہ سن لوں۔ اگر اس کی باتیں

اچھی ہوئیں تو قبول کرلوں گا، بری ہوئیں تو چھوڑ دوں گا۔ میں وہاں ٹھہرا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نماز مکمل کر کے گھر کو روانہ ہوئے تو میں بھی آپ کے پیچھے ہولیا۔ آپ اپنے گھر چلے گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا۔ میں نے کہا:

''محمد! آپ کی قوم یہ اور یہ کہتی ہے، واللہ! وہ مجھے خوفزدہ کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تا کہ آپ کی باتیں نہ سن سکوں۔ اب میں آپ کی ایک بات سن چکا ہوں جو مجھے اچھی لگی ہے، اس لیے آپ اپنا معاملہ میرے سامنے پیش کریں۔''

طفیل کی یہ باتیں سن کر رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے۔ آپ نے طفیل کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کی تلاوت کی۔ طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے وہیں اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! قوم میری بات مانتی ہے۔ میں جا کر اُنھیں اسلام کی طرف بلاؤں گا۔''

یہ کہہ کر طفیل مکہ سے نکلے اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی قوم کے پاس پہنچے۔ والد ملنے آئے جو نہایت عمر رسیدہ تھے اور زندگی کے دن گن رہے تھے۔ طفیل نے پختہ لہجے میں انھیں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا:

''ابا جان! آپ مجھ سے دور رہیے۔ آپ کا مجھ سے اور میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ بہت گھبرائے، پوچھا: ''آخر کیوں، بیٹے؟''

کہا: ''میں مسلمان ہو کر محمد کے دین کا پیروکار بن گیا ہوں۔''

والد کہنے لگے: ''پیارے بیٹے! میرا دین بھی وہی ہے جو تیرا ہے۔''

طفیل نے کہا: ''پھر جا کر غسل کیجیے اور پاک صاف ہو کر آئیے تا کہ میں آپ کو وہ باتیں بتاؤں جو میں نے سیکھی ہیں۔''

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے والد گئے۔ غسل کر کے پاک صاف ہوئے، پھر طفیل کے پاس آئے۔ طفیل نے اُن کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ مسلمان ہو گئے۔ ادھر سے فارغ ہو کر طفیل اپنے گھر گئے۔ بیوی دوڑی دوڑی شوہر سے ملنے آئی۔ اُنھوں نے کہا: ''دور رہو۔ میرا تم سے اور تمھارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

وہ کہنے لگی: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیوں؟''

طفیل نے کہا: ''اسلام نے میرے اور تمھارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا پیرو بن چکا ہوں۔''

بیوی بولی: ''میرا دین بھی وہی ہے جو آپ کا ہے۔''

انھوں نے کہا: ''جاؤ اور پاک صاف ہو کر آؤ۔''

بیوی گئی۔ اسے ڈر آیا کہ قوم کے بت کی پوجا چھوڑ دی تو وہ بچوں کو مار ڈالے گا۔ یہ سوچ کر واپس آئی اور کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! بچوں کے متعلق آپ کو ذوالشریٰ سے ڈر نہیں لگتا؟''

ذوالشریٰ ان کے بت کا نام تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اس کی پوجا چھوڑ دے وہ اسے اور اس کے بال بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

طفیل کہنے لگے: ''جاؤ۔ میں تمھیں ضمانت دیتا ہوں کہ ذوالشریٰ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

وہ گئی اور غسل کر کے آئی۔ انھوں نے اسلام کے متعلق بتایا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ قوم کے گھر گھر جا کر اسلام کی دعوت دینے لگے۔ وہ اُن کی مجلسوں میں جاتے اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر توحید کا ڈنکا بجاتے۔

قوم کے لوگوں نے ان کی بات مان کر بتوں کی پوجا چھوڑ دینے سے انکار کر دیا۔ طفیل

بن عمرو رضی اللہ عنہ اُن کے اس رویے سے سخت ناراض ہوئے۔ انھوں نے رخت سفر باندھا اور مکہ روانہ ہو گئے۔

مکہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے اور کہا:

''یا رسول اللہ! دوس کے لوگوں نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ اُن پر بددعا کیجیے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔ طفیل رضی اللہ عنہ نے دل میں کہا: ''دوس کی شامتِ اعمال آ گئی۔''

لیکن رحم دل نبی گویا ہوا:

«اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا، اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا»

''اے اللہ! دوس کو ہدایت دے۔ اے اللہ! دوس کو ہدایت دے۔''[2]

پھر طفیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''آپ اپنی قوم کے پاس واپس جائیے اور اُنھیں نرم گفتاری سے اسلام کی طرف بلائیے۔''[3]

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ واپس گئے اور قوم کو اسلام کا پیغام سناتے رہے، یہاں تک کہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔

سبحان اللہ! آسمان کے دروازے کھٹکھٹانا کیسا عمدہ عمل ہے۔

نبوی دعوت کے ابتدائی دور میں مسلمان قلیل تعداد میں تھے۔ یہ اڑتیس آدمی تھے۔ ایک روز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصرار کیا کہ باہر چلیں اور اسلام کی علانیہ دعوت دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر! ابھی ہم تھوڑے ہیں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت پُر جوش تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اصرار کرتے رہے۔ آپ نے اڑتیس مسلمانوں کو جمع کیا اور اُن کے جلو میں باہر نکلے۔ مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) میں آئے۔ ہر آدمی اپنی قوم کی مجلس میں گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سب کے سامنے کھڑے ہوئے اور اسلام کی حقانیت بیان کرنے اور بتوں کا ابطال کرنے لگے۔ مشرکین مسلمانوں پر پل پڑے۔ اُنھوں نے مسجد کے کونوں میں پھیل کر مسلمانوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ مشرکین کی تعداد زیادہ تھی۔ مسلمان تتر بتر ہو گئے۔ مشرکین کی ایک ٹولی ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوئی اور انھیں شدید زدوکوب کیا۔ وہ زمین پر گر پڑے۔ فاسق عتبہ بن ربیعہ آیا اور اپنے پیوند لگے چرمی جوتوں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر مارنے لگا، پھر ان کے پیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔ جلد جا بجا پھٹ گئی تھی۔ ناک نقشہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنوتیم کے لوگ بھاگم بھاگ آئے۔ لوگوں کو ہٹایا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک چادر میں اٹھا کر گھر پہنچا دیا۔ انھیں یقین تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ زندہ نہیں رہیں گے۔ بنوتیم کے لوگ واپس مسجد میں گئے اور سب کے درمیان اعلان کیا کہ واللہ! اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ جان بحق ہو گئے تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس کے بعد وہ دوبارہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئے۔ وہ بے ہوش تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ والد ابوقحافہ اور قوم کے لوگ چارپائی کے گرد کھڑے انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ والدہ سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ دن کے آخری پہر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنکھیں کھولیں۔ پہلی بات یہ کہی کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے۔ قوم کے لوگوں کو سخت غصہ آیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو بُرا بھلا کہنے لگے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ سے کہا:

”اسے کچھ کھلا پلا دیجیے گا۔“

والدہ اصرار کرنے لگیں کہ کچھ کھا پی لو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ یہی پوچھتے رہے:

”رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ رسول اللہ کا کیا بنا؟“

ماں نے کہا: ”واللہ! مجھے تمھارے ساتھی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

ابوبکر رضی اللہ عنہ ماں سے کہنے لگے: ”ام جمیل بنت خطاب کی طرف جائیے اور رسول اللہ کے متعلق پوچھ کر آئیے۔“

وہ ام جمیل رضی اللہ عنہا کے گھر آئیں اور بولیں:

”ابوبکر تم سے محمد بن عبداللہ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔“

ام جمیل نے کہا: ”میں ابوبکر یا محمد بن عبداللہ کو نہیں جانتی۔ لیکن کیا تم پسند کرو گی کہ میں تمھارے ساتھ تمھارے بیٹے کے پاس چلوں؟“

کہا: ”ٹھیک ہے۔“

ابوبکر کی والدہ ام جمیل رضی اللہ عنہا کو ساتھ لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں۔ ام جمیل رضی اللہ عنہا نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دگرگوں حالت دیکھی تو کہنے لگیں:

”واللہ! جس قوم نے آپ سے یہ سلوک کیا ہے وہ اہلِ کفر و فِسق ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے آپ کا انتقام لے گا۔“

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بوجھل آنکھوں سے ام جمیل رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھا اور دریافت کیا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟“

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ پاس بیٹھی تھیں۔ ام جمیل کو خدشہ ہوا کہ لوگوں کو میرے اسلام لانے کا پتا چل گیا تو وہ مجھے اذیت دیں گے۔

وہ بولیں: ”ابوبکر! آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔“

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا: ”میری والدہ سے آپ کو کوئی

خطرہ نہیں۔''

اس پر ام جمیل نے کہا:

''خوش خبری یہ ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) صحیح سلامت ہیں۔''

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بے قراری سے پوچھا: ''کہاں ہیں وہ؟''

ام جمیل: ''ابو ارقم کے گھر میں۔''

ابو بکر کی والدہ نے التجا کی: ''تمھیں اپنے ساتھی کا حال معلوم ہو گیا۔ اب کچھ کھا پی لو۔''

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا جب تک رسول اللہ ﷺ کو ان آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔''

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ اور امّ جمیل انتظار کرتی رہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت تھمی تو وہ انھیں لے کر گھر سے نکلیں۔ نقاہت کی شدت سے ابو بکر کے پاؤں زمین پر لکیر کھینچتے جا رہے تھے۔ یہ تینوں دارِ ارقم میں داخل ہوئے تو مسلمانوں نے دوڑ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پکڑا۔ رسول اللہ ﷺ اُن پر جھک گئے اور بوسہ دیا۔ مسلمانوں نے بھی انھیں پیار سے چوما۔ اُن کی حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کا دل بھر آیا۔ دکھ کے آثار آپ کے بابرکت چہرے پر دیکھے گئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر کہا:

''اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ مجھے اُن ضربوں کے علاوہ کوئی خاص تکلیف نہیں جو اس فاسق نے میرے منہ پر لگائی تھیں۔''

پھر وہ کہنے لگے:

''اے اللہ کے رسول! میری والدہ اپنے والدین سے حسنِ سلوک کرتی ہیں۔ آپ بابرکت ہیں۔ انھیں اللہ کی طرف بلائیے اور اللہ سے ان کے لیے دعا کیجیے۔ شاید اللہ آپ کے ذریعے انھیں آگ سے بچا لے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کے لیے

دعا کی اور اُنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ وہ فوراً ایمان لے آئیں۔

مسلمانوں کی زندگی میں دعا کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ اسلام نہیں لائی تھیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والدہ کو اسلام کی دعوت دیتے تو وہ انکار کر دیتیں۔ ایک روز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے والدہ سے اصرار کیا کہ اسلام قبول کر لیں۔ اس پر طیش میں آ کر والدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا بھلا کہہ دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت رنجیدہ ہوئے اور روتے روتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور عرض کی:

''اے اللہ کے رسول! میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتا رہتا ہوں اور وہ انکار کرتی رہتی ہیں۔ آج پھر میں نے اُنھیں اسلام کی طرف بلایا تو اُنھوں نے آپ کے بارے میں غلط باتیں کہیں۔ اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ اُمِّ ابوہریرہ کو اسلام کی ہدایت دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے دعا کی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ گھر لوٹے۔ دروازہ کھولنا چاہا تو وہ بند تھا۔ دستک دینے پر والدہ نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی کہا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات والدہ کی زبان سے سنے تو فوراً واپس ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اُنھوں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! خوش ہو جائیے۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول کر لی۔''

یوں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نیک بخت والدہ کو اللہ نے اسلام کی ہدایت دی۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ اپنے مومن بندوں کے دلوں میں میری اور میری والدہ کی محبت ڈال دے اور اُنھیں ہمارے لیے محبوب بنا دے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی:

”اے اللہ! اپنے اس پیارے بندے اور اس کی والدہ کو اپنے مومن بندوں کا محبوب بنا دے اور مومنین کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دے۔“[4]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”یوں رُوئے زمین پر موجود ہر مومن مرد اور مومن عورت کو مجھ سے محبت ہے اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔“

روشنی کی کرن

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

”اور تمھارے ربّ نے کہا کہ مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔“[5]

---

[1] صحيح مسلم، حديث:771. [2] صحيح البخاري، حديث:6397، وصحيح مسلم، حديث: 2524. [3] دلائل النبوة للبيهقي:362/5. [4] صحيح مسلم، حديث:2491. [5] المؤمن40:60.

دونوں آنکھوں سے دیکھیے

ہم ہمیشہ لوگوں کی غلطیاں نکالنے اور اُن کی لغزشیں نوٹ کرنے میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اکثر نکتہ چینی بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوشش کر کے لوگوں کی اچھائیاں تلاش کریں اور پھر اُن اچھائیوں کی بنیاد پر لوگوں کی ستائش میں پیش پیش ہوں۔

تمام اساتذہ بدمحنت، سست اور غبی طالب علم کو ہمیشہ کوستے ہیں۔ بہت کم اساتذہ ایسے ہوتے ہیں جو محنتی اور ہوشیار طالبِ علم کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

بسا اوقات ہم بچوں کو اُن کی غلطیوں اور شرارتوں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ کوئی اچھا کام کرتے ہیں تو ہم عموماً توجہ نہیں دیتے۔ یوں ہم دلوں تک رسائی کے بہت سے مواقع کھو دیتے ہیں۔

لوگوں میں موجود اچھائیوں کی تعریف کرنا واقعی بڑی عمدہ مہارت ہے۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قوم تلاوت وحفظِ قرآن کا بہت اہتمام کرتی تھی۔ تلاوتِ کلامِ پاک کی کثرت اور عمدگی کے باعث اُنھیں بیشتر صحابۂ کرام پر فوقیت حاصل تھی۔

ایک سفر کے دوران قبیلۂ اشعر کے لوگ نبی ﷺ کے ہمراہ تھے۔ رات کو ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ صبح ہوئی اور لوگ اکٹھے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے اشعری رفقاء رات کو خیموں میں جاتے ہیں تو میں تلاوتِ قرآن میں منہمک ان کی آوازوں سے خیمے پہچان لیتا ہوں۔ اگرچہ میں نے دن کے وقت اُن کے خیمے نہیں دیکھے ہوتے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے ان تعریفی جملوں سے اشعریوں کو جو مسرت حاصل ہوئی ہو گی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ایک صبح رسول اللہ ﷺ کی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔آپ نے ان سے فرمایا:

''کاش! رات آپ مجھے دیکھتے جب میں آپ کی تلاوت کان لگا کر سن رہا تھا۔
آپ کو تو آلِ داوٗد کے سُروں میں سے ایک سُر عطا کیا گیا ہے۔''

اس پر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پھولے نہ سمائے۔ کہنے لگے: ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ میری تلاوت بغور سن رہے ہیں تو میں ایسی خوش الحانی سے تلاوت کرتا کہ مزہ آجاتا۔''[2]

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ اپنے احساسات پوشیدہ نہیں رکھتے تھے بلکہ جس کے لیے ہوتے اس کے سامنے اظہار کر دیتے تھے۔

عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ کا شمار عام صحابۂ کرام میں ہوتا تھا۔اُن میں کوئی غیر معمولی صلاحیت یا خوبی نہیں تھی، البتہ ان کا دل ایمان کی حرارت سے مملو تھا۔رسول اللہ ﷺ اُن کے دل کی اس کیفیت سے واقف تھے۔ایک روز آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔اتنے میں کسی طرف سے غنیمت وغیرہ کا مال آیا جسے آپ صحابۂ کرام کے درمیان تقسیم کرنے لگے۔ زکاۃ وصدقات کی عادلانہ تقسیم کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا طریقِ کار بڑا واضح اور صاف ستھرا تھا۔آپ مال کی اندھا دھند تقسیم کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ آپ نے چند لوگوں کو عطیات دیے اور دوسروں کو نہ دیے۔ جن افراد کو عطیہ نہ دیا گیا وہ دل ہی دل میں ناراض ہوئے کہ ہمیں کس بنا پر محروم رکھا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے کانوں میں اس ناراضی کی بھنک پڑی تو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا:

''اَمّا بعد! واللہ! میں ایک آدمی کو عطیہ دیتا ہوں اور دوسرے کو چھوڑ دیتا ہوں۔ جسے چھوڑ دیتا ہوں وہ مجھے اس سے بڑھ کر محبوب ہوتا ہے جسے عطیہ دیتا ہوں۔ لیکن چند افراد کو صرف اس لیے دیتا ہوں کہ میں اُن کے دلوں کی بے چینی دیکھ لیتا ہوں۔ اور چند لوگوں کو اُن کے قلوب میں اللہ کی طرف سے ڈالی گئی خیر کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اُنھی میں سے ایک عمرو بن تغلب ہیں۔''

عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے منہ سے برسرِ عام اپنی تعریف سنی تو بہت خوش ہوئے۔ بعد کے دنوں میں وہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کرتے: ''واللہ! مجھے پسند نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اُن جملوں کے بدلے مجھے سُرخ اونٹ مل جائیں۔''[1]

(اہلِ عرب کے نزدیک سرخ اونٹ نہایت بیش قیمت تھے، اس لیے کسی شے کی اہمیت جتانے کی غرض سے روزمرہ کی زبان میں ''سرخ اونٹ'' کا استعمال ہونے لگا۔)

ایک اور موقع پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا:

''روزِ قیامت آپ کی شفاعت کا حق دار کون ہوگا؟''

آپ ﷺ نے اُن کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے علم کے متعلق تمھارا شوق دیکھتے ہوئے یقین تھا کہ مجھ سے اس معاملے کے بارے میں تم سے قبل کوئی نہیں پوچھے گا۔ روزِ قیامت میری شفاعت کا حق دار وہ ہوگا جو صدقِ دل سے یہ اقرار کر لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''[2]

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ خیارِ صحابہ میں سے تھے۔ وہ عربی نہیں تھے بلکہ فارس (ایران) کے رئیس زادے تھے۔ اُن کے والد کو بیٹے سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ انھیں اپنی نظروں سے

دور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سلمان کے دل میں ایمان جاگزیں کیا۔ انھوں نے اپنا وطن چھوڑا اور حق کی تلاش میں شام پہنچ گئے۔ وہاں انھیں ایک آدمی نے دھوکے سے غلام بنا کر کسی یہودی کے ہاتھ بیچ دیا۔ صعوبت بھرے طویل سفر کے بعد وہ مدینہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ ایک روز آپ صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے کہ سورۂ جمعہ نازل ہوئی۔

آپ سورۂ جمعہ کی تلاوت کر رہے تھے اور صحابۂ کرام توجہ سے سن رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں خود انھی میں سے ایک رسول اٹھایا جو انھیں اس کی آیات سناتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔ اور ان میں سے کچھ اوروں کو بھی جو ابھی ان سے نہیں ملے اور وہ زبردست، دانا ہے۔''[5]

صحابۂ کرام میں سے کسی نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟''

آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ سوال کیا:

''اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟''

اس پر نبی ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

''اگر ایمان اَوجِ ثریا پر بھی ہوتا تو ان لوگوں میں کچھ افراد اسے ضرور جا لیتے۔''[6]

نقطۂ نظر

”ہمیشہ اچھا شگون لیں اور لوگوں سے حسنِ ظن رکھیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ کامیابی کے راستے پر مزید آگے بڑھتے رہیں۔“

---

(1) صحيح البخاري، حديث: 4232، و صحيح مسلم، حديث: 2499. (2) صحيح البخاري، حديث: 5048، وصحيح مسلم، حديث: 793، والمستدرك للحاكم: 466/3، وكنز العمال: 712/11. (3) صحيح البخاري: 923. (4) صحيح البخاري، حديث: 99، والترغيب والترهيب: 412/2. (5) الجمعه 62: 2، 3. (6) صحيح البخاري، حديث: 4897، وصحيح مسلم، حديث: 2546.

فنِ سماعت

لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کے دل موہ لینے کی مختلف مہارتیں اور طریقے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انسان کو کچھ کام کرنے پڑتے ہیں اور چند کاموں سے پرہیز برتنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسکراہٹ لوگوں کے لیے جاذب نظر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس درشتی اور یبوست سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ خوب صورت باتیں اور لطیفے لوگوں کو اچھے لگتے ہیں۔ لوگوں کی باتیں سننا اور سنتے چلے جانا اور اُن سے ہم آہنگی کا اظہار کرنا بھی اُنھیں بہت پسند آتا ہے۔

اس صحبت میں ہم آپ سے ''پُرکشش اطمینان'' کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

جی ہاں! بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں۔ محفلوں میں آپ کو اُن کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ بلکہ آپ محفل یا کسی مجلس میں اُن کی حرکتیں نوٹ کریں تو دیکھیں گے کہ اُن کا سر ہلتا ہے، آنکھیں بولتی ہیں لیکن زبان خاموش رہتی ہے۔ اس کے باوجود لوگ انھیں پسند کرتے ہیں اور ان کے پاس بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

جانتے ہیں کیوں؟

اس لیے کہ یہ لوگ ''پُرکشش اطمینان'' کی مہارت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ تین آدمیوں کا موازنہ کیجیے۔ ایک آدمی سے آپ اپنا کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آغاز ہی

میں آپ کی بات کاٹ کر کہتا ہے: ”ارے ارے! میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔“ آپ اس سے کہتے ہیں: ”صبر کرو۔ میری بات پوری ہو لینے دو۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ آپ اپنی بات کے نقطۂ عروج پر ہوتے ہیں تو وہ پھر بول پڑتا ہے:

”ہاں ہاں! یہی واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ میں..........“ آپ اس سے کہتے ہیں: ”بھائی، ذرا ٹھہرو۔“

وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے صبر نہیں ہوتا اور وہ قطع کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے: ”جلدی کرو۔ جلدی کرو۔“

دوسرا آدمی آپ کی بات کے دوران ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے یا جیب سے موبائل فون نکال کر اس میں مشغول ہو جاتا ہے۔

تیسرا آدمی جو فنِ سماعت سے واقف ہے آپ کی بات کے دوران نظریں آپ کے چہرے پر گاڑے رکھتا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کبھی وہ آپ کی تائید میں سر ہلاتا ہے، کبھی مسکراتا ہے اور کبھی تعجب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”سبحان اللہ! بڑی عجیب بات ہے۔“

ان تینوں میں سے کس آدمی کے ساتھ بیٹھ کر آپ خوشی محسوس کریں گے؟

یقیناً تیسرے آدمی کے ساتھ!

معلوم ہوا کہ جہاں لوگوں سے اچھی باتیں کر کے ان کے دل موہ لیے جاتے ہیں وہیں ان کے من پسند موضوع پر ان کی باتیں سن کر بھی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ایک معروف مبلغ جسے اللہ نے زبان دانی کا ملکہ عطا کیا تھا، ظاہر ہے کہ اسے اپنے مشغلے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بہت بولنا پڑتا تھا۔ کبھی جمعہ کے وعظ میں، کبھی فتویٰ کی

مسند پر، یونیورسٹی کے لیکچر میں اور جلسے میں خطاب کرتے ہوئے، وہ ہمیشہ بولتا تھا۔

لوگ اسے منبر پر اور سیٹلائٹ ٹی وی چینلوں پر دیکھتے، اس کی گفتگو پسند کرتے اور اس کی باتیں توجہ سے سنتے۔ اس کی بیوی کے علاوہ سبھی لوگ اسے چاہتے تھے۔ گھر میں بیوی کے ساتھ بھی وہ وہی ہاتھ رکھتا، یعنی اس کی کوئی بات نہ سنتا اور اپنی ہانکے جاتا۔ بیوی اس کی اس عادت سے تنگ آ چکی تھی، چنانچہ بیوی کے سوا سب اس کا اکرام کرتے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ ایک دن مبلغ نے سوچا کہ اپنے کسی خطاب میں بیوی کو بھی ساتھ لے جائے تا کہ وہ بھی لوگوں کی طرح اس کی شعلہ بیانی سے متاثر ہو اور احترام بجالایا کرے۔ اس نے بیوی سے کہا:

''میرے ساتھ چلو گی؟''

''کہاں؟''

''ایک داعی کی تقریر ہے۔ استفادہ کرنے چلتے ہیں۔''

وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔ مسجد پہنچے تو وہاں خاصا رش تھا۔ سب لوگ اس بے مثال مقرر کی تقریر سننے آئے تھے۔ اس کی بیوی عورتوں کی طرف چلی گئی جو الگ پردے میں بیٹھی تھی۔ مبلغ مسجد کے اندر گیا اور منبر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر خطاب کرنے لگا۔ لوگ خاموشی اور خوشی سے سنتے رہے۔ بیوی بھی خاصی متاثر ہوئی۔ تقریر ختم ہوئی۔

مبلغ فتح کے نشے میں چور اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ اس کی بیوی بھی آ گئی۔ دونوں گاڑی میں سوار ہو کر چل دیے۔

مبلغ اپنی عادت کے مطابق بولنے لگ گیا: ''رش بہت تھا۔ مسجد کیسی خوب صورت تھی!! باتوں باتوں میں اس نے بیوی سے پوچھا:

''تقریر کیسی تھی؟''

بیوی نے کہا: ''تقریر اچھی اور موثر تھی۔ مقرر کون تھا؟''
مبلغ کہنے لگا: ''تعجب ہے! تم نے اس کی آواز نہیں پہچانی؟''
بیوی نے کہا:
''ایک تو لوگ بہت تھے۔ دوسرے اسپیکر ٹھیک نہیں تھے۔ آواز کم آ رہی تھی۔''
مبلغ نے سرشاری سے کہا: ''میں، میں تھا وہ مقرر۔''
بیوی نے جلدی سے کہا:
''ارّے! تبھی میں دل میں کہتی رہی کہ یہ بولتا بہت ہے۔''

پتا چلا کہ صبر اور اطمینان سے لوگوں کی باتیں سننا بھی ایک فن ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک زبان اور دو کان دیے ہیں تاکہ وہ سنے زیادہ اور بولے کم، اس لیے دوسروں کی باتیں خاموشی اور اطمینان سے سننے کی عادت ڈالیے۔

''لوگوں کی باتیں توجہ اور خاموشی سے سننا سیکھیں۔ لوگ آپ کے قریب آجائیں گے۔''

فنِ مکالمہ

آپ نے عموماً دیکھا ہو گا کہ دو آدمی بحث و تکرار کرتے ہوئے لڑ پڑتے اور ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایسا صرف فنِ مکالمہ سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بحث و مباحثہ کرنے والا دشوار گزار پہاڑ کے کوہ پیما کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ڈالنے اور پاؤں رکھنے کی جگہوں کو دھیان میں رکھے۔ وہ جس چٹان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہو پہلے اسے غور سے دیکھتا اور اندازہ کرتا ہے کہ یہ چٹان اپنی جگہ پر کتنی مضبوطی سے قائم ہے۔ جس پتھر پر اس نے پاؤں ٹکانا ہو اسے بھی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ پھر جس پتھر سے قدم اٹھانا ہو وہاں بھی احتیاط سے کام لیتا ہے کہ مبادا وہ درست طور پر پیر نہ اٹھا سکے اور چٹان نیچے سے سرک کر اسے گہری کھائی میں پہنچا دے۔

بحث و تکرار میں پڑنا دراصل کوئی قابلِ تعریف فعل نہیں۔ شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں کہ نوے فیصد سے زائد مباحثے بالکل بے فائدہ موضوعات پر ہوتے ہیں۔

اس لیے اوّل تو بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر کہیں بحث و تکرار کے آنگن میں انگڑائی لینی پڑ جائے تو غصے میں نہ آیئے۔ معاملے کو وسیع الظرفی اور کھلے دل و دماغ سے لیجیے۔

قریش نے حدیبیہ کے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ نے اللہ سے دعا کی کہ قریش مکہ کو ہماری پیش قدمی کی اطلاع نہ ہو۔ آپ چاہتے تھے کہ انھیں جنگ کی تیاری کرنے کا موقع دیے بغیر اچانک ہلا بول دیا جائے۔

اسلامی لشکر مکہ پہنچ کر ایک قریبی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ قریش کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اسلامی لشکر سر پر آ پہنچا ہے، پھر بھی وہ سن گن لے رہے تھے۔ جس رات اسلامی لشکر وہاں اترا اسی رات ابوسفیان چند افراد کے ہمراہ اردگرد کا جائزہ لینے نکلا۔ اُدھر قریش پر حملہ آور ہونے کے لیے نبی ﷺ صبح کے منتظر تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو کہا:

"قریش کی یہ صبح بہت بری ہوگی۔ واللہ! اگر رسول اللہ ﷺ بزور مکہ میں داخل ہوئے اور قریش نے آ کر امان حاصل نہ کی تو قریش کا نام مٹ جائے گا۔"

عباس رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دے دی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی سفید خچری پر سوار ہوئے اور چل دیے۔ ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ادھر آ نکلا۔ مسلمانوں نے آگ کے الاؤ روشن کر رکھے تھے۔ ابوسفیان نے آگ دیکھی تو کہنے لگا: "اتنی آگ اور اتنا بڑا لشکر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

ایک ساتھی نے جواب دیا: "یہ واللہ خزاعہ کا قبیلہ ہے جو جنگ کرنے آئے ہیں۔"

ابوسفیان بولا: "نہیں، خزاعہ کی تعداد اس سے کہیں کم ہے۔ آگ کے اتنے الاؤ اور اتنا بڑا لشکر ان کا نہیں ہو سکتا۔"

ابوسفیان دھیرے دھیرے قریب آ گیا تو مسلمان پہریداروں نے اسے پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیج دیا۔ خچری پر سوار عباس رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی چند مسلمان گھڑ سواروں کے گھیرے میں ہیں۔ ابوسفیان کی نظر عباس رضی اللہ عنہ پر

پڑی تو وہ گھبراہٹ کے عالم میں اُن کی طرف آیا اور عباس کے پیچھے خچری پر سوار ہو گیا۔ ابوسفیان کے ساتھی انتہائی پریشانی کی حالت میں خچری کے پیچھے پیچھے چلنے لگے اور مسلمان ان کے پیچھے ہو لیے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے خچری کو ایڑ دی اور ابوسفیان کو لے کر تیزی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب چل دیے۔ آگ کے کسی الاؤ کے پاس سے گزرتے تو مسلمان کہتے کہ یہ کون ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچری اور اس پر عباس رضی اللہ عنہ کو سوار دیکھ کر کہتے: ''رسول اللہ کے چچا رسول اللہ کی خچری پر ہیں (لہٰذا کوئی خطرہ نہیں)۔''

عباس رضی اللہ عنہ خچری کو تیز دوڑا رہے تھے کہ مبادا مسلمانوں کو ابوسفیان کا پتا چل جائے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قریب سے گزرے تو انھوں نے کہا کہ یہ کون ہے اور اٹھ کر آگے آ گئے۔ انھوں نے ابوسفیان کو دیکھا تو چیخ اٹھے: ''ابوسفیان! اللہ کا دشمن! اللہ کا شکر ہے جس نے بغیر کسی معاہدے کے تمھیں ہمارے قابو میں دے دیا ہے۔''

عباس رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو منع کیا کہ ابوسفیان سے تعرض نہ کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اُدھر عباس رضی اللہ عنہ نے بھی خچری کو ایڑ لگائی اور عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اسی وقت عمر رضی اللہ عنہ بھی آ پہنچے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! یہ ابوسفیان ہے۔ اللہ نے اسے بغیر کسی معاہدے کے ہمارے قابو میں دے دیا ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔''

عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے اسے پناہ دی ہے۔''

یہ کہہ کر عباس رضی اللہ عنہ قریب آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں سرگوشی کرنے لگے۔

عمر رضی اللہ عنہ بار بار یہی کہتے رہے:

''اے اللہ کے رسول! اسے قتل کر دیجیے۔''

عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''عمر! ٹھہرو! واللہ! اس کا تعلق بنو عدی بن

کعب (عمر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ) سے ہوتا تو تم یہ بات نہ کرتے۔"

عمر رضی اللہ عنہ کو ادراک ہو گیا کہ وہ ایک ایسی بحث میں پڑنے جا رہے ہیں جو فی الحال بے فائدہ ہے۔ انھوں نے اطمینان سے کہا: "ٹھہرو عباس! ٹھہرو! واللہ! تمھارا اسلام، جس دن تم مسلمان ہوئے، مجھے اپنے والد خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ پسند تھا اگر وہ مسلمان ہو جاتے، اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا اسلام لانا رسول اللہ ﷺ کو خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ پسند تھا۔"

عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو خاموش ہو گئے اور یہ بحث اختتام کو پہنچی۔

عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تو بات کا بتنگڑ بنا سکتے تھے کہ کیا مطلب ہے تمھارا، تم میری نیت پر شک کرتے ہو؟ کیا تم میرے دل کی حالت جانتے ہو؟ قبائلی نعرے بازی کرنے کی کیا تک ہے؟ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کہا۔ شیطان کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ اُن کے درمیان یوں آسانی سے پھوٹ ڈال سکے۔

عمر اور عباس رضی اللہ عنہما خاموش ہو گئے۔ ابوسفیان کھڑے دیکھتے رہے کہ نبی ﷺ کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"عباس! ابھی انھیں اپنے خیمے میں لے جائیے۔ صبح میرے پاس لائیے گا۔"

عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے گئے۔ اس نے وہاں رات گزاری۔ فجر کو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لوگ نماز کی تیاری میں مصروف ہیں اور طہارت کر رہے ہیں۔ ابوسفیان نے حیران ہو کر عباس سے پوچھا: "انھیں کیا ہوا؟"

انھوں نے بتایا: "ان لوگوں نے اذان کی آواز سنی ہے اور اب نماز کے لیے نکل رہے ہیں۔" جماعت کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے صفیں باندھیں۔ رسول اللہ ﷺ آگے بڑھے اور تکبیر کہہ کر نماز شروع کی۔ ابوسفیان نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع کرتے ہیں تو

مسلمان بھی رکوع میں جاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ سجدہ کرتے ہیں تو مسلمان بھی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ اسے اِس قدر شدید پیروی پر نہایت تعجب ہوا۔ نماز کے بعد عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لینے آئے۔

ابوسفیان نے کہا: ''عباس! محمد جس بات کا حکم دے یہ لوگ بجالاتے ہیں؟''

کہا: ''ہاں! واللہ! اگر وہ انھیں کھانا پینا چھوڑ دینے کا حکم بھی دیں گے تو لوگ ان کی اطاعت کریں گے۔'' ابوسفیان نے کہا: ''میں نے تو قیصر و کسریٰ کی بادشاہت میں بھی اطاعت اور جان نثاری کا یہ عالم نہیں دیکھا۔''

عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لیے رسول اللہ ﷺ کے خیمے میں آئے تو آپ نے دریافت فرمایا:

''ابوسفیان! ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپ کو یقین آجائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟''

ابوسفیان نے جو رات مسلمانوں میں گزاری تھی وہ اس کے دل میں بھڑکتی عداوت کی آگ بجھانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے کہا:

''میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کس قدر متحمل مزاج و کریم اور صلہ رحمی کرنے والے انسان ہیں۔ واللہ! میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ کے علاوہ میرا کوئی معبود ہوتا تو وہ میرے کسی کام ضرور آتا۔''

اس پر آپ ﷺ نے دریافت کیا:

''ابوسفیان! کیا وہ وقت نہیں آیا کہ آپ کو یقین ہوجائے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟''

ابوسفیان صاف گو آدمی تھا۔ اس نے جواب دیا:

''میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کس قدر بردبار و عزت دار اور صلہ رحمی کرنے والے انسان ہیں۔ واللہ! اس بارے میں ابھی تک دل میں خلش سی باقی ہے۔''

اس پر عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان سے کہا:

''ابوسفیان! اسلام قبول کر لو۔ یہ شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔''

ابوسفیان تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر گویا ہوا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»

ابوسفیان کی زبان سے یہ کلمات سن کر نبی ﷺ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ابوسفیان اعزاز پسند آدمی ہے۔ اسے کوئی اعزاز دے دیجیے۔''

آپ نے فرمایا:

''ہاں، ٹھیک ہے۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر چلا گیا اسے امان ہے۔''[1]

نقطۂ نظر

''یہ ذہانت نہیں کہ آپ بحث و مباحثے میں مد مقابل کو چت کر دیں۔ قابلیت یہ ہے کہ آپ سرے سے بحث ہی میں نہ پڑیں۔''

[1] السيرة النبوية لابن هشام:4/44-46، ومجمع الزوائد: 166/6، والمعجم الكبير للطبراني: 11/8-12.

اعتراض کرنے والوں کا راستہ بند کیجیے

لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے بیج بونے کا بڑا سبب زبان کے مفاسد ہیں۔ زبان کے مفاسد میں سے ایک فساد یہ ہے کہ بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی بات کاٹ کر ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ یوں فریقین میں جھگڑا ہو جاتا ہے جو دلوں کی دوری کا باعث بنتا ہے۔

تمام لوگوں کی اصلاح کرنا اور انھیں شرعی آداب واحکام کا پابند بنا دینا ناممکن ہے۔

بعض لوگوں کو مثالیت (Idealism) کے چکر سے نکل آنا چاہیے جو ہر وقت یہی راگ الاپتے رہتے اور اپنے آپ کو ہلکان کرتے رہتے ہیں کہ لوگوں کو یوں کرنا چاہیے، لوگوں کو فلاں بات کا پابند ہونا چاہیے، لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے، وغیرہ وغیرہ۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غلطیوں کا تدارک کرتے اور ان کا حل نکالتے ہوئے ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ لوگوں کو کیا کرنا چاہیے بلکہ یہ سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آپ کسی اچھوتے موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ لوگ اس پر اعتراض کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کریں گے تو ضروری ہے کہ اصل بات کی طرف آنے سے پہلے تمہید باندھیں جس میں اُن ممکنہ سوالوں کا جواب ہو جو لوگوں کی طرف سے اٹھائے جائیں گے۔

بعض لوگ اعتراض کرنے والے کو ایسا عمدہ جواب دیتے ہیں کہ اُس کے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے کسی محفل میں گیس اسٹیشن پر دو آدمیوں کے درمیان ہونے والی جھڑپ کا احوال بیان کیا کہ اُن کی لڑائی نے شدت اختیار کی تو پولیس آ گئی اور ان دونوں کو تھانے جانا پڑا۔ اس پر حاضرین محفل میں سے ایک چرب زبان اٹھا اور کہنے لگا:

''جی ہاں! لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ........... اور غلطی فلاں کی تھی.....''

ان صاحب نے کمال مشقت سے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے نہایت اطمینان سے پوچھا:

''کیا آپ اس واقعے کے وقت وہاں موجود تھے؟''

اس نے جواب دیا: ''نہیں۔''

''یا آپ کو کسی عینی شاہد نے بتایا ہے؟''

''جی نہیں، یہ بات بھی نہیں۔''

''یا تفتیشی کارروائی کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔

تب ان صاحب نے ذرا زور دے کر کہا:

''اچھا تو آپ مجھے کیسے جھٹلا رہے ہیں جبکہ آپ کو کسی چیز کا پتا نہیں؟''

مجھے ان صاحب کا یہ انداز پسند آیا کہ انھوں نے اعتراض کرنے سے قبل مناسب تمہیدی جملوں کے ذریعے مدمقابل کے لیے فرار کے راستے بند کر دیے۔

قریش کے جنگجو بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ قریش کے بعض دانش مند حضرات مسلمانوں کے مقابلے میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ انھوں نے روانگی میں پس و پیش کی تو قوم کے لوگوں نے اُنھیں زبردستی ساتھ کھینچ لیا۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے سوچا کہ یہ لوگ اگرچہ مجبوراً میدانِ جنگ میں آگئے ہیں لیکن یہ لڑائی نہیں کریں گے۔ چنانچہ میدان میں پہنچنے سے پہلے ایک پڑاؤ میں آپ نے صحابۂ کرام کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا اور اُن حضرات پر تلوار اٹھانے سے منع کرنا چاہا۔ لیکن آپ جانتے تھے کہ یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ آخر یہ لوگ جو ہم سے لڑنے نکلے ہیں، ان میں سے ان چند افراد کو کیوں مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ آپ نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے تمہیدی طور پر فرمایا:

"میں جانتا ہوں کہ بنو ہاشم اور دیگر قبائل کے چند افراد مجبوراً آئے ہیں۔ انھیں ہماری جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

تمہید ختم ہوئی تو آپ نے فرمایا:

"تو آپ میں سے جو بنو ہاشم کے کسی آدمی کے سامنے آئے، اسے قتل نہ کرے۔"

"ابوالبختری بن ہشام سے جس کا سامنا ہو، انھیں قتل نہ کرے۔"

"جو عباس بن عبدالمطلب کے سامنے آئے، انھیں قتل نہ کرے۔ وہ مجبوراً میدان میں آئے ہیں۔"[1]

نصیحت

"ذہانت سے کام لیجیے اور قبل اس سے کہ لوگ رات کو آپ کے ہاں آئیں، آپ دوپہر ہی کو اُن کے ہاں جائیے۔"

[1] دلائل النبوة للبيهقي:3/141,140، والبداية والنهاية:3/284.

انتظار کیجیے، اعتراض کرنے میں جلدی نہ کریں

ایک صاحب فنِ مکالمہ پر لیکچر دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کیا۔ جب وہ قرآن کی اس آیت پر پہنچے:

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ﴾

''اس کے ساتھ قید خانے میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے۔''[1]

تو انھوں نے حاضرین کو بغور دیکھا، پھر ان سے دریافت کیا:

''اس کے ساتھ قید خانے میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے؟ ان تینوں میں سے کون پہلے داخل ہوا؟

یوسف علیہ السلام یا دونوں جوان؟

ایک پکارا: ''یوسف علیہ السلام۔''

دوسرے نے کہا: ''نہیں، دونوں جوان۔''

تیسرا بولا: ''نہیں، نہیں، یوسف، یوسف۔''

چوتھے نے ذرا ہوشیار بننے کی کوشش کی: ''وہ اکٹھے داخل ہوئے تھے۔''

پھر پانچواں بولا اور ایک شور بپا ہو گیا۔ اصل بات کہیں غائب ہو گئی۔ لیکچرار صاحب یہی چاہتے تھے۔ انھوں نے حاضرین کے چہروں کو غور سے دیکھا اور مسکرائے، پھر انھیں

خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور کہنے لگے:

''آخر مشکل کیا ہے؟ یوسف ﷺ پہلے داخل ہوئے ہوں یا دونوں نوجوان، بات ایک ہی ہے۔ کیا یہ مسئلہ اتنے اختلاف اور بحث و تکرار کا مستحق ہے؟

واقعی بسا اوقات ہم لوگ خواہ مخواہ دوسروں کی باتیں کاٹ کر اعتراض کرتے اور ساری بات کا مزہ کرکرا کر دیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کی حقیقت سمجھے بغیر اس پر اعتراض جڑ دیتے ہیں اور صبر یا انتظار کرنے کا تکلف نہیں کرتے۔

زیاد نیک نوجوان ہے۔ وہ لوگوں کو اچھے کاموں کی نصیحت کرنے میں خاصا پُر جوش ہے۔ ایک روز وہ اپنی کار میں بیٹھا محو سفر تھا۔ گاڑی سرخ اشارے پر رُکی۔ انگریزی موسیقی کی تیز اور بے ہنگم آواز زیاد کے کانوں میں پڑی۔ زیاد کو حیرت ہوئی کہ یہ بلند آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز کا مخرج تلاش کرنے لگا۔ آواز ساتھ والی کار سے آ رہی تھی۔ زیاد نے گاڑی کا ہارن بجا کر اس کار کے ڈرائیور کو متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ ریکارڈ کی آواز آہستہ کرے۔ اس آدمی نے توجہ نہیں کی۔ وہ موسیقی میں مست اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ زیاد نے جب یہ دیکھا کہ اس گاڑی میں بیٹھا شخص مکمل طور پر باریش ہے تو اس کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ اسے تعجب ہوا کہ شرعی حلیے کا حامل آدمی قرآن کی تلاوت کے بجائے موسیقی سن رہا ہے اور وہ بھی اس قدر بلند آواز سے۔ اتنے میں سبز بتی جلی اور سب گاڑیاں چل پڑیں۔ زیاد اس آدمی کو راہِ راست پر لانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ وہ آدمی ایک شاپنگ سنٹر کے پاس رکا۔ زیاد نے کار اس کی کار کے عقب میں کھڑی کر دی اور اس کی حرکتیں نوٹ کرنے لگا۔ وہ آدمی کار سے نکلا۔ وہ پتلون میں ملبوس تھا۔ زیاد نے سوچا اب یہ سگریٹ خریدے گا۔ لیکن یہ کیا! اس کے ہاتھ میں ایک معروف دینی میگزین تھا۔ زیاد سے صبر نہ ہوا۔ وہ

گاڑی سے نکلا اور اس آدمی کے پاس جا کر نرمی سے بولا: ''بھائی! اگر آپ اجازت دیں تو......، اس نے کوئی جواب نہ دیا اور توجہ بھی نہیں کی۔

زیاد نے آواز ذرا بلند کی:

''دیکھیے، سنیے! اگر آپ اجازت دیں تو۔''

آدمی نے اب بھی زیاد کی طرف توجہ نہ کی اور جا کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

زیاد طیش میں آ گیا۔ وہ گاڑی کے قریب آیا اور بولا: ''بھائی! اللہ آپ کو ہدایت دے۔ آپ کو سنائی نہیں دیتا؟''

آدمی نے مسکرا کر زیاد کی طرف دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی ریکارڈ بھی اونچی آواز سے بجنے لگا۔ زیاد مشتعل ہو کر کہنے لگا:

''بھائی! یہ حرام ہے۔ آپ نے لوگوں کو تنگ کر رکھا ہے۔''

آدمی نے زیاد کو غصے میں دیکھا تو اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر ''ناں'' کا اشارہ کیا، پھر جیب سے ایک جیبی ڈائری نکالی جس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا:

''میں گونگا بہرا ہوں، سن نہیں سکتا۔ براہِ کرام آپ جو کہنا چاہتے ہیں لکھ دیجیے۔''

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

﴿وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا﴾

''اور انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔''[2]

راستہ

''صبر خجالت سے بچاتا ہے۔''

---

[1] یوسف 36:12. [2] بنی إسراء یل 11:17.

سرگوشی سے پہلے صدقہ

زبانی اور تحریری درخواستوں میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ درخواست گزار اصل بات کہنے سے پہلے چند تعریفی جملے لکھتا یا بولتا ہے۔ یہ ایک عام اور عمدہ اسلوب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے شیر خواری کے ایام میں دیارِ بنو ہوازن کے قریبی علاقے میں دودھ پیا تھا۔ آپ کو امید تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ ایک روز خبر ملی کہ ہوازن لشکر مہیا کر کے جنگ کی تیاری کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے اُن کی طرف پیش قدمی کی۔ لڑائی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فتح نصیب فرمائی۔ مسلمان غنائم ساتھ لیے روانہ ہو گئے۔ جعرانہ میں پڑاؤ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے قیدی عورتوں اور بچوں کو ایک مکان میں ٹھہرایا تھا۔ ہوازن کے چند افراد آپ کی طرف آئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کر کے بچوں اور عورتوں کو چھڑا لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک فصیح اللسان شخص کا انتخاب کیا۔ اُن کا خطیب زُہیر بن صُرَد کھڑا ہوا اور تمہید باندھتے ہوئے کہنے لگا:

''اے اللہ کے رسول! ان قیدیوں میں آپ کی خالائیں اور دایائیں ہیں جو آپ کی پرورش کیا کرتی تھیں۔ اگر ہم ابن ابی شمر اور نعمان بن منذر جیسے بادشاہوں سے جنگ

کرتے اور ہمیں وہی نقصان ہوتا جو آپ سے جنگ کر کے ہوا ہے تو وہ یقیناً ہم پر ترس کھاتے اور رحم کا برتاؤ کرتے۔ آپ تو رسول اللہ (ﷺ) ہیں، سب سے بہتر کفیل۔"

پھر اس نے یہ شعر پڑھے:

اُمْنُنْ عَلَيْنَا رَسُولَ اللّٰهِ فِي كَرَمٍ
فَإِنَّكَ الْمَرْءُ نَرْجُوهُ وَ نَنْتَظِرُ

"اے اللہ کے رسول! ہم پر احسان کیجیے۔ آپ ہی سے امید ہے۔ ہم آپ ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔"

اُمْنُنْ عَلٰى نِسْوَةٍ قَدْ كُنْتَ تَرْضَعُهَا
إِذْ فُوكَ تَمْلَؤُهُ مِنْ مَحْضِهَا الدُّرَرُ

"ان خواتین پر احسان کیجیے جن سے آپ نے دودھ پیا جبکہ آپ کا دہن خالص دودھ کے موتیوں (قطروں) سے بھر جاتا تھا۔"

لَا تَجْعَلَنَّا كَمَنْ شَالَتْ نَعَامَتُهُ
وَاسْتَبْقِ مِنَّا فَإِنَّا مَعْشَرٌ زُهُرُ

"ہمیں دربدر نہ چھوڑیے اور ہمیں باقی رکھیے کہ ہم بڑے عمدہ لوگ ہیں۔"

إِنَّا لَنَشْكُرُ آلَاءٍ وَإِنْ كُفِرَتْ
وَعِنْدَنَا بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ مُدَّخِرُ

"ہم احسانات کی قدر کرتے ہیں اور اُن کا بدلہ دیتے ہیں۔"

اس پر رسول اللہ ﷺ نے قیدی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا۔[1]

یہاں غور طلب پہلو یہ ہے کہ زہیر بن صُرد نے درخواست کرنے سے پہلے ایک

بے مثال تمہید باندھی جس میں رسول اللہ ﷺ کو دیارِ بنوسعد و ہوازن میں گزارے شیر خواری کے دن یاد دلائے، پھر اس نے یہ کہہ کر انسان کی فطری وسیع الظرفی اور مردانگی کو انگیخت کیا کہ دوسرے بادشاہوں سے یہ معاملہ ہوتا تو وہ ہم سے حسنِ سلوک کرتے اور آپ اللہ کے رسول! آپ تو اُن سے برتر ہیں۔

زہیر بن صُرد کا طریق کار واقعی عمدہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھی یہ ادب سکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی کرنے سے پہلے کچھ صدقہ پیش کرو۔''[2]

اہلِ عرب کی عادت تھی کہ وہ کسی سے مدد کے طالب ہوتے تو خوب صورت اشعار اور دل نشیں کلام سے بات کا آغاز کرتے۔ اسی طرح کسی کی اہانت اور تذلیل مقصود ہوتی تو بھی اشعار کا سہارا لیتے تھے۔ یہ اشعار عام طور پر تلوار سے بھی زیادہ کاٹ دار ہوتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ عمرہ کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے تو قریش کو خدشہ ہوا۔ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی۔ لیکن دس سال کی مدت تک کے لیے صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ صلحِ حدیبیہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ قبائل میں سے جو محمد کا حلیف بننا چاہے اسے آزادی ہے اور جو قریش سے حلیفانہ معاہدہ کرنا چاہے اسے بھی اجازت ہے۔ قبیلۂ خزاعہ مسلمانوں کا حلیف بن گیا اور قبیلۂ بنوبکر نے قریش کی دوستی قبول کی۔

یہ دونوں قبائل آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اُدھر خزاعہ کے لیے قریش کی عداوت میں بھی شدت آ گئی۔ اس کے باوجود قریش کو ڈر تھا کہ انھوں نے خزاعہ کو ہاتھ

بھی لگایا تو محمد (ﷺ) اس کا بدلہ لیں گے۔ صلح کے سترہ اٹھارہ مہینے بعد بنو بکر نے مکہ کے قریب واقع تالاب ''وتیر'' پر بنوخزاعہ پر شب خون مار دیا۔ انھوں نے قریش سے بھی اعانت طلب کی۔ قریش نے سوچا کہ رات کا وقت ہے۔ کوئی دیکھ نہیں رہا اور محمد (ﷺ) کو بھی خبر نہیں ہو گی۔ وہ اسلحے سے لیس ہو کر بنو بکر کی مدد کو آ گئے۔ خزاعہ یہ دیکھ کر بہت گھبرائے۔ حملہ آوروں نے اُن کی اچھی خاصی تعداد کو جن میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے، موت کے گھاٹ اتار دیا اور عہد شکنی کی بدترین مثال قائم کی۔ بنوخزاعہ کے ایک آدمی عمرو بن سالم نے یہ خون ریزی دیکھی تو اونٹ پر سوار ہو کر بھاگ نکلا اور سیدھا مدینے روانہ ہو گیا۔ مدینہ پہنچ کر مسجد نبوی میں گیا۔ چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ سارا بشرہ سفر کے گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے روبرو کھڑا ہوا اور بڑے دردناک لہجے میں یہ اشعار پڑھے:

يَا رَبِّ إِنِّي نَاشِدٌ مُحَمَّدَا
حِلْفَ أَبِيهِ وَأَبِينَا الْأَتْلَدَا

''اے میرے رب! میں محمد (ﷺ) کو اُن کے اور اپنے والد کے درمیان طے پانے والا پرانا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔''

قَدْ كُنْتُمْ وِلْدًا وَكُنَّا وَالِدَا
ثُمَّ أَسْلَمْنَا فَلَمْ نَنْزَعْ يَدَا

''آپ اولاد ہیں اور ہم والد۔ تب ہم اسلام لے آئے، پھر ہم نے مدد سے ہاتھ نہیں کھینچا۔''

فَانْصُرْ رَسُولَ اللّٰهِ نَصْرًا أَبَدَا
وَادْعُ عِبَادَ اللّٰهِ يَأْتُوا مَدَدَا

''اے اللہ کے رسول! مدد کیجیے۔ اور اللہ کے بندوں کو بلائیں کہ وہ ہماری کمک کو آئیں۔''

فِيهِمْ رَسُولُ اللّٰهِ قَدْ تَجَرَّدَا
إِنْ سِيمَ خَسْفًا وَجْهُهُ تَرَبَّدَا

''ان لوگوں میں اللہ کا رسول ہے جو واضح ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کی توہین کا ارادہ کیا جائے تو وہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے۔''

فِي فَيْلَقٍ كَالْبَحْرِ يَجْرِي مُزْبِدَا
إِنَّ قُرَيْشًا أَخْلَفُوكَ الْمَوْعِدَا

''سمندر کی طرح جھاگ اڑاتے ہوئے برق رفتار گھوڑے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ قریش نے آپ کے وعدے کی خلاف ورزی کی ہے۔''

وَنَقَضُوا مِيثَاقَكَ الْمُؤَكَّدَا
وَجَعَلُوا لِي فِي كِدَاءٍ رَصَدَا

''اور انھوں نے عہد و وفا کی مضبوط رسی کاٹ دی ہے۔ کداء میں وہ گھات لگا کر بیٹھے تھے۔''

وَزَعَمُوا أَنْ لَّسْتُ أَدْعُو أَحَدَا
فَهُمْ أَذَلُّ وَأَقَلُّ عَدَدَا

''اور سمجھا تھا کہ میں مدد کے لیے کسی کو نہیں پکاروں گا ان کی تعداد کم ہے اور وہ ذلیل لوگ ہیں۔''

هُمْ بَيَّتُونَا بِالْوَتِيرِ هُجَّدَا
وَقَتَلُونَا رُكَّعًا وَسُجَّدَا

''انھوں نے وتیر میں ہم پر رات کے وقت حملہ کیا اور رکوع و سجود کی حالت میں ہمیں قتل کیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہ کلام، یہ شعر اور یہ آہ بکا سنی تو پُر جلال چہرے کے ساتھ فرمایا:

''عمرو بن سالم! تمھاری مدد کی گئی۔''

پھر جلدی سے اُٹھے اور لوگوں کو جنگ پر چلنے کے لیے تیاری کا حکم دیا۔ لوگوں نے آناً فاناً تیاریاں کیں۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں کا قصد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی خدشہ تھا کہ سفر کی سمت ظاہر کر دی گئی تو قریش کو خبر ہو جائے گی۔ آپ نے اللہ سے دعا کی کہ قریش سے ساری خبریں روک لے تاکہ ہم اُن پر اچانک حملہ آور ہوں۔

قریش کی خیانت اور وعدہ خلافی پر رسول اللہ ﷺ نہایت رنجیدہ تھے۔ آپ جنگ کی تیاری کرتے اور کہتے جاتے:

''گویا تم ابوسفیان کو دیکھ رہے ہو کہ وہ عہد کی تجدید اور (صلح کی) مدت میں توسیع کرانے آپہنچا ہے۔''

اس کے بعد خزاعہ کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ ان میں بدیل بن ورقاء بھی تھا۔ انھوں نے قریش اور بنوبکر کے حملے اور اُن کی بدعہدی کی خبر دی۔ آپ نے ان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا اور فرمایا:

''واپس جا کر علاقوں میں بکھر جاؤ۔''

اندیشہ تھا کہ قریش کو اس وفد کے متعلق معلوم ہو گیا تو وہ مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے اُن پر دوبارہ حملہ کر دیں گے۔ یہ وفد واپس چلا گیا۔ راستے میں مکہ اور مدینہ کے درمیان

واقع ایک مقام ''عسفان'' پر ان کی ملاقات ابوسفیان سے ہوئی جو حدیبیہ کے عہد کی تجدید اور مدت میں توسیع کرانے مدینے آ رہا تھا۔ وفد کے افراد گھبرائے کہ ابوسفیان کو علم ہو گیا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں تو کیا ہو گا۔ اُدھر ابوسفیان کو بھی یہ بات کھٹک رہی تھی کہ کہیں یہ لوگ محمد (ﷺ) کو ہماری عہد شکنی کے بارے میں بتا کر تو نہیں آ رہے۔

اس نے بدیل بن ورقاء سے پوچھا: ''بدیل! کہاں سے آ رہے ہو؟''

بدیل نے جواب دیا: ''یہ خزاعہ کے چند افراد ہیں۔ ان کے ساتھ ذرا ساحل تک گیا تھا۔''

ابوسفیان اس کا جواب سن کر خاموش ہو رہا۔ یہ لوگ آگے چلے گئے تو ابوسفیان اس جگہ آیا جہاں بُدیل نے اونٹ بٹھایا تھا۔ اس نے اونٹ کی مینگنی اٹھا کر توڑی تو اس میں سے کھجور کی گٹھلی برآمد ہوئی۔ اس نے یقین کر لیا کہ یہ اونٹ مدینے سے آیا ہے۔

ابوسفیان نے کہا: ''میں اللہ کی قسم کھا کہتا ہوں کہ بدیل محمد (ﷺ) کے ہاں سے آ رہا ہے۔'' ابوسفیان مدینہ پہنچا تو اپنی بیٹی اور رسول اللہ ﷺ کی بیوی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر آیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگا تو ام حبیبہ نے بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے کہا:

''پیاری بیٹی! معلوم نہیں کہ تم نے اس بستر کو میرے قابل نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے قابل نہیں سمجھا؟''

ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''نہیں، یہ اللہ کے رسول کا بستر ہے اور آپ مشرک پلید ہیں۔ آپ اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔''

ابوسفیان نے تاسف سے کہا: ''ہاہ! بیٹی! واللہ میرے بعد تم میں شر آ گیا ہے۔''

بیٹی کے ہاں سے ہو کر ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا۔ اس نے کہا:

''محمد! عہد کی تجدید کیجیے اور معاہدے کی مدت بڑھا دیجیے۔''

آپ نے دریافت کیا:

''کیا آپ اسی لیے آئے ہیں؟ کیا اُدھر کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟''[4]

ابوسفیان کہنے لگا:

''معاذ اللہ! ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔ ذرّہ برابر بھی زبان سے نہیں پھرے۔''

رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔ ابوسفیان نے معاہدے کی تجدید والی بات دہرائی لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوسفیان وہاں سے نکلا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں آیا۔ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا:

''محمد سے میری سفارش کردو یا میرا اور میری قوم کا بچاؤ کرو۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''میں اسی کو پناہ دیتا ہوں جسے رسول اللہ ﷺ پناہ دیں۔ اُن کے خلاف میں تمھارا بچاؤ کیوں کروں؟ واللہ! اگر چیونٹیوں کو بھی تم لوگوں سے لڑتا پاؤں تو تمھارے خلاف اُن کی مدد کروں گا۔''

یہاں سے مایوسی ہوئی تو ابوسفیان عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور سفارش کرنے کو کہا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بولے:

''میں رسول اللہ ﷺ سے تمھاری سفارش کروں؟''

''میں تو کہتا ہوں کہ ہمارا جو معاہدہ نیا ہے، اللہ اسے پرانا کرے اور جو پختہ ہے اللہ اسے توڑے اور جو معاہدہ ٹوٹ چکا ہے اللہ اسے کبھی نہ جوڑے۔''

ابوسفیان نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی یہ بات سنی تو اس کا رنگ فق اور سینہ تنگ پڑ گیا۔ وہ خود کلامی کرتے ہوئے وہاں سے نکلا:

''ابوسفیان! تجھے رشتے داروں نے اچھا بدلہ نہیں دیا۔''

اب ابوسفیان علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف گیا اور ان سے کہا:

''علی! تم میرے سب سے قریبی رشتے دار ہو۔ رسول اللہ سے میری سفارش کر دو۔''

علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''ابوسفیان! اصحاب رسول میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیے بغیر کسی کو پناہ دے دے یا کسی سے دوستی گانٹھ لے۔ آپ سیدِ قریش ہیں۔ قبیلے کے سرکردہ اور مضبوط ترین آدمی ہیں۔ جائیے لوگوں میں عہد کی تجدید کا اعلان کر کے اپنے بچاؤ کی ضمانت، اگر ملتی ہے تو، لے آئیے۔''

ابوسفیان نے کہا: ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کام سے مجھے کوئی فائدہ ہوگا؟''

علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''نہیں، میں نے تو بس ایک رائے دی ہے۔''

ابوسفیان اہلِ مدینہ کے درمیان آیا اور چل پھر کر بآواز بلند کہا: ''سن لیں! میں لوگوں کے درمیان عہد کی تجدید کرتا ہوں اور واللہ! میرا نہیں خیال کہ کوئی مجھ سے بدعہدی کرے گا۔''

یہ کہہ کر وہ اونٹ پر سوار ہوا اور مکے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو قریش نے پوچھا: ''پیچھے کی کیا خبر ہے؟ محمد نے کوئی تحریر لکھ کر دی کہ نہیں؟''

ابوسفیان نے جواب دیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اس نے انکار کر دیا ہے۔ میں اس کے اصحاب کے ہاں بھی گیا۔ میں نے آج تک کوئی ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کی رعایا اس کی اتنی مطیع و فرماں بردار ہو۔ میں محمد کے پاس گیا، اس سے بات کی تو واللہ! اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ابن ابی قحافہ کی طرف گیا۔ اس میں بھی مجھے کوئی بھلائی نظر نہیں آئی۔ پھر میں عمر کے پاس گیا۔ وہ تو میرا سب سے بڑا دشمن نکلا۔ اس کے بعد میں علی کے پاس گیا۔ وہ سب سے نرم تھا۔ اس نے مجھے ایک کام کرنے کا مشورہ دیا جو میں نے کر ڈالا۔ جانے اس کا کوئی فائدہ ہمیں پہنچتا ہے یا نہیں۔''

قریش نے دریافت کیا: ”علی نے کس کام کا مشورہ دیا تھا؟“

”اس نے کہا تھا کہ میں لوگوں کے درمیان جا کر اپنے آپ کو خود ہی پناہ دے آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔“ قریش نے استفسار کیا: ”کیا محمد نے تمھاری اس بات کی ضمانت دی ہے؟“

”نہیں۔“

”تمھارا ستیاناس! اس شخص (علی) نے تم سے کھلواڑ کیا ہے۔ جو کچھ تم نے کہا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔“ قریش نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

”واللہ! میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اور کیا کرتا؟“[5]

ابوسفیان کو غم لاحق ہوا۔ اسی حالت میں وہ گھر گیا اور بیوی کو ساری بات بتائی۔ بیوی نے کہا: ”اللہ تیری شکل بگاڑے! تو خیر کے ساتھ نہیں لوٹا۔“

اس واقعے کے چند دن بعد رسول اللہ ﷺ فاتحانہ مکہ میں داخل ہو رہے تھے۔

عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہے

”بڑے لقمے کو اچھی طرح چبا کر ہی نگلا جا سکتا ہے۔“

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4/131. [2] المجادلة 12:58. [3] دلائل النبوة للبيهقي:5/10,7,6، والبداية والنهاية:4/277-279. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 5/10. [5] السيرة النبوية لابن هشام: 4/36-40.

ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ کامیاب ہوں

فہد اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کھلے صحرا میں محوِ سفر تھا۔ اس کا ساتھی خاصا ہٹ دھرم اور ضدی واقع ہوا تھا۔ انھیں دور سے ریت پر ایک سیاہ سی شے پڑی دکھائی دی۔ فہد نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''اندازہ لگاؤ۔ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟''

ساتھی نے جواب دیا: ''یہ سیاہ بکری ہے۔''

فہد نے کہا: ''نہیں، یہ کوا ہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں یہ بکری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ قریب چل کر دیکھ لیتے ہیں۔'' فہد بولا۔

وہ دونوں تھوڑا قریب گئے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کوا ہی ہے۔

فہد چلایا: ''واللہ! یہ کوا ہے۔''

''بالکل نہیں، بکری ہے۔'' اس کے ساتھی نے سر ہلا کر کہا۔

فہد خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں تھوڑا اور قریب ہوئے تو کوا ان کی آہٹ پا کر اُڑن چھو ہو گیا۔ فہد چیخا: ''اللہ اکبر! کوا۔ دیکھو، یہ کوا تھا، اسی لیے اڑ گیا۔''

''اُڑ گیا تو کیا ہوا۔ ہے تو بکری ہی۔'' اس کے ساتھی نے جواب دیا۔

یہ لطیفہ میں نے اس امر کے اظہار کی خاطر بیان کیا ہے کہ پچھلے صفحات میں جو مہارتیں

بتائی گئی ہیں وہ عام طور پر لوگوں کو فائدہ دیتی ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بعض لوگوں سے تعامل میں آپ جتنی چاہیں مہارتیں استعمال کر لیں، وہ آپ سے ہم آہنگ نہیں ہوں گے۔

مثلاً آپ تعریف کی مہارت استعمال کرتے ہوئے کسی سے کہیں:

"ماشاء اللہ! آپ کے کپڑے کتنے خوب صورت ہیں۔ آپ واقعی دُولھا لگ رہے ہیں۔" تو توقع کے برعکس وہ آپ کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہے:

"میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ بدھو سمجھا ہے تم نے مجھے؟"

آپ کا سامنا ایسے لوگوں سے ہو تو سمجھ لیجیے کہ یہ لوگ سارے معاشرے کی نمائندگی نہیں کرتے۔ میں نے خود ہر عمر کے اور ہر طبقے کے لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے یہ مہارتیں استعمال کی ہیں۔

میں نے ان کے عجیب وغریب اثرات دیکھے ہیں، اس لیے میری بات مانتے ہوئے آپ ایک بار ان مہارتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ یقین کیجیے، آپ کو فائدہ ہوگا۔

مختصراً

"کیا آپ واقعی تبدیلی چاہتے ہیں؟"

بہادر بن کر ابھی سے آغاز کیجیے

ایک بار ہم نے لوگوں سے تعامل کی مہارتوں کے موضوع پر سہ روزہ ورکشاپ منعقد کی۔ ورکشاپ میں ایک نوجوان عبدالعزیز نے بھی شرکت کی۔ وہ میرے لیکچروں سے بہت متاثر تھا۔ ہر قابلِ لحاظ بات اس نے نوٹ کی۔ ورکشاپ اختتام کو پہنچی۔

ایک ماہ بعد ہم نے دوبارہ اسی ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ میں نے حاضرین کی طرف دیکھا تو اگلی نشستوں میں مجھے عبدالعزیز بیٹھا نظر آیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ نوجوان دوبارہ کیوں آیا ہے جبکہ لیکچروں کا مواد وہی ہے جو گذشتہ ورکشاپ میں تھا۔

نماز کا وقفہ ہوا تو میں نے عبدالعزیز کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک جانب لے گیا۔ میں نے پوچھا:

''عبدالعزیز! تم دوبارہ کیوں آئے ہو؟ تم جانتے ہو کہ لیکچروں کا مواد زیادہ تر پچھلے والا ہے۔ جو نوٹس تم لے رہے ہو، یہ بھی وہی نوٹس ہیں۔ سرٹیفکیٹ بھی تمھیں وہی دیا جائے گا جو تم پہلے حاصل کر چکے ہو۔ تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

اس نے جواب دیا:

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن یقین کریں میرے دوست احباب کہتے ہیں کہ عبدالعزیز تم بدل گئے ہو۔ تمھارا برتاؤ ہم سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے اُن کی بات پر

غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے اس ورکشاپ میں جو مہارتیں سیکھی تھیں، انھیں استعمال کر رہا ہوں۔ تب میں دوبارہ ورکشاپ کرنے آ گیا تاکہ یہ مہارتیں میرے ذہن میں مزید پختہ ہو جائیں۔"

اس سے سیکھیے

"اگر آپ واقعی اپنے آپ میں تبدیلی چاہتے ہیں تو بہادر بنئے اور ابھی سے آغاز کیجیے۔"

10 لاکھ سے زائد چھپنے والی عربی کتاب کا اردو ترجمہ

زندگی سے لطف اٹھائیے!

زندگی میں انسان کو طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ یہ مشکلات اچھے طریقے سے حل کر کے زندگی کو خوشگوار اور پُر مسرت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات مسائل اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ آپ خود کو ان کے سامنے بے بس محسوس کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں زیرِ نظر شاہکار تصنیف ''زندگی سے لطف اٹھائیے'' آپ کی رہنمائی کے لیے حاضر ہے۔ یہ سعودی عرب کے معروف عالم اور مصنف محمد بن عبدالرحمن العریفی کے بیس برس کے تجربات کا حاصل ہے جس کا عربی ایڈیشن اب تک ایک ملین کی تعداد میں چھپ کر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔ اس دلآویز کتاب کا اردو ایڈیشن دارالسلام اعزاز کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ اس میں عام آدمی کو پیش آنے والے معاشرتی و روحانی مسائل کا حل سیرتِ نبوی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اندازِ بیان دلکش، تمثیلی اور معروضی ہے۔ مثالیں نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صالحینِ اُمت کی زندگیوں سے پیش کی گئی ہیں اور ان کے ذریعے بہتر اور کامیاب زندگی گزارنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

دارالسلام
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیویارک
ISBN: 978-603-500-053-6